حکایات القرآن

سید محمد صحفی

جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان

حکایات القرآن

سید محمد صحفی

جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان
پوسٹ بکس نمبر ۵۳۲۵ ۔ کراچی

تالیف ———— سید محمد صحفی

ترجمہ ———— محمد فضل حق

اصلاح و نظر ———— کاظم علی گجراتی

کتابت ———— اشرف راحت

مطبع ———— پرائمار پرنٹرز کراچی

طبع سوم ۱۴۱۴ھ ۱۹۹۳ء

جملہ حقوق محفوظ : یہ کتاب کلی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ جامعہ کی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریۃً کرائے پر دی جائے گی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کی جائے گی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنے والے پر یہ شرط عائد نہ کرنے کے لیے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی۔

اسلام

کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بُنیاد حق وصداقت پر رکھی گئی ہے۔ یہ علم کا ایک ایسا منبع ہے جس سے عقل و دانش کی متعدّد ندیاں پھوٹتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے لاتعداد چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک ایسا بلند رہنما مینار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اُصولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے۔

اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی عبودیّت اور عبادت کا بلند ترین معیار قرار دیا ہے۔ اُس نے اِسے اعلیٰ احکام، بلند اُصولوں، محکم دلائل، ناقابلِ تردید تفوّق اور مسلّمہ دانش سے نوازا ہے۔

اب یہ تمھارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اُسے قائم رکھو، اس پر خلوصِ دل سے عمل کرو اس کے مُعتقدات سے انصاف کرو، اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اِسے اس کا مناسب مقام دو۔

امام علی علیہ السلام

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید ابوالقاسم موسوی خوئی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں قائم ہونے والا یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی دُنیا کے متعدد ممالک میں اسلامی علوم و معارف پر مشتمل معتبر اور مستند لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔

اِس ادارے کا مقصد دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو اصل اور محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرانا اور اِس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیتِ رسول ؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اُردو، انگریزی، فرانسیسی، سندھی، گجراتی اور عربی میں ۱۰۰ سے زیادہ کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوبِ بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوسِ کتب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ جامعہ کے زیرِ اہتمام چلنے والے ساٹھ سے زیادہ مدرسے گزشتہ گیارہ برسوں سے قوم کے بچے بچیوں میں بنیادی اسلامی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ دینی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جاسکے۔

دُعا ہے کہ خداوندِ منان ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے!

تعاون کا طلبگار:

(شیخ) یوسف علی نفسی نجفی

وکیل حضرت آیت اللہ خوئی دام ظلہ العالی

فہرس

مقدمہ ———— ۹

حضرت آدم علیہ السلام ———— ۱۷

فرزند آدم ———— ۳۰

حضرت ادریس علیہ السلام ———— ۳۹

حضرت نوح علیہ السلام ———— ۴۴

حضرت ہود علیہ السلام ———— ۵۶

حضرت صالح علیہ السلام ———— ۶۴

حضرت ابراہیم علیہ السلام ———— ۷۶

حضرت اسماعیل علیہ السلام ———— ۹۴

حضرت لوط علیہ السلام ———— ۱۰۱

حضرت یعقوب علیہ السلام ———— ۱۰۷

حضرت یوسف علیہ السلام ———— ۱۰۹

حضرت شعیب علیہ السلام ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۴۴
حضرتِ موسیٰ علیہ السلام ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۴۸
حضرت ایوب علیہ السلام ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۸۰
حضرت داوٗد علیہ السلام ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۸۷
حضرت سلیمان علیہ السلام ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۹
حضرت یونس علیہ السلام ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۰۹
اصحاب رس ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱۵
حضرت زکریا و حضرت یحییٰ علیہما السلام ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱۹
اصحاب سبت ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۲۴
حضرت عیسیٰ علیہ السلام ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۲۸
اصحابِ کہف ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۴۱
اصحابِ اخدود ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵۰
اصحابِ فیل ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵۵
بعثت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۶۰
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مدینہ میں آمد ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۷۳
جنگِ بدر ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۷۷
جنگِ احد ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۸۴
جنگِ خندق ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۹۶
بنی قریظہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۱۰
صلح حدیبیہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۱۵

جنگِ خیبر ــــــــــ ۳۲۲
باغِ فدک ــــــــــ ۳۳۰
عالمگیر آواز ــــــــــ ۳۳۸
فتح مکہ ــــــــــ ۳۷۴
جنگِ موتہ ــــــــــ ۳۷۶
جنگِ حنین ــــــــــ ۳۸۵
اعلانِ برأت ــــــــــ ۳۹۴
جنگِ تبوک ــــــــــ ۳۹۹
مباہلہ ــــــــــ ۴۰۷
حجتہ الوداع ــــــــــ ۴۱۷
اکمالِ دین ــــــــــ ۴۲۲
آسمانی پتھر ــــــــــ ۴۴۵
خلافت کا ہنگامہ ــــــــــ ۴۴۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَکُوْنَ
لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ، وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مَنْ جَعَلَهٗ شَاهِدًا وَّ
مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ؕ
وَعَلٰی اٰلِهِ الَّذِیْنَ اَذْهَبَ عَنْهُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ
وَطَهَّرَهُمْ تَطْهِیْرًا ۔

مقدمہ

قرآن حضرت احدیت[1] کی جلوہ گاہ اور اسرارِ ربوبیت کا منبع ہے۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جس کے عمیق حقائق تک سوائے "مطہرون[2]" کے (جن سے خدائے تعالیٰ نے ہر نجاست کو دور رکھا ہے اور انہیں پوری طرح پاک و پاکیزہ کر دیا[3]) اور بجز انکے راستے کے رسائی پانا ممکن نہیں ہے۔[4]

یہ وہ کتاب ہے جو خدا کی وحی اور اس کا کلام ہے اور تمام آسمانی کتابوں سے بلند و بالا ہے۔[5]

یہ وہ کتاب ہے جو بہترین اور محفوظ ترین راستہ دکھاتی ہے[6] اور

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۴۷ — [2] سورۂ واقعہ آیت ۷۹
[3] سورۂ احزاب۔ آیت ۳۳ — [4] المیزان جلد ۱۹ صفحہ ۱۳۷
[5] صحیفۂ سجادیہ۔ دعا ۴۲ — [6] سورۂ اسراء۔ آیت ۹

بہشت کی جانب رہنمائی کرتی ہے، جو سب سے بڑی سعادت ہے[1]

یہ وہ کتاب ہے جو بنی نوع انسان کی نجات کے لیے پروردگارِ عالم کا "نور مبین" اور "برہان" ہے۔[2]

یہ وہ کتاب ہے جو جمیع عالمیان کی تعلیم[3] اور تزکیہ کا ذریعہ ہے اور انہیں جہان ہستی اور پروردگارِ عالم کی نشانیوں کے بارے میں "تفکر"[4] اور "تعقل"[5] کی دعوت دیتی ہے۔

یہ وہ کتاب ہے جو بنی نوع انسان کو پاکیزگی، فضیلت اور انسانی اخلاق اور صفات اپنانے کی راہ دکھاتی ہے۔[6]

یہ وہ کتاب ہے جو لوگوں کو عدل کے قیام[7] امانتوں کی ادائیگی[8] اور تقوی[9] کا راستہ بتاتی ہے۔

یہ وہ کتاب ہے جو ہر زمانے کے لوگوں کے لیے خدائے تعالیٰ کا وعظ۔ دلوں کی شفا اور ایسی ہدایت اور رحمت ہے[10] جو قیامت[11] کے روز تک جاری رہے گی۔

---

[1] امالی طوسی جلد ۱ صفحہ ۲۴۰ — [2] سورۂ نساء۔ آیت ۱۷۴

[3] سورۂ جمعہ۔ آیت ۲ — [4] سورۂ نحل۔ آیت ۴۴

[5] سورۂ یوسف۔ آیت ۲ — [6] سورۂ اعراف۔ آیت ۱۹۹

[7] سورۂ مائدہ۔ آیت ۸ — [8] سورۂ نساء۔ آیت ۵۸

[9] سورۂ مائدہ۔ آیت ۲ — [10] سورۂ یونس۔ آیت ۵۷

[11] سورۂ انعام۔ آیت ۲۲
سورۂ سبا۔ آیت ۲۹

یہ وہ کتاب ہے جس کے متعلق رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے:

تمہارے لیے قرآن پڑھنا، اسے سمجھنا اور اس پر عمل کرنا لازم ہے کیونکہ قرآن سود مند شفا اور مبارک دوا ہے۔[1]

یہ وہ کتاب ہے جس کے بارے میں امام علیؑ فرماتے ہیں:

جان لو اور آگاہ رہو کہ قرآن سے تعلق اور آشنائی کے بعد کوئی شخص فقر و فاقہ میں مبتلا نہیں ہوتا اور قرآن کے بغیر کسی کو سیر چشمی میسر نہیں آسکتی۔ پس اپنی بیماریوں سے نجات پانے کے لیے قرآن میں شفا ڈھونڈو اور زمانے کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے بھی قرآن سے مدد حاصل کرو۔ کیونکہ سب سے بڑی بیماریوں یعنی کفر۔ نفاق۔ گمراہی اور ضلالت کا علاج قرآن میں ہے۔ خدائے تعالیٰ سے اپنی حاجتیں قرآن کے وسیلے سے طلب کرو اور قرآن سے اپنے عشق اور محبت کے ذریعے خدا کی بارگاہ میں پہنچو۔[2]

یہ وہ کتاب ہے جو مضطرب دلوں کو چین بخشتی ہے[3] اور سرگرداں اور پریشان لوگوں کو اطمینان اور سکون سے ہمکنار کرتی ہے۔

یہ وہ کتاب ہے جو ٹھیک سے بتاتی ہے کہ گزشتہ قوموں پر کیا گزری ہے[4] یہ ان کے حالات بیان کرکے لوگوں کو خبردار کرتی اور انکی سرنوشت سے عبرت حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۹۲ صفحہ ۱۸۲

[2] نہج البلاغہ خوئی جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۱

[3] سورۂ رعد۔ آیت ۲۸ [4] سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۹۹

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

تمہیں چاہیے کہ قرآن مجید پڑھو اور اسے سمجھو۔ جب تم ایک ایسی آیت پر پہنچو، جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ گزرے ہوئے لوگ کوئی عمل انجام دے کر نیک بختی اور سعادت سے بہرہ مند ہوئے تو تم بھی وہی عمل کرو۔ جب کوئی ایسی آیت پڑھو جو یہ بتاتی ہو کہ اگلے لوگوں نے کوئی ایسا عمل کیا جس سے وہ ہلاکت سے دوچار ہوئے تو تم اس عمل سے اجتناب کرو۔[1]

معتبر اقوال کے مطابق قرآن کریم ۶۲۳۶ آیات پر مشتمل ہے[2] اور اس کے موضوعات اور مطالب کو عقائد ـــ احکام ـــ اخلاق اور حکایات کے چار عام حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پھر ان میں سے ہر حصے میں بہت سے جزئی اور فرعی موضوعات بھی موجود ہیں۔

۱۔ عقائد یہ حصہ ان آیات پر مشتمل ہے، جن کا تعلق براہ راست دلی اعتقادات سے ہے۔ جیسا کہ خدائے تعالیٰ اور اس کی وحدانیت پر ایمان۔ نیز پیغمبروں۔ فرشتوں۔ وحی۔ قیامت۔ حساب و کتاب۔ صراط۔ میزان۔ بہشت اور دوزخ وغیرہ پر اعتقاد۔

۲۔ احکام قرآنی آیات کا یہ حصہ ان قوانین پر مشتمل ہے، جن میں زندگی کے مختلف معاملات کے بارے میں خدائے تعالیٰ کے اوامر اور نواہی بیان کیے گئے ہیں۔ تاہم اس حصے کو بھی مزید دو شقوں میں تقسیم

---

[1] الحیات جلد ۲ صفحہ ۱۱۶ بحوالہ تفسیر عیاشی جلد ۱ صفحہ ۵

[2] پژوہش در تاریخ قرآن کریم صفحہ ۲۲۔ یاد رہے کہ بعض علماء کے نزدیک آیات قرآن کی تعداد ۶۶۶۶ ہوتی ہے۔

کیا جاسکتا ہے:

ا۔ وہ آیات جو خدا کے ساتھ بندوں کے تعلقات کی نوعیت متعین کرتی ہیں۔ مثلاً نماز۔ روزہ۔ حج وغیرہ کہ جنہیں عبادات کا نام دیا گیا ہے۔

ب۔ وہ آیات جو لوگوں کے باہمی تعلقات کو منضبط کرتی ہیں، مثلاً وہ قوانین جن کا تعلق مملکت اسلامی کے نظم و نسق۔ خدا کی راہ میں جہاد اور ملکیت کی حدود متعین کرنے سے ہے۔ نیز وہ ضوابط جو زراعت۔ تجارت۔ نکاح۔ طلاق اور وراثت سے مربوط ہیں۔ اس کے علاوہ فوجداری قوانین مثلاً حدود۔ دیات اور قصاص وغیرہ ہیں اور ان سب کا ذکر معاملات کے عنوان کے تحت کیا جاتا ہے۔

۳۔ اخلاق و آداب وہ آیات جو انسان کو اخلاقی فضائل اور نفسانی کمال کی راہ دکھاتی اور افراد کی سیرت میں اعلیٰ انسانی صفات کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ ان میں عموماً ان چیزوں کا ذکر ہوتا ہے جو انسان کی خوش بختی اور سعادت کے حصول میں مدد دیتی ہیں۔

۴۔ حکایات قرآن کی آیات میں سے ایک بہت بڑی تعداد ان حکایات پر مشتمل ہے جو بڑی سبق آموز اور عبرت آمیز ہیں اور فلسفۂ تاریخ کے تحت سبھی لوگ ان سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

چنانچہ خود قرآن کریم یہ تصریح کرتا ہے کہ پہلی قوموں کے قصے بیان کرنے کا واحد مقصد لوگوں کو بیدار کرنا اور انہیں ان اقوام کے حالات اور واقعات سے عبرت حاصل کرنے پر آمادہ کرنا ہے۔ جیسا کہ داستانِ حضرت یوسفؑ بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا: اس میں شک نہیں کہ ان پہلے لوگوں کے قصوں میں عقلمندوں کے واسطے نصیحت ہے۔ [1]

---

[1] سورۂ یوسف۔ آیت ۱۱۱

اسی طرح قرآن کریم کی دیگر آیات میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کتاب کی تلاوت کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اس مقدس کلام کو مکمل غور سے پڑھیں اور اس کے ترجمے اور تفسیر پر بھی توجہ دیں، تاکہ وہ اس اصلی مقصد کے قریب ہو جائیں، جو قرآن کے پیش نظر ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ داستانیں سننے اور پڑھنے کا شوق انسان کی فطرت میں ہے۔ تاہم قرآن کریم ہی وہ پہلی کتاب ہے جس نے قدیم قوموں کے حالات اور واقعات کو بنی نوع انسان کی تعلیم اور تربیت کے لیے استعمال کیا ہے اور انسان کے اس طبعی شوق اور رغبت کو اس کی ہدایت کا وسیلہ بنایا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید اپنی متعدد آیات میں اس حقیقت کی تصریح فرماتا ہے اور یاد دلاتا ہے کہ ہم سابقہ قوموں کی داستانیں اس لیے بیان کرتے ہیں کہ لوگ سوچیں، اپنی عقل کو کام میں لائیں اور جو کچھ پہلے لوگوں پر گزری ہے اس سے نصیحت پکڑیں۔

چونکہ عام لوگ قرآن پاک اور اس کے سبق آموز مطالب سے براہ راست بہت کم استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے زیر نظر کتاب میں فقط قرآنی قصے نقل کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ ان قصوں کو بہت سادہ اور آسان الفاظ میں لکھا جائے تاکہ عام لوگ انہیں بخوبی سمجھ سکیں اور پہلی قوموں کی سرگزشت سے عبرت حاصل کرنے کا حصول زیادہ آسان ہو جائے۔

اس کتاب میں انبیاء علیہم السلام اور سابقہ قوموں کی تاریخ ائمہ طاہرینؑ کی روایات کی مدد سے لکھی گئی ہے اور پھر رسول اکرمؐ کی بعثت سے لے کر غدیر خم تک کے واقعات آتے ہیں، ضمنی طور پر واقعۂ غدیر کے ذکر اور

اس کی تکمیل کے لیے پیغمبر اسلامؐ کی خلافت کے موضوع پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ۱۳۴۰ھ شمسی میں لکھی گئی اور اس وقت سے اب تک بارہا شائع ہو چکی ہے۔ تاہم یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ اب جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان کی طرف سے دوسرا اردو ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ پاکستان اور دیگر اسلامی خطوں کے فرزندانِ توحید قرآن مجید کی تعلیمات سے آشنائی حاصل کر کے ان پر عمل پیرا ہوں گے اور اسلامی امّہ کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے کی کوششیں کریں گے۔ تاکہ وہ سامراجیوں کے تسلط سے آزاد ہو کر ابھریں اور آیت کریمہ (اگر تم سچے مومن ہو تو تمہیں غالب رہو گے)[1] کے مصداق ساری دنیا کی مادی اور روحانی رہبری کے لیے آگے بڑھیں۔

شیخ یوسف علی نفسی النجفی

---

[1] سورۂ آل عمران - آیت ۱۳۹

حضرت آدم علیہ السلام

خدائے تعالیٰ نے زمین کو دو یوم[1] میں پیدا کیا۔ اس پر بڑے بڑے پہاڑ نکادیے اور اس میں رہنے والوں کے وسائلِ زندگی کو بھی دو یوم میں ہی وجود میں لایا۔ پھر آسمان اور اس کے بعد عرش، سورج اور چاند کو پیدا کیا[2] اس کے ساتھ ہی فرشتوں کو وجود میں لایا جو اس کی تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں اور پورے خلوص کے ساتھ اس کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔

اس کے بعد خدائے تعالیٰ نے ارادہ کیا اور اس کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ وہ آدمؑ اور اس کے فرزندوں کو پیدا کرے تاکہ وہ زمین میں سکونت

---

[1] یوم کے لغوی معنی سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے درمیانی وقت کے ہیں۔ یہاں یوم سے اس کے لغوی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ لفظ "یوم" جس کے معنی دن کے ہیں وہ بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ [2] سورۂ حٰم سجدہ۔ آیت ۹ تا ۱۲

اختیار کریں اور اسے آباد کریں۔ چنانچہ اس نے فرشتوں کو آگاہ کیا کہ وہ جلد ہی ایک اور مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے۔ جس کے افراد اس زمین پر زندگی کی جدوجہد کریں گے، اس کے اونچے اور نیچے مقامات پر گھومیں گے اور ان کی نسل اسکے مختلف مقامات پر پھیل جائے گی۔ وہ زمین سے اگنے والی چیزیں کھائیں گے۔ اس کے اندر سے طرح طرح کے خزانے کھود نکالیں گے اور ان میں سے بعض گروہ دوسرے گروہوں کے جانشین ہوں گے۔

فرشتے ایک ایسی مخلوق ہیں جنہیں خدائے تعالیٰ نے اپنی پرستش کے لیے منتخب کیا ہے، اپنی نعمتیں ان پر تمام کردی ہیں اور اپنی اطاعت کی جانب ان کی رہنمائی کی ہے۔

چنانچہ فرشتوں پر یہ بات گراں گزری کہ خدائے تعالیٰ ان کے علاوہ ایک اور مخلوق پیدا کرنے والا ہے۔ وہ ڈر گئے کہ اس نئی مخلوق کی تخلیق ان کی کسی تقصیر یا ان میں سے بعض کی نافرمانی کے نتیجے میں ہو رہی ہے لہٰذا اپنی بریت کی خاطر انہوں نے کہا:

"اے پروردگار! جب ہم ہر وقت تیری تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے ہیں، پھر تو ہمارے علاوہ ایک اور مخلوق کو کیوں پیدا کر رہا ہے؟ جبکہ زمین سے حاصل ہونے والے فوائد کے بارے میں ان لوگوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوں گے اور وہ روئے زمین پر فساد برپا کردیں گے۔"

فرشتوں نے یہ باتیں اس لیے کہیں تاکہ وہ خدائے تعالیٰ سے

ان کا جواب سنیں۔ ان کا شبہ زائل ہو جائے اور جو وسوسے ان کے دلوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ دُور ہو جایئں۔ علاوہ ازیں انھیں یہ امید بھی تھی کہ خدائے تعالیٰ انہیں کو زمین پر اپنا جانشیں قرار دے گا کیونکہ وہ اس کی نعمتوں سے بہرہ مند ہونے میں اولیت کے حامل اور بہ خیال خود اس کے حق کو پہچاننے کے زیادہ اہل تھے۔ ان کا یہ سوال خدا کے کام کو ناپسند کرنے یا اس کی حکمت میں شک لانے کی بنا پر نہ تھا۔ نیز اس سے آدمؑ یا ان کے فرزندوں کے عیب گنوانا بھی مقصود نہ تھا۔ کیونکہ اولیائے مقربین اور خدا کے ایسے برگزیدہ بندے ہیں جو بات کرنے میں اس پر سبقت نہیں کرتے اور اس کے احکام کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

خدائے تعالیٰ نے فرشتوں کے اس سوال کا انہیں ایسا جواب دیا کہ جس سے انہیں اطمینان ہو گیا۔

اس ذات اقدس نے فرمایا:

"جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ پس آدمؑ کو زمین پر اپنا جانشین بنانے میں میری ایک ایسی حکمت پوشیدہ ہے جسے تم نہیں سمجھ سکتے۔ جیسا کہ میں نے ارادہ کیا ہے میں اس مخلوق کو جلد پیدا کروں گا اور اسے اپنا جانشین قرار دوں گا۔ تب تم وہ چیز دیکھو گے جو اس وقت تم سے پوشیدہ ہے۔ ہاں جب میں اسے پیدا کروں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تمہیں چاہیے کہ

اس کو سجدہ کرو"۔ [1]

خدائے تعالیٰ نے آدمؑ کا بدن ایک خاص قسم کی مٹی سے بنایا اور اس میں اپنی روح پھونکی جس سے ان کے پیکر میں زندگی کی فرحت بخش ہوا چلنے لگی اور جسم و روح کے یکجا ہو جانے سے وہ ایک بے نقص اور بے عیب انسان بن گئے۔ تب خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کریں۔ انہوں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں نہایت عاجزی کے ساتھ حضرت آدمؑ کو تعظیم دی اور ان کے سامنے اپنے چہرے خاک پر رکھ دیے۔ تاہم شیطان نے خدائے تعالیٰ کی حکم عدولی کی اور سجدہ کرنے سے باز رہا۔

خدا نے اس سے اس سرکشی اور نافرمانی کا سبب دریافت کرنے کے لیے فرمایا: "تمہیں آدمؑ کو سجدہ کرنے میں کیا چیز مانع ہوئی؟ تم نے اپنے آپ کو بڑا سمجھا ہے یا تم بھی دوسرے سرکشوں

---

[1] علمائے اسلام نے حضرت آدمؑ کے لیے فرشتوں کے سجدے کی مختلف توجیہات کی ہیں: (۱) فرشتوں کا سجدہ آدمؑ کے سامنے فروتنی اور انکساری کے اظہار کے لیے تھا۔ (۲) فرشتوں نے دراصل خدا ہی کو سجدہ کیا اور آدمؑ کو اپنا قبلہ قرار دیا تھا۔ (۳) آدمؑ کو خدا کے حکم سے سجدہ کیا جاتا تھا۔ اس لیے وہ سجدہ درحقیقت خدا کی ذات کو سجدہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ پس اگر خدا کے حکم سے خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کیا جائے تو وہ خدا کی پرستش، اطاعت اور اس کے ہاں تقرب کا ذریعہ ہوگا۔ اس میں شرک وغیرہ کا کوئی شائبہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس کے بارے میں یہ تیسرا نظریہ ہی کتاب و سنت کے مطابق ہے۔

میں سے ہو رہے ہیں؟"

شیطان نے یہ خیال کیا کہ اس کے اجزائے بدن آدمؑ کے اجزاء سے بہتر ہیں اور اس کا جوہر اس سے پاک تر ہے۔ اس نے یہ گمان بھی کیا کہ جو بلند مرتبہ اسے حاصل ہے، کوئی دوسرا اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ تب اس نے کہا: "میں آدمؑ سے بہتر ہوں۔ کیونکہ تو نے مجھے آگ سے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے۔"

یوں اس نے کھلم کھلا گناہ کا ارتکاب کیا، اپنے تکبر اور نافرمانی کو بے نقاب کر دیا اور پروردگار کے حکم سے سرتابی کی۔ اس نے حضرت آدمؑ کو جسے خدائے تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا تھا سجدہ نہ کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔

چنانچہ خدا نے اس کو اس کے تکبر کی سزا دی اور فرمایا:
"تم آسمانوں کی حدوں سے نکل جاؤ۔ کیونکہ تم ہماری رحمت سے محروم ہو گئے ہو اور قیامت کے دن تک تم پر لعنت برستی رہے گی۔"

اس پر شیطان نے پروردگار عالم سے درخواست کی کہ وہ اسے قیامت کے دن تک مہلت دے اور زندہ رکھے۔ خدا نے اس کی یہ درخواست قبول کر لی اور فرمایا:

"تم ان لوگوں میں سے ہو جنھیں اس مقررہ دن تک مہلت دی گئی ہے۔"

لیکن جب اس کی درخواست قبول ہو گئی تو اس نے خدا کے اس احسان کا شکر ادا نہیں کیا بلکہ اس کی نعمت کا جواب ناشکر پن سے دیا اور کہا: "چونکہ تو نے مجھے گمراہ قرار دیا ہے اس لیے اب

میں تیرے بندوں کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھ گیا ہوں اور انہیں گمراہ کرنے کی کوشش میں لگ گیا ہوں۔ پس میں ان کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں سے ان کے پاس آؤں گا اور تو ان میں سے بہتوں کو اپنا شکر گزار نہیں پائے گا۔"

اس طرح خدا نے شیطان کی خواہشیں پوری کر دیں اور اس کو اپنی بارگاہ سے نکال دیا اور فرمایا: "تم نے اپنے لیے جو راستا چنا ہے، اب اس پر چل پڑو اور ان بندوں میں سے جس جس پر تمہارا بس چلے اسے اپنی آواز سے مضطرب اور پریشان کرو۔ تم اپنے سوار اور پیادہ لشکریوں کو ساتھ لیکر ان پر چڑھائی کرو، ان کے مال اور اولاد میں ان کے شریک ہو، انہیں جھوٹے وعدوں سے خوش کرو اور لمبی چوڑی آرزوؤں کے چکر میں ڈال دو، لیکن جو لوگ محکم عقیدہ اور پختہ عزم رکھتے ہیں اور میرے با اخلاص بندے ہیں انہیں گمراہ کرنے کے لیے میں تمہیں ہرگز آزاد نہیں چھوڑوں گا اور تمہیں ان پر مسلّط نہیں ہونے دوں گا۔ کیونکہ ان کے دل تمہاری طرف متوجہ نہیں ہوتے اور ان کے کان تمہاری باتیں سننے کو تیار نہیں ہیں۔"

تم نے انسانوں کو بھٹکانے اور اپنا فریفتہ بنانے کا جو ارادہ کیا ہے اس گناہ کا تم سے بڑا سخت حساب لیا جائے گا۔ تم کو اس کی کڑی سزا دی جائے گی اور میں تم سے اور تمہارے پیروؤں سے دوزخ کو بھر دوں گا۔

فرشتوں نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کیا اور خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے بلند مقام کا اعتراف کیا۔ تاہم یوں لگتا تھا کہ وہ کچھ ایسا

گمان رکھتے ہیں کہ شاید وہ علم اور فہم میں آدمؑ سے برتر ہیں۔ اس لیے خدا نے اپنے علم کا کچھ حصہ آدمؑ کو عنایت کیا۔ انہیں اپنے نور سے منور کیا اور اپنی مخلوق کے نام انہیں سکھائے۔ پھر اس مقصد سے کہ فرشتوں پر خود ان کا عجز اور کم علمی ظاہر ہو جائے اور وہ یہ سمجھ جائیں کہ حکمت خداوندی اس امر کی متقاضی تھی کہ حضرت آدمؑ ان سے بڑھ کر عالم اور اس کی جانشینی کے اہل ہوں۔ چنانچہ خدا نے یہ کائنات ان کے سامنے پیش کی اور فرمایا: "اگر تمہارا کہنا درست ہے تو ان موجودات کے نام بتاؤ۔"

فرشتے مبہوت رہ گئے اور جواب نہ دے پائے۔ تب انہوں نے اپنی ناتوانی اور علم کی کمی کا اعتراف کیا اور کہا: "اے پروردگار! جو علم تو نے ہمیں سکھایا ہے، ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے اور بلاشبہ تو ہی عالم اور حکیم مطلق ہے۔ چونکہ حضرت آدمؑ نے پروردگار کے فیض کے سمندر میں سے ایک قطرہ چکھ رکھا تھا اور وہ اس کے علم کے پرتو سے بہرہ مند ہو چکے تھے، اس لیے خدا نے انہیں حکم دیا کہ وہ فرشتوں کو وہ باتیں بتائیں کہ جن کے بتانے سے وہ قاصر رہے تھے تاکہ اس وسیلے سے آدمؑ کی فضیلت اور خلافت کے لیے ان کے انتخاب میں پوشیدہ حکمت واضح ہو جائے۔ جب حضرت آدمؑ نے وہ باتیں فرشتوں کو بتا دیں تو خدائے تعالیٰ نے فرمایا:

> "اے ملائکہ! کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ میں زمین اور آسمانوں کے تمام راز جانتا ہوں اور تمہارے تمام ظاہر اور پوشیدہ کاموں سے واقف ہوں؟"

تب فرشتوں کو آدمؑ کی فضیلت معلوم ہوگئی اور وہ ان کی تخلیق کا راز اور ان کے جانشین بنائے جانے میں پوشیدہ حکمت کو سمجھ گئے۔

خدا نے شیطان سے اپنی نعمت چھین لی اور اپنی رحمت سے محروم کردیا۔ پھر آدمؑ اور ان کی بیوی کو بہشت میں جگہ دی اور آدمؑ سے فرمایا: "میں نے جو نعمت تمہیں عطا کی ہے اسے یاد رکھنا۔ میں نے تمہیں ایک انوکھی شکل میں پیدا کیا ہے اور تمہاری صورت میں ایک ایسا بشر وجود میں لایا ہوں، جیسا کہ میں چاہتا تھا۔ میں نے اپنی روح تمہارے اندر پھونکی ہے، تمہیں فرشتوں سے سجدہ کرایا ہے اور اپنے علم کا کچھ حصہ تمہیں بخشا ہے۔ ہاں تو یہ شیطان ہے کہ جسے میں نے اپنی رحمت سے مایوس کردیا ہے۔ چونکہ اس نے میری نافرمانی کی، اس لیے میں نے اس پر لعنت بھیج دی ہے۔ پس اب میں نے بہشت کو جو ہمیشہ کے لیے رہنے کی جگہ ہے تمہاری جائے قیام قرار دیا ہے۔ اگر تم میری اطاعت کروگے تو میں تمہیں ہمیشہ بہشت میں رکھوں گا اور اگر میرا پیمان توڑو گے تو میں تمہیں اپنے اس گھر سے نکال دوں گا اور اپنی خلق کی ہوئی آگ کا عذاب دوں گا۔ ہاں تم ہوشیار رہو کہ شیطان جو تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے وہ کہیں تمہیں بہشت سے نکلوا نہ دے اور تم بدبختی میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔"

خدا نے حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی کو اجازت دی کہ وہ بڑی خوشی سے بہشت کی نعمتیں استعمال میں لائیں اور جو میوہ چاہیں توڑ کر کھائیں، لیکن اس نے انھیں بہشت کے درختوں میں سے ایک

درخت کے نزدیک جانے سے منع کیا اور اس غرض سے کہ بات مبہم نہ رہے اور وہ اس درخت کو پہچان لیں، اس نے اس درخت کی طرف اشارہ کرکے بتادیا۔ پھر انہیں اس کے نزدیک جانے سے خبردار کیا اور کہا کہ اگر وہ اس کے نزدیک جائیں گے یا اس کا پھل کھائیں گے تو ظالموں میں شمار ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی ان سے یہ وعدہ بھی کیا کہ اگر وہ اس درخت سے دور رہیں گے تو وہ بہشت کی نعمتوں کو ان کے لیے جاودانی بنادے گا۔ وہ ہرگز بھوکے اور ننگے نہ رہیں گے اور پیاس وغیرہ کی تکلیف سے دوچار نہ ہوں گے۔

> پھر فرمایا: "اے آدمؑ! تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو اور پورے اطمینان سے جو جی چاہے کھاؤ لیکن اس درخت کے نزدیک نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔
>
> بلاشبہ بہشت میں تم بھوکے اور ننگے نہیں رہو گے۔ پیاس کی تکلیف سے دوچار نہیں ہو گے اور سورج کی تپش کی سختی سے محفوظ رہو گے۔"

اب حضرت آدمؑ بہشت میں رہنے لگے اور وہاں جو جی چاہے کھایا پیا کرتے تھے۔ شاید وہ درختوں تلے چہل قدمی کرتے اور ان کے سائے میں خوشی حاصل کرتے تھے۔ وہ پھول چنتے، پھل کھاتے اور مزیدار پانی پیتے تھے۔ تب ان کی بیوی بھی ان کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اسی طرح انہوں نے کچھ وقت خوشی اور سعادت کے ساتھ گزارا۔

تاہم شیطان کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی تھی کہ آدمؑ اور ان

کی بیوی تو آرام اور خوشی کے ساتھ دن گزاریں اور وہ درگاہ الٰہی کا راندا ہوا بہشت سے دور اپنا وقت کاٹے۔ لہٰذا اس نے ان کی خوش بختی کے محل کو ڈھا دینے اور انہیں نعمتوں سے محروم کر دینے کا ارادہ باندھ لیا۔ ہاں آدمؑ وہی تو تھے جنہوں نے اسے اس کے بلند مقام سے نیچے دے پٹخا تھا اور اسے خدا کی نعمت اور خوشنودی سے دور کر دیا تھا۔ وہی آدمؑ کہ جن کی وجہ سے اس کی سرکشی اور نابکاری ظاہر ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ اب آدمؑ سے انتقام لینا اور انہیں فریب دیکر بے وقعت کر دینا چاہیے۔ اس لیے وہ آہستہ آہستہ بہشت میں داخل ہوا اور حضرت آدمؑ سے ظاہر اور خفیہ باتیں کیں۔ اس نے اپنے آپ کو ایک پاک دل دوست اور مخلص ناصح ظاہر کیا۔ اس نے حضرت آدمؑ کا دل جیتنے کی بے انتہا کوشش کی اور اپنے تمام داؤ آزمائے۔ اس نے حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی سے بڑی محبت جتائی اور اس بات پر ہمدردی کا اظہار کیا کہ انھیں بعض نعمتوں سے محروم رکھا گیا ہے۔ وہ کہنے لگا: "خدا نے تمہیں اس درخت کا پھل کھانے سے اس لیے منع کیا ہے کہ اگر تم اسے کھا لوگے تو تم دونوں فرشتے بن جاؤ گے یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بہشت میں بسے رہو گے۔

شیطان نے دیکھا کہ حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی اسکی باتیں سُن کر خوفزدہ ہو گئے ہیں اور اس کا مشورہ قبول کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ اس کی باتوں پر توجہ نہیں دے رہے اور اس کی نصیحت سننے پر آمادہ نہیں ہیں۔ لہٰذا اس نے قسم کھائی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور تمہیں نقصان پہنچانا یا مصیبت میں مبتلا کرنا نہیں

چاہتا۔ اس نے اس لیے قسم کھائی کہ اپنی نیک نیتی اور خیر خواہی ان پر ثابت کر دے۔ پھر انھیں گمراہ کرنے کے لیے بے حد اصرار کیا اور انہیں یہ کہہ کر دھوکا دیا کہ ذرا دیکھو تو سہی اس درخت کی مہک کتنی اچھی ہے اس کا مزا کتنا عمدہ ہے اور اس کا رنگ کتنا دلکش ہے۔ اسکی چکنی چپڑی باتیں سن کر حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی اس کے بہکاوے میں آگئے اور اس کے گوناگوں دلفریب وعدوں سے دھوکا کھا گئے اور اس کی بات مان لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سے ایک بہت بڑی لغزش سرزد ہو گئی۔

جب حضرت آدمؑ اور حوا نے خدا کے حکم سے سرتابی کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت ان سے واپس لے لی، بہشت ان کے لیے ناجائز کر دیا اور فرمایا: "کیا میں نے تمہیں اس درخت کے نزدیک جانے سے منع نہیں کیا تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے؟"

حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی خدا کی بارگاہ میں جھک پڑے، انہوں نے توبہ کی، اپنے کیے پر پشیمان ہوئے اور کہنے لگے:

"اے پروردگار! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں معاف نہیں کرے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔"

خدائے تعالیٰ نے فرمایا:

"تم اس جگہ سے باہر ہو جاؤ۔ اب زمین ہی تمہاری منزل اور قیام گاہ ہو گی اور تم قیامت تک ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔"

خدا نے ان کی توبہ قبول کی اور ان کی لغزش سے چشم پوشی کی۔ تب حضرت آدمؑ اور حوا کے دلوں میں خوشی کی فرحت بخش ہوا چلنے لگی اور مسرت کا نور ان کی آنکھوں میں چمکنے لگا۔ ان کے دلوں میں امید کی کرن پھوٹی اور اس بات کی امید بندھی کہ وہ دوبارہ بہشت میں رہیں گے اور اس کی نعمتوں سے مستفید ہوں گے۔ وہ جو کچھ سوچ رہے تھے خدا کو اس کا علم تھا، اس لیے اس نے انہیں حکم دیا کہ وہ بہشت سے نکل جائیں اور انہیں یہ بھی بتا دیا کہ اب ان کے اور شیطان کے درمیان دشمنی چلتی رہے گی۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ وہ اس فتنے سے محتاط رہیں اور اس کے بہکاوے میں نہ آئیں۔

پھر فرمایا: "تم سب بہشت سے چلے جاؤ۔ اب تم میں سے بعض ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے لیکن میری جانب سے رہنمائی کے وسیلے تم تک پہنچتے رہیں گے اور جو کوئی ان کی پیروی کرے گا وہ گمراہ اور بدنصیب نہ ہو گا۔"

خدائے تعالیٰ نے احتیاج کو آدمؑ کی زندگی کا لازمہ قرار دیا اور امید کو ان کی فطرت میں ودیعت کر دیا تا کہ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے محنت کریں۔ نیز انہیں یہ بھی بتا دیا کہ ان کی وہ سراپا نعمت اور آسائش کی زندگی گزر گئی ہے۔ اب وہ بہشت سے باہر جا رہے ہیں اور اس کی نعمتوں سے محروم ہو رہے ہیں۔ آج کے دن وہ ایک ایسے ماحول میں قدم رکھ رہے ہیں جہاں ان کے سامنے دو راستے ہیں۔ ان میں سے ایک نجات اور ایمان کا راستہ ہے اور دوسرا گمراہی اور کفر کا ہے۔ پس جو شخص اس راستے پر چلے گا

جو خدا نے متعین کیا ہے، وہ سیدھے راستے سے نہیں بھٹکے گا اور اسے شیطان کے وسوسے اور فریب کا کوئی خوف نہ ہو گا لیکن جو شخص خدا کے ذکر سے منہ پھیرے گا اور اس کے مقررہ راستے سے انحراف کرے گا اس کی زندگی ناگوار ہو گی اور وہ ان لوگوں میں سے ہو گا جو دنیا میں فضول کوشش کرتے رہتے ہیں اور اس کے باوجود یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ نیکوکار اور خوش نصیب ہیں۔

فرزندانِ آدم

نظامِ آفرینش اس دن سے بتدریج ترقی کرنے لگا جس دن حوا نے اپنے فرزندوں کو جنم دیا تھا۔ یہ وہ فرزند تھے جو باغ انسانیت کے پہلے شگوفے اور گلستان بشریت کی پہلی فرحت بخش ہوا تھے۔ یہ وہ فرزند تھے جنہیں اپنی مہربان ماں کا مونس اور اس کے شوہر آدمؑ کی خوش نصیبی کا موجب بننا تھا۔ ان میاں بیوی کی یہ دلی خواہش تھی کہ وہ روئے زمین پر اپنے جگر گوشوں کو پھلتے پھولتے دیکھیں۔ ان کے ذریعے ان کی نسل اس زمین کے اطراف واکناف میں پھیلے۔ وہ لوگ زمین کے کونے کونے تک جا پہنچیں اور خدا کی عطا کی ہوئی روزی کھائیں۔ حضرت آدمؑ اپنے فرزندوں پر بے حد مہربان تھے اور حوا بھی ان کی پیدائش پر بہت خوش تھیں۔ پہلے کی تمام دلگیریوں اور پریشانیوں کے بعد لازم تھا کہ اب وہ خوش ہوں اور ان کے دل مسرت

سے مالا مال ہو جائیں۔

دو بار حاملہ ہونے میں حوا نے چار بچوں کو جنم دیا۔ پہلی دفعہ قابیل اور اس کی بہن پیدا ہوئی اور دوسری دفعہ ہابیل اور اس کی بہن دنیا میں آئی۔ دونوں بھائیوں نے اپنے والدین کے زیر سایہ پرورش پائی، حتیٰ کہ زندگی کی بہار اور جوانی کی نشانیاں ان میں ظاہر ہونے لگیں۔ لڑکیاں تو پل بڑھ کر زنانہ کاموں میں دلچسپی لینے لگیں اور لڑکے روزی کمانے کی کوششوں میں مشغول ہو گئے۔ قابیل کھیتی باڑی کرنے لگا اور اس کے بھائی ہابیل نے جانور اور بھیڑیں پالنے کا پیشہ اختیار کیا۔

دونوں بھائیوں کے دن ہنسی خوشی گزر رہے تھے اور کامیابی اور امن و سکون نے اس خاندان پر اپنا سائبان تان رکھا تھا۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد ان دونوں بھائیوں میں مردانگی کے جذبات بیدار ہو گئے اور ان کے دلوں میں مناکحت کی خواہش کروٹیں لینے لگی۔

خدائے تعالیٰ نے روز اول ہی سے یہ چاہا تھا کہ حضرت آدمؑ کے فرزندوں کو دنیا میں آزمایا جائے۔ وہ اس طرح کہ ان کی دولت اور اولاد بڑھتی جائے اور ان کے دم قدم سے زمین تر و تازہ اور آراستہ ہو جائے۔ تقدیر کے قلم نے انسان کی قسمت یوں متعین کی تھی کہ سب لوگ ایک جیسے نہ ہوں۔ نیز یہ لازم قرار دیا کہ انسان تعداد میں بڑھ جائیں اور صورت، نوع، خلقت اور خوش نصیبی و بد نصیبی میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ اس لیے خدائے تعالیٰ نے ابو البشر آدمؑ کو وحی بھیجی کہ وہ اپنے بیٹوں میں سے ہر ایک کی تزویج دوسرے کی بہن سے کر دیں۔

جب حضرت آدمؑ نے خدا کے فرمان کے بارے میں اپنے فرزندوں

کو بتایا تو انہیں امید تھی کہ وہ اس کو کسی چون و چرا کے بغیر مان لیں گے۔ ان کا یہ خیال درست تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اگر ان کے ایک بیٹے کی خود غرضی اور سرکشی اس کو بد بختی کے گڑھے میں نہ دھکیل دیتی تو باپ کی یہ آرزو ضرور پوری ہو جاتی۔

انسانی جبلت کا سوتا حرص اور طمع کی دو قوتوں سے پھوٹتا ہے۔ جو شخص اپنی خواہش نفس کو محدود کر لیتا ہے، اس پر قابو پا لیتا ہے، وہ ان لوگوں میں سے ہوتا ہے جنہیں خدائے تعالیٰ دنیا اور آخرت میں عزیز رکھتا ہے لیکن جو شخص نفسانی قوت کو آزاد چھوڑ دیتا ہے اور اسے عقل کے تابع نہیں رکھتا وہ نقصان اٹھاتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہوتا ہے کہ اس دنیا میں جن کی کوشش بے فائدہ ہوتی ہے اور اس کے باوجود وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ نیکوکار ہیں۔ دراصل یہ بشریت کی آزمائش گاہ اور انسانیت کی فطرت کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔

جب حضرت آدمؑ نے اپنے دل کی بات بیٹوں کو بتائی تو قابیل نے اس کا بڑا مانا اور اس نے باپ کے فیصلے کی اس لیے مخالفت کی کیونکہ جو لڑکی اس کے بھائی کو ملنے والی تھی وہ زیادہ خوبصورت تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے بھائی سے حسد کیا اور اس تقسیم پر راضی نہ ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا نکاح اس لڑکی سے کیا جائے جو اس کے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔ [1]

---

[1] آدمؑ کے بیٹوں کی تزویج کے بارے میں جو روایات آئی ہیں ان میں اختلاف نظر آتا ہے۔ جو کچھ اس کتاب کے متن میں لکھا گیا ہے وہ ان میں سے بعض روایات

حسن وجمال ایک تیز جھکڑ کی مانند ہے جو انسان کو اپنی جگہ سے ہلاکر رکھ دیتا ہے اور پھر اس کو اِدھر اُدھر پٹختا رہتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ اسے تباہی اور موت کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔

اس معاملے میں بھی حسن وجمال ہی نے ان دونوں بھائیوں میں تفرقہ ڈالا اور غصہ ونفرت پیدا کرنے کا موجب بن گیا' یہاں تک کہ اس

کے مطابق ہے۔ جن حضرات نے یہ روایات نقل کی ہیں وہ محرم مرد وزن کے نکاح کے حرام ہونے کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس وقت جبکہ انسان نے اس زمین پر اپنی زندگی کا ابھی آغاز ہی کیا تھا۔ اس کی نسل کی بقار کے لیے اس طرح کے نکاح کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔ پس خدائے تعالیٰ نے وقتی طور پر ایسا نکاح کرنے کی اجازت دیدی اور بعدازاں ان کو ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیدیا۔

لیکن ان کے علاوہ دیگر روایات کہ جن میں سے بیشتر کو شیعہ علمار نے نقل کیا ہے ان سے پتا چلتا ہے کہ خدا نے حضرت آدمؑ کے بیٹوں کی زوجیت کے لیے پریزادیں بھیجیں اور یوں انسان کی نسل آگے بڑھی۔

جہاں تک ہابیل وقابیل کے درمیان پیدا ہونیوالے اختلاف کا تعلق ہے اس کے متعلق شیعہ راویوں کا کہنا ہے کہ آدمؑ نے خدا کے حکم سے میراث نبوت ہابیل کے سپرد کی' جو اس کا اہل تھا' لیکن قابیل کو اس میراث سے اپنی محرومی پر بڑا طیش آیا اور وہ اپنے بھائی ہابیل سے حسد کرنے لگا۔ اسی حسد کے نتیجے میں بالآخر اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدمؑ کے بیٹوں کی تزویج اور انکے اختلاف کے بارے میں شیعہ علمار کی روایات شرافت اور معقولیت کی حامل ہیں۔

نے ان میں سے ایک کو باپ کے حکم سے سرتابی کرنے اور پیمان توڑنے پر آمادہ کر دیا۔

ایسے پریشان کن خیالات کہ جن کی ہرگز توقع نہ تھی وہ مہربان باپ کے دماغ میں طوفان کی مانند امنڈنے لگے۔ اس وقت حضرت آدمؑ دو چیزوں کے متعلق سوچ رہے تھے۔ پہلی یہ کہ وہ اپنے بیٹے کی خواہش کے مطابق عمل کریں اور دوسری یہ کہ ان دونوں بھائیوں میں پیدا ہونیوالے اس اختلاف کا سدباب کریں۔ تاہم وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے، حتیٰ کہ خدا نے ان کی رہنمائی ایک ایسے کام کی جانب کی جس سے اس اختلاف کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ خدا کے حکم کے مطابق حضرت آدمؑ نے اپنے دونوں بیٹوں کو طلب کیا اور انہیں ہدایت کی کہ ان میں سے ہر ایک پروردگار عالم کی بارگاہ میں قربانی پیش کرے۔ پس جس کی قربانی قبول ہو جائے گی وہ اپنے دل کی مراد پالے گا۔ ہابیل اپنے جانوروں میں سے ایک اونٹ یا بھیڑ لے آیا اور قابیل نے اپنے کھیت کی بالیوں کا ایک گٹھا پیش کیا۔ پھر ان دونوں میں سے ہر ایک یہ آس لگا کر بیٹھ گیا کہ قرعہ اسی کے نام کا نکلے گا اور مقابلے میں اسی کی جیت ہو گی۔

ہابیل، جو ایک راستباز اور ثابت قدم شخص تھا۔ اس کی قربانی قبول ہو گئی اور اس کے بھائی قابیل کی قربانی قبول نہ ہوئی، کیونکہ اس نے اپنے باپ کا حکم نہیں مانا تھا اور اس نے قربانی بھی خلوص نیت سے پیش نہیں کی تھی۔

(سورۂ مائدہ - آیت ۲۷)

قابیل عجیب پریشانی میں مبتلا تھا کیونکہ امید کی روشنی اس کے دل سے بجھ گئی تھی۔

دشمنی کی آگ اس کے سینے میں بھڑکنے لگی اور اس کی برائی ظاہر ہوگئی۔ اس نے اپنے بھائی کو ڈرایا دھمکایا اور کہا: "میں یقیناً تمہیں مار ڈالوں گا" تاکہ میں تمہاری خوش نصیبی اور اپنی بدنصیبی کو نہ دیکھوں۔ یہ نہ ہو کہ تمہاری مراد بر آئے اور میں زخم خوردہ احساسات اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ زندگی بسر کروں۔ ہابیل نے بڑی خوش روئی کے ساتھ اسے جواب دیا: بھائی جان بہتر تو یہ ہے کہ آپ سبب مرض کی تشخیص کریں اور اسے دور کریں۔ پھر خوش قسمتی کے راستے کو پہچانیں اور اس پہ چلیں، کیونکہ خدائے تعالیٰ پرہیزگار لوگوں کے علاوہ کسی کا عمل قبول نہیں کرتا۔

ہابیل ایک ایسا شخص تھا کہ جسے خدا نے قوی عقل اور صحت مند جسم عطا کیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو خدائے تعالیٰ کی امانت کی نگہداشت کرتے ہیں۔ اسے حکمت خداوندی کا تحفہ دیا گیا تھا اور وہ خدا کی خوشنودی کو ہر چیز پر مقدم سمجھتا اور ماں باپ کی فرمانبرداری کرتا تھا۔ وہ اپنے مقدر پر راضی تھا اور دنیاوی زندگی کو ایک ناپائیدار چیز سمجھتا تھا۔ وہ اپنے بھائی پر مہربان بھی تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس سے خوفزدہ بھی تھا۔ وہ اسے ہمیشہ نصیحتیں کرتا رہتا اور اس کا بڑا ادب و لحاظ کرتا تھا۔ ہابیل کی زندگی اسی طرح گزر رہی تھی اور وہ اپنے اندر ایک باطنی قوت کی موجودگی کو محسوس کرتا تھا۔ اسی وجہ سے مغرور، گمراہ، خودغرض اور سرکش قابیل کی دھمکی کا اسے کوئی غم نہ تھا اور اس نے اپنے آپ کو تقدیر کے

سپرد کر رکھا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے خلاف کوئی برا ارادہ نہیں کیا اور کبھی اس سے برائی کرنے کا خیال تک بھی اس کے دل میں نہ آیا تھا۔ کیونکہ پاک پروردگار نے ابتدائے خلقت میں ہی اسے نیک خو بنایا تھا اور وہ ہمیشہ خدا سے ڈرتا رہتا تھا۔

اب ہابیل نے اپنے بھائی کو نصیحتیں کرنا شروع کیں کہ شاید اس کی باتیں اس کے دل سے کینہ کی بیماری کو دور کرسکیں۔ اس نے قابیل سے کہا: بھائی جان! آپ سیدھے راستے سے بھٹک گئے ہیں اور آپ نے جس کام کا ارادہ کیا ہے وہ ایک بڑا گناہ ہے۔ آپ کا عقیدہ غلط اور حقیقت سے دُور ہے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ آپ خدائے تعالیٰ سے معافی مانگیں اور گمراہی سے باز آجائیں، لیکن اگر آپ نے پختہ ارادہ کرلیا ہے اور واقعی اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرنا چاہتے ہیں تو میں گناہ میں آلودہ ہونے اور دل کے سیاہ ہونے کے خوف سے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ پس آپ یہ گناہ اپنے ذمے لے لیں تاکہ دوزخیوں میں سے ہو جائیں اور یہی ظالموں کی سزا ہے۔

تاہم یہ برادرانہ جذبات قابیل کے دل میں سلگتی ہوئی دشمنی کی آگ کو ٹھنڈا نہ کرسکے۔ نیز خدا کا خوف اور والدین کے حقوق کی رعایت بھی اس پہلے گنہگار انسان کو گناہ کے ارتکاب سے باز نہ رکھ سکی۔ پھر وہ گھڑی آن پہنچی کہ جس میں ایک خود غرض اور نافرمان نے وار کیا ــــ اور ہابیل اپنے بھائی کے ہاتھ سے قتل ہو گیا۔ ہاں! قابیل کی حماقت اور نادانی کے نتیجے میں ہابیل مارا گیا۔

ہابیل کی زندگی کا ہرا بھرا درخت گر پڑا ــــ اس کی زندگی کا چراغ

گل ہو گیا اور جس طرح وہ باپ کی نظروں میں بسا تھا اسی طرح اوجھل بھی ہو گیا۔ اپنے بیٹے کے گم ہو جانے سے حضرت آدمؑ کو بے حد پریشانی ہوئی اور وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ جب انھوں نے قابیل سے اس کے بھائی کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنے باپ کو بڑی بے وقوفی اور بدتمیزی کے ساتھ جواب دیا کہ میں کوئی اس کا نگہبان تو نہیں تھا۔

اب حضرت آدمؑ سمجھ گئے کہ ان کا بیٹا قتل ہو گیا ہے۔ انہوں نے رنج وغم کے عالم میں خاموشی اختیار کرلی اور جو آگ بیٹے کے گم ہو جانے کی وجہ سے ان کے سینے میں سلگ رہی تھی اسے خاموشی کے ڈھکنے کے ساتھ ڈھانپ دیا۔

ہابیل وہ پہلا انسان تھا جو روئے زمین پر مارا گیا اور قابیل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب اپنے بھائی کے بے جان جسم کو کیا کرے۔ اس نے اسے ایک بوری میں ڈالا اور اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ وہ بے حد مضطرب اور غمگین تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا' جبکہ اس کے باطن میں بھائی کی محبت اور محبوب کی چاہت کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس نے وہ رات بڑی پریشانی میں گزاری۔ ادھر غم کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی اسے گھیرے ہوئے تھی۔ اس حال میں قابیل اپنے بھائی کی میت اٹھائے تھک گیا اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

یہی وہ مقام تھا جب یہ لازم ہو گیا کہ خدائے تعالیٰ کی رحمت نازل ہو تاکہ اس جسم کا احترام محفوظ رہے اور مُردوں کے بارے میں دوسرں

کی ذمہ داری واضح ہو جائے۔ نیز آدمؑ اور ان کی اولاد کی قدر و منزلت بھی قائم رہے۔

پھر یہی وہ مقام تھا جب یہ لازم ہو گیا کہ وہ مغرور اور بے عقل نوجوان (قابیل) بھی ایک سبق سیکھے۔ چونکہ وہ خدائے تعالیٰ کی وحی اور الہام کے قابل نہیں تھا' اس لیے ضروری تھا کہ وہ کوے کا شاگرد بنے۔ تاکہ وہ اس ناپسندیدہ سیاہ پرندے کے مقابلے میں اپنی عقل کی کوتاہی کو سمجھے اور یہ دردناک سبق سیکھنے کے بعد کہ جو اس نے بڑی ذلت و خواری سے سیکھا ہے' وہ اپنی شخصیت کی پستی کو دیکھ لے۔

تب خدائے تعالیٰ نے قابیل کے سامنے دو کوے بھیجے اور ان میں سے ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ پھر اپنی چونچ کے ساتھ زمین کھودی اور دوسرے کوے کا مردہ جسم اس میں رکھ کر اس پر مٹی ڈال دی۔ اس موقع پر قابیل سراپا پشیمانی اور حسرت میں ڈوب گیا اور کہنے لگا:

> "افسوس! کیا میں اتنی صلاحیت بھی نہیں رکھتا تھا کہ اس کوے کی طرح اپنے بھائی کا جسم مٹی کے نیچے چھپا دیتا؟"
>
> (سورۂ مائدہ - آیت ۳۱)

حضرت ادریس علیہ السلام

حضرت ادریسؑ، حضرت آدمؑ کے نواسوں میں سے تھے۔ آپ ہی وہ پہلے شخص تھے جو آدمؑ اور شیثؑ کے بعد پیغمبری کے منصب پر فائز ہوئے۔ وہ لوگوں کو خدائے واحد کی پرستش کرنے اور گناہوں سے بچنے کی نصیحت کرتے تھے اور اپنے پیروؤں کو دوسرے پیغمبروں اور بالخصوص حضرت خاتم الانبیاءؐ کے آنے کی خوشخبری دیتے اور کہتے تھے: آنحضرتؐ تمام روحانی فضائل سے آراستہ ہیں اور انکا دین وہ دین ہے جو روئے زمین کی اصلاح کردے گا۔

حضرت ادریسؑ سے کئی ایک حکمت آمیز مقولے نقل ہوئے ہیں جن کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

(۱) خدا کی نعمتوں کا بہترین شکرانہ اس کے بندوں کے ساتھ

احسان اور نیکی کرنا ہے۔

② جھوٹی قسم مت کھاؤ اور جھوٹ بولنے والوں کو قسم کھانے کا موقع نہ دو۔

③ گھٹیا پیشے اختیار کرنے سے اجتناب کرو۔

④ خدا کی بارگاہ میں خالص نیت کے ساتھ حاضر ہوا کرو۔

حضرت ادریسؑ کی نبوت کی ابتدا کا قصہ یوں ہے کہ اس زمانے میں ان کی قوم پر ایک ظالم بادشاہ حکومت کرتا تھا اور اس کو لوگوں کے مال اور جان پر پورا اختیار حاصل تھا۔ ایک دن بادشاہ سیر و تفریح کے لیے اپنے قصر شاہی سے باہر نکلا۔ چلتے چلتے اس کا گذر ایک سرسبز و شاداب باغ کے پاس سے ہوا جو اسے بہت پسند آیا۔ اس نے اپنے وزیروں سے پوچھا: یہ باغ کس کا ہے؟ انہوں نے بتایا: اس باغ کا مالک فلاں نام کا ایک خدا پرست آدمی ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا: اس شخص کو حاضر کیا جائے۔ جب اس شخص کو وہاں لایا گیا تو بادشاہ نے اس سے یہ تقاضا کیا: تم یہ زمین مجھے دیدو۔ وہ با ایمان آدمی کہ جو خدائے تعالیٰ پر بھروسا کرتا تھا، اس نے جواب دیا: میرے بیوی بچے ہیں جن کو آپ سے زیادہ اس باغ کی ضرورت ہے۔ بادشاہ نے کہا: اچھا تو پھر تم یہ زمین میرے ہاتھ بیچ دو۔ مگر وہ آدمی اس پر بھی رضامند نہ ہوا۔ اس پر وہ بادشاہ غصے کے عالم میں گھر واپس آگیا۔ وہ بے حد مضطرب نظر آتا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے، اس شخص سے یہ زمین ضرور حاصل کرے۔

اس بادشاہ کی بیوی ایک بدطینت عورت تھی۔ جب اس نے

اپنے شوہر کو غضبناک دیکھا تو اس کی وجہ پوچھی۔ بادشاہ نے اسے زمین اور اس کے مالک کا قصہ سنایا اور کہا: اس شخص نے زمین دینے سے انکار کیا ہے جس سے میں سخت اشتعال میں ہوں۔ اس کی بیوی نے کہا: اس چیز کا علاج تو ایک معمولی سی بات ہے۔ وہ یہ کہ تم اپنے کچھ بدطینت اور بدعقیدہ دوستوں کو بلاؤ اور انہیں کہو کہ وہ تمہارے سامنے یہ گواہی دیں کہ فلاں شخص (زمین کا مالک) تمہارے دین سے منحرف ہو گیا ہے اور گمراہ لوگوں کے ساتھ جا ملا ہے۔

چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور ان لوگوں کی گواہی کی بنیاد پر زمین کے مالک کو مروا دیا اور زمین پر خود قبضہ کر لیا۔

اس عظیم جرم کے مقابلے میں پروردگار عالم کے غضب کا سمندر جوش میں آیا اور حضرت ادریسؑ پر یہ وحی نازل ہوئی: تم اس ظالم بادشاہ کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ تو نے ہمارے بندے کو صرف قتل ہی نہیں کیا بلکہ اس کی املاک پر قبضہ بھی کر لیا ہے۔ اس طرح تم نے اس کے بیوی بچوں کو بیکس اور بے بس بنا دیا ہے۔ ہاں یاد رکھو کہ ہم تجھ سے انتقام لیں گے اور تیری یہ سلطنت تجھ سے چھین لیں گے۔ ہم تیرے شاہی محل کو ویران کر دیں گے اور تیری بدطینت بیوی کا گوشت کتوں کی خوراک بنا دیں گے۔ کیا ہمارے حلم اور بردباری نے تجھے مغرور اور سرکش بنا دیا ہے؟

حضرت ادریسؑ نے خدا کا یہ پیغام بادشاہ کو پہنچا دیا لیکن اس نے جواب میں کہا: اس سے پیشتر کہ تم میرے ہاتھ سے قتل ہو جاؤ میرے ہاں سے نکل جاؤ۔

ملکہ نے اپنے شوہر سے کہا: ادریسؑ کے خدا کے اس پیغام سے خوفزدہ مت ہوں۔ میں ابھی کچھ آدمیوں کو بھیجتی ہوں تاکہ وہ اسے (یعنی ادریسؑ کو) قتل کردیں۔ چنانچہ اس نے کچھ آدمی حضرت ادریسؑ کے پیچھے بھیجے جو حضرت ادریسؑ کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے لیکن حضرت ادریسؑ خدا کے حکم کے مطابق شہر سے نکل کر ایک جگہ چھپ گئے تھے۔ انہوں نے خدائے تعالیٰ سے عرض کی: اے پروردگار! جب تک میں درخواست نہ کروں تو اس شہر پہ بارانِ رحمت نہ برسانا۔ حضرت ادریسؑ کی دعا قبول ہوئی اور انہوں نے پہاڑ کے ایک غار میں پناہ لے لی۔ خدا نے ان کی خاطر ایک فرشتہ مامور کردیا، جو ہر رات ان کی ضرورت کا سامانِ خورد و نوش انہیں پہنچا دیا کرتا تھا۔

حضرت ادریسؑ غار میں بڑے سکون سے رہ رہے تھے اور ان کی بددعا کا تذکرہ ہر ایک کی زبان پہ تھا۔ اسی دوران میں خدا نے اس بے گناہ آدمی کا انتقام لینے کی خاطر بادشاہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ بادشاہ کی بیوی کو کتوں کی خوراک بنا دیا۔ تب وہ سلطنت ایک اور سرکش اور گنہگار کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

حضرت ادریسؑ کو غائب ہوتے پورے بیس برس گزر گئے اور اس دوران میں بارش کا ایک قطرہ بھی زمین پہ نہ گرا جس سے کھیتیاں ویران ہوگئیں، پانی نہ ملنے کی وجہ سے باغ خشک ہوگئے اور لوگوں کے لیے جینا محال ہوگیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے مدد کے لیے دوسرے شہروں اور علاقوں کے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ اس تمام سختی اور بیچارگی کے نتیجے میں انہیں ہوش آگیا اور وہ کہنے لگے: ہم

پر یہ تمام بدبختی حضرت ادریسؑ کی بددعا کی وجہ سے نازل ہوئی ہے۔ انھوں نے خدا سے درخواست کی تھی کہ وہ یہاں مینہ نہ برسائے۔ اب حضرت ادریسؑ تو غائب ہیں لیکن انکا خدا ان سے بھی بڑھ کر مہربان ہے اور اس کی رحمت کا دامن بہت وسیع ہے۔ چنانچہ انھوں نے خدا کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور ندامت کا اظہار کیا۔

تب خدائے تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور حضرت ادریسؑ کو شہر کی جانب لوٹا دیا۔ لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بارگاہِ خداوندی میں نئے سرے سے توبہ کی۔ اب حضرت ادریسؑ نے خدا سے مینہ برسانے کی دعا کی تو بادل آسمان پہ چھا گئے اور رحمت کی ایسی بارش ہوئی کہ جس سے وہ لوگ سیراب ہو گئے۔

حضرت ادریس کئی سال تک اپنی قوم کی رہنمائی کرتے رہے، حتیٰ کہ خدائے تعالیٰ نے انہیں اوپر بلا لیا اور ایک اعلیٰ مقام پہ پہنچا دیا۔

حضرت نوح علیہ السلام

حضرت نوحؑ کی قوم ایک طویل عرصے سے بتوں کی پرستش کر رہی تھی۔ وہ لوگ بتوں کو خدا سمجھتے تھے' ان سے بھلائی کی امید رکھتے تھے اور بدبختی دُور کرنے کے لیے ان کے پاس پناہ لیتے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے تمام امور میں انہیں پر انحصار کرتے تھے اور انہوں نے ان کے مختلف نام رکھ چھوڑے تھے۔ وہ انہیں کبھی وَدّ اور سواع اور کبھی یعوق اور نسر کہتے تھے۔

خدائے تعالیٰ نے ان کی طرف حضرت نوحؑ کو اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا۔ حضرت نوحؑ ایک فصیح' خوش بیان' دانا اور بردبار شخص تھے اور خدا نے انہیں بحث مباحثے اور مدمقابل کو قائل کرنے کی صلاحیت دے رکھی تھی۔ حضرت نوحؑ نے انھیں خدا کی طرف بلایا' لیکن انہوں نے اس دعوت سے منہ پھیر لیا۔ آپ نے انھیں عذابِ الٰہی سے ڈرایا۔

لیکن انھوں نے آپ کی طرف سے کان بند کر لیے۔ آپ نے انھیں نیک کاموں کی جزا اور ثواب کی ترغیب دی لیکن انھوں نے سرکشی دکھائی اور اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ حضرت نوحؑ کمال بردباری اور تحمل سے ان کی رہنمائی کرتے رہے اور انہیں مؤثر اور دلنشیں پیرائے میں سمجھانے کی ہر ممکن کوشش فرماتے رہے۔

حضرت نوحؑ بے حد پرامید تھے اور انہوں نے ناامیدی کو اپنے دل پر مسلط نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے اپنی رسالت کی تبلیغ کے لیے بہترین طریقے استعمال کیے۔ دن اور رات میں جب بھی موقع ملتا ان لوگوں کو علانیہ بھی اور خفیہ طور پر بھی دعوت دیتے اور ان کی توجہ دنیا کے اسرار اور کائنات کے عجائبات کی طرف مبذول کراتے اور انہیں بتاتے کہ یہ اندھیری رات ـــ یہ آسمان ـــ یہ چمکتا ہوا چاند ـــ یہ روشن سورج ـــ یہ زمین ـــ یہ بہتی ہوئی ندیاں ـــ یہ سبزیاں اور پھل ـــ سب کے سب فصیح زبان اور محکم بیان کے ساتھ خدائے واحد اور اس کی حیرت انگیز قوت کی داستان سنا رہے ہیں۔

حضرت نوحؑ اسی طرح بحث مباحثے اور دلائل سے کام لیتے رہے حتیٰ کہ تھوڑے سے افراد ان پر ایمان لے آئے اور انہوں نے ان کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے ان کی نبوت کو تسلیم کر لیا۔ تاہم کچھ سیاہ دل لوگ جن کی فطرت میں ناپاکی اور شقاوت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور وہ قوم کے سردار اور سربرآوردہ اشخاص تھے، وہ حضرت نوحؑ پر ایمان نہ لائے اور ان سب نے مل کر آپ کو تکالیف پہنچانے کی ٹھانی۔ وہ لوگ ان کا مذاق اڑاتے اور انہیں ضعیف العقل سمجھتے تھے۔

وہ کہتے تھے: تم بھی ہمیں جیسے ایک انسان ہو اور ہمارے ہی معاشرے کے ایک فرد ہو۔ اگر خدا کو کوئی نبی بھیجنا ہی تھا تو وہ کسی فرشتے کو بھیج دیتا۔ پھر ہم بھی اس کی باتوں پر توجہ دیتے اور اس کی دعوت کو قبول کر لیتے۔ علاوہ ازیں ان رذیل، غریب اور گھٹیا پیشوں والے حقیر لوگوں کی حیثیت ہی کیا ہے، جو تمہارے پیرو بن گئے ہیں اور جنہوں نے بلا سوچے سمجھے تمہاری دعوت قبول کر لی ہے! اگر تمہارے دین میں کوئی بھلائی ہوتی تو یہ ناکارہ لوگ ہم پر سبقت نہ لے جاتے اور اگر تمہاری باتیں سچائی پر مبنی ہوتیں تو لازم تھا کہ ہم جو عقلمند اور روشن خیال لوگ ہیں تم پر پہلے ایمان لاتے اور تمہارے پیرو بن جاتے۔

پھر نوحؑ کی قوم کے لوگوں نے بحث میں ضد کا راستا اختیار کیا اور انتہائی معاندانہ اور غیر منطقی رویہ اختیار کرتے ہوئے کہنے لگے:

اے نوحؑ! ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو کسی طور بھی اپنے سے بہتر نہیں پاتے اور تمہیں عقل و خرد، دور اندیشی اور معاملات کی سوجھ بوجھ کے معاملے میں اپنے سے برتر نہیں سمجھتے بلکہ ہمارا خیال ہے کہ تم جھوٹے ہو۔
(سورۂ ہود۔ آیت ۲۷)

ان لوگوں کی احمقانہ باتوں کی وجہ سے نوحؑ نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور انھیں حسب معمول بڑی متانت سے جواب دیا:

"اگرچہ اپنے دعوائے نبوت کو صحیح ثابت کرنے کے لیے میرے پاس واضح اور روشن دلائل موجود ہیں اور خدا کا فضل اور رحمت میرے شامل حال ہے، لیکن جب تمہاری حق کو دیکھنے والی آنکھیں اندھی

ہو چکی ہیں، تم حقیقت کو نہیں دیکھ پاتے اور چاہتے ہو کہ روشن سورج کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ دو اور چمکتے ستاروں کی چمک دمک کو گل کر دو۔ اب اس صورت میں کیا میں اس بات پر قادر ہوں کہ تمہارے لیے سیدھے راستے پر چلنا ضروری قرار دوں اور تمہیں ایمان لانے پر مجبور کروں؟"

انہوں نے کہا: "اے نوحؑ! اگر تم ہماری ہدایت اور نیک بختی کے خواہشمند ہو اور چاہتے ہو کہ ہم تمہارا ساتھ دیں اور تمہارا احترام کریں، تو ان حقیر لوگوں کو جو تم پر ایمان لاتے ہیں، اپنے پاس سے ہٹا دو۔ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے ساتھ مساوی ہوں اور ہمارے طور طریقے اور اعتقادات بھی انہیں جیسے ہوں۔ ہم ایک ایسا دین کیونکر قبول کر سکتے ہیں جو بڑوں اور چھوٹوں کو برابر سمجھتا ہو اور شاہ و گدا میں کوئی فرق روا نہ رکھتا ہو!"

حضرت نوحؑ نے جواب دیا: میری دعوت ایک عام فیض ہے جس میں تمہارے عوام بھی شامل ہیں۔ تمہارے عقلمند اور نادان ــــ مشہور اور گمنام ــــ دولت مند اور تہی دست ــــ اور حاکم و محکوم اس دین میں سب برابر ہیں۔ اگر میں تمہارا کہا مان لوں اور تمہاری خاطر ان لوگوں کو الگ کر دوں تو پھر میں اپنی دعوت کو پھیلانے اور اپنی رسالت کی تائید کے لیے آخر کس پر اعتماد کروں گا؟ علاوہ ازیں کیا میں ان لوگوں کو مسترد کر دوں کہ جب تم نے مجھے تنہا چھوڑ دیا تو انھوں نے میرا ساتھ دیا اور میری باتیں ان کے دماغ میں سما گئیں۔ حالانکہ تمہاری طرف سے مجھے انکار اور تکلیف کے علاوہ کچھ نہ ملا لیکن یہ لوگ ہمیشہ دین کے طرفدار رہے ہیں اور انھوں نے دوسروں کو خدا کی جانب بلایا ہے۔ پس

اگر میں انھیں اپنے پاس سے ہٹا دوں اور وہ خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں میرے خلاف صدا بلند کریں، اس سے شکایت کریں اور کہیں کہ میں نے ان کی نیکی کا بدلہ بدی سے دیا ہے تو بتاؤ پھر میری کیا حالت ہوگی؟ سچ تو یہ ہے کہ تم نادان لوگ ہو۔

(سورۂ ہود۔ آیت ۲۹،۳۰)

جب حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے درمیان مباحثہ زور پکڑ گیا اور اختلاف بڑھ گیا تو وہ لوگ حضرت نوحؑ سے ناامید ہو گئے اور کہنے لگے:

"اے نوحؑ! تم نے ہمارے ساتھ کافی بحث و مباحثہ کر لیا ہے۔ پس اگر تم سچ کہتے ہو تو ہم سے عذاب کا جو تم نے وعدہ کیا ہے، اب اس پر عمل کرو اور ہم پر بلاء نازل کر دو۔"

(سورۂ ہود۔ آیت ۳۲)

حضرت نوحؑ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

تم بے حد بیوقوفی اور جہالت کی باتیں کرتے ہو۔ میں کون ہوں کہ تم پر عذاب نازل کروں یا اسے روک دوں۔ میں تو تمہیں جیسا ایک انسان ہوں۔ مگر یہ کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے کہ: تمہارا خدا ایک ہے اور میں خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس کا پیغام تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ چنانچہ کبھی تو میں تمہیں اجر و ثواب کی خوشخبری دیتا ہوں اور کبھی خدا کے عذاب سے ڈراتا ہوں۔ لیکن یاد رکھو کہ تم سب کو خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اگر خدا چاہے تو تمہیں ہدایت کرے، وہ چاہے تو تمہیں سزا دینے میں جلدی فرمائے اور وہ چاہے تو تمہیں مہلت دے تاکہ

تمہارے لیے عذاب کچھ اور بڑھ جائے اور تمہاری بدبختی میں اضافہ ہو جائے۔

اس مقصد سے کہ انبیاء اپنی رسالت مکمل طور پر لوگوں تک پہنچا دیں۔ خدائے تعالیٰ نے انھیں مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے صبر کی قوت اور ہمت بخشی ہے۔ اسی طرح ان کے دلوں میں امید اور تمنا کو تقویت دی ہے تاکہ جب وہ اپنی رسالت کی تبلیغ کر چکیں تو لوگوں پر حجت تمام ہو جائے اور کافروں کے لیے کسی عذر کی گنجائش باقی نہ رہے۔

حضرت نوحؑ اولوالعزم پیغمبروں میں سے تھے جو ۹۵۰ سال تک اپنی قوم کے درمیان زندہ رہے۔ انکو قوم سے جو تکالیف پہنچیں انھیں بردباری سے جھیلا اور طعن و تشنیع کو برداشت کیا۔ وہ برابر یہ آس لگائے رہے کہ جوں جوں وقت گزرے گا، اس قوم کے دلوں میں ایمان کا نور چمکنے لگے گا، لیکن بدقسمتی سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی سرکشی میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ صداقت اور حقیقت سے اور بھی دور ہوتے چلے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوحؑ کی امید کا تار ٹوٹ گیا اور ناامیدی کا اندھیرا ان کے دل پر چھا گیا۔ انھوں نے خدائے تعالیٰ کی درگاہ میں پناہ لی اور اس سے اپنی قوم کی شکایت کی۔ انھوں نے خدا کی مدد مانگی اور اس سے اپنی مشکل کا حل دریافت کیا۔ تب خدائے تعالیٰ نے ان پر وحی نازل فرمائی کہ:

"جو لوگ اب تک ایمان لا چکے ہیں، اب ان کے علاوہ کوئی اور ایمان نہیں لائے گا۔ لہذا جو بُرے کام یہ کرتے ہیں آپ انکی وجہ سے غمگین نہ ہوں۔"

(سورۂ ہود۔ آیت ۳۶)

جب حضرت نوحؑ کو حقیقتِ حال کا پتا چل گیا اور وہ سمجھ گئے کہ قوم کے دل تاریک اور سیاہ ہو چکے ہیں اور اب ان کے سامنے دلیلیں پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انھوں نے کہا: "اے پروردگار! کافروں میں سے ایک شخص کو بھی روئے زمین پر باقی نہ رکھ کیونکہ اگر تو انہیں باقی رہنے دیگا تو وہ بندوں کو گمراہ کریں گے اور یہ اپنے کافر اور فاجر بچوں کے علاوہ کوئی اور اولاد پیدا نہیں کریں گے۔"

خدائے تعالیٰ نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور ان کے پاس وحی بھیجی کہ:

"ہمارے زیرِ نظر اور ہمارے حکم اور وحی کے مطابق تم ایک کشتی بناؤ اور آئندہ ان ظالموں کے بارے میں ہم سے کچھ نہ کہنا، کیونکہ یہ غرق کر دیئے جائیں گے۔"

(سورہ ہود۔ آیت ۳۶)

حضرت نوحؑ نے اس کام کے لیے شہر سے دُور واقع ایک جگہ کا انتخاب کیا اور لکڑی کے تختے اور میخیں جمع کرکے کام شروع کر دیا۔ لیکن پھر بھی وہ ان لوگوں کے تمسخر سے بچ نہ سکے۔ ایک نے کہا:

"اے نوحؑ! کل تو تم کہتے تھے کہ میں پیغمبر ہوں لیکن آج یہ کیا ہوا ہے کہ تم بڑھئی بن گئے؟ شاید تم پیغمبری کے شغل سے بیزار ہو کر بڑھئی کے پیشے کی طرف مائل ہو گئے ہو۔"

دوسرا کہنے لگا: "تم اپنی کشتی سمندر اور ندی سے دُور کیوں بنا

رہے ہو؟ کیا تم اسے بیلوں کے ذریعے حرکت میں لانا چاہتے ہو یا ہوا میں اڑانا چاہتے ہو۔ تاہم نوحؑ نے ان کے تمسخر کی جانب کوئی توجہ نہ دی اور بزرگواری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا: اگر تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو ہم بھی بہت جلد تمہارا مذاق اڑائیں گے۔ تم جلد ہی جان لوگے کہ خوار کرنے والا عذاب اور دائمی بدبختی کس پر وارد ہوتی ہے۔

(سورۂ ہود۔ آیت ۳۸-۳۹)

حضرت نوحؑ یہ کہہ کر کشتی بنانے میں مصروف ہوگئے۔ انہوں نے چھوٹے بڑے تختے ٹھونک کر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے۔ تاکہ کشتی ہر لحاظ سے مکمل اور استعمال کے قابل بن جائے۔ پھر وہ خدا کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

خدائے تعالیٰ نے انہیں وحی بھیجی کہ: جب ہمارے عذاب کے آثار ظاہر ہوں تو آپ کشتی میں بیٹھ جائیں اور آپ کے رشتہ داروں اور دوسرے لوگوں میں سے جو آپ پر ایمان لائے ہیں انھیں بھی کشتی میں بٹھالیں اور ہر جانور کا ایک جوڑا بھی اپنے ساتھ لے لیں تاکہ خدا کا فرمان جاری ہو۔

(سورۂ ہود۔ آیت ۴۰)

پھر وہی ہوا کہ جو ہونے والا تھا۔ یعنی سخت بارش ہونے لگی اور زمین میں سے بھی پانی ابلنے لگا۔ اونچے ٹیلے سیلاب کے پانی میں چھپ گئے۔ بیابانوں اور پہاڑوں میں ہر طرف پانی چڑھ گیا۔ حضرت نوحؑ فوراً کشتی کی طرف گئے اور آدمیوں، جانوروں اور نباتات میں سے جن جن کے بارے میں خدا نے حکم دیا تھا، انھیں کشتی میں جگہ دیدی۔

تب وہ کشتی خدا کے حکم کے مطابق پانی میں تیرنے لگی۔ نرم رو ٹھنڈی ہوا اور بعض اوقات تیز ہوا کشتی میں آنے لگی۔ پانی کی غضبناک لہریں اپنے دامن میں کافروں کے لیے قبرستان بنانے لگیں اور ان کی جھاگ ان کے لیے کفن مہیا کرنے لگی۔ نوحؑ کی قوم کے سرکش لوگ موت سے دست و گریبان ہو رہے تھے لیکن موت ان پر غالب تھی۔ وہ کوہ پیکر لہروں کا مقابلہ کر رہے تھے، لیکن ان سے شکست کھا رہے تھے حتیٰ کہ پانی نے ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔

حضرت نوحؑ کشتی کے عرشے پر بیٹھے تھے اور انہوں نے دیکھا کہ ان کا بیٹا (کنعان)، جو کفر اور شقاوت میں مبتلا ہو کر ان کے دین سے منحرف ہو گیا تھا، پانی کی لہروں میں غوطے کھا رہا ہے اور اپنے بچاؤ کا کوئی وسیلہ تلاش کر رہا ہے لیکن موت لحظہ بہ لحظہ اس کے قریب ہوتی جا رہی ہے۔ اس گھڑی حضرت نوحؑ میں پدری محبت جوش میں آئی اور ان کے چہرے پر شدید بے چینی کے آثار ظاہر ہوئے۔ انہوں نے اسے اس امید پر آواز دی کہ شاید اس کے دل میں ایمان کی کرن پھوٹ نکلے اور وہ جہالت کو ترک کر کے ایمان لے آئے۔ انھوں نے کہا:

پیارے بیٹے! کہاں جا رہے ہو؟ آج تم کہیں بھی بھاگ کر جاؤ خدائے تعالیٰ کے ارادے اور اس کی قضا میں گرفتار رہو گے۔ اب بھی ایمان لے آؤ اور کشتی کی طرف آ جاؤ تاکہ ہم تم میں جدائی پیدا نہ ہو اور تمہیں اس عذاب سے نجات بھی مل جائے۔ اے بیٹے ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جاؤ اور کافر نہ بنو۔

تاہم مہربان باپ کی باتوں نے بیٹے کے سیاہ دل پہ کوئی اثر نہ کیا۔

بلکہ اس نے سوچا کہ انسانی قوت کی بدولت وہ قضا کے چنگل سے بچ نکلے گا۔ اس نے اپنے باپ کو یہ جواب دیا۔آپ مجھے اپنی کشتی کی طرف نہ بلائیں۔اب میں ایک پہاڑ پر پناہ لینے والا ہوں جو مجھے پانی کے خطرے سے محفوظ رکھے گا۔

حضرت نوحؑ نے انتہائی غم کے عالم میں فرمایا: پیارے بیٹے! یقین رکھو کہ آج خدائے تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ پروردگار کی رحمت کسی کے شامل حال ہو۔ دریں اثنا ایک بہت بڑی لہر آئی جس نے باپ بیٹے کا رابطہ منقطع کر دیا اور اس کے بعد حضرت نوحؑ نے بیٹے کو کہیں نہیں دیکھا۔ان کے دل میں غم کی آگ کے شعلے اٹھنے لگے اور انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ پھیلا کر کہا:

"اے میرے پروردگار! میرا فرزند میرے اہل میں سے ہے اور تُو نے وعدہ فرمایا تھا کہ مجھے اور میرے اہل بیت میں سے جو ایمان لائے ہیں تو انہیں بچالے گا۔پس تیرا وعدہ سچا ہے اور تو بہترین حکم کرنے والا ہے۔"

خدائے تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ:

"اے نوحؑ! یہ لڑکا تمہارے اہلبیت میں سے نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی زندگی شقاوت میں گزاری ہے اور کفر پر اصرار کرتا رہا ہے۔جو شخص تم پر ایمان لایا ہو اور اس نے تمہاری نبوت کی تصدیق کرتے ہوئے تمہاری دعوت قبول کی ہو، اس کے سوا کسی کو اپنے اقارب میں شمار نہ کرو۔ ایسا شخص واقعی تمہارے اہلبیت میں سے ہے اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں ہر ایسے شخص کو بچاؤں گا اور اس کی

زندگی کی حفاظت کروں گا اور ہمارے لیے ایمان والوں کی مدد کرنا لازم ہے لیکن جس شخص نے تمہاری نبوت کا انکار کیا ہو اور تمہارے پروردگار کے ارشادات کو جھٹلایا ہو' وہ تمہارے خاندان سے باہر ہے اور تمہاری شفاعت کا اہل نہیں ہے' خواہ وہ تمہارا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ تمہارا یہ بیٹا لازماً موت کے سمندر میں غرق ہونیوالا ہے خواہ وہ پہاڑ پر چڑھ جائے اور اپنے اہل خانہ کے پاس پناہ لے لے۔ پس دیکھو کہ جس چیز کے بارے میں تم نہیں جانتے ہو' آئندہ اس کے بارے میں درخواست نہ کرنا۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں تاکہ تم جاہلوں میں سے نہ ہو جاؤ۔"

(سورۃ ہود۔ آیت ۴۶)

حضرت نوحؑ سمجھ گئے کہ بیٹے سے لگاؤ نے انہیں خطرے کے نزدیک کر دیا ہے اور مہر و محبت کے تقاضے نے حقیقت کو ان کی نگاہ سے اوجھل کر دیا ہے۔ حالانکہ مناسب یہ تھا کہ وہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی نجات اور کافروں کی ہلاکت پر خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کرنے میں مشغول ہو جاتے۔ اسی بنا پر انہوں نے خدا سے اپنی اس لغزش کی معافی مانگی' اس کے غضب سے اس کی پناہ طلب کی اور کہا:

"اے پروردگار! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں نے تجھ سے ایسی چیز کی درخواست کی جس کی حقیقت سے میں واقف نہ تھا اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور مجھ پر رحم نہ

کھائے تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔"

اس وقت پانی کی ایک لہر نوحؑ اور ان کے بیٹے کے درمیان حائل ہو گئی اور طوفانی لہروں کے درمیان اس کی موت واقع ہو گئی۔

جب پروردگار عالم کی آتش غضب کی انتہا ہو گئی۔ انتقام لے لیا گیا اور ظالموں کی زندگی کی بساط لپیٹ دی گئی تو آسمان سے پانی برسنا بند ہو گیا اور زمین پانی کو نیچے لے گئی۔ کشتی کوہِ جودی پر رک گئی اور ایک آواز آئی کہ ظالم لوگوں کو ہلاکت اور بدبختی نصیب ہو۔

حضرت نوحؑ کو حکم ملا کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سکون اور آرام کے ساتھ زمین پر اتر آئیں اور خدائے تعالیٰ کی عنایت اور برکت کے زیرِ سایہ اپنی زندگی دوبارہ شروع کریں۔

(سورۂ ہود۔ آیت ۴۸)

حضرت ہود علیہ السلام

خدائے تعالیٰ نے قبیلۂ عاد کے لوگوں کو بے شمار نعمتیں عطا کر رکھی تھیں اور وہ ایک طویل عرصے سے یمن اور عمان کے درمیان واقع احقاف کی سرزمین میں بڑے آرام اور اطمینان کی زندگی گزار رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کاریز کھودے، کھیتیاں اُگائیں، باغ لگائے اور عالیشان عمارتیں تعمیر کیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا نے ان کو صحت مند اور مضبوط جسم دے کر ان پر اپنے خاص احسان کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ تاہم انھوں نے خداوند عالم کو پہچاننے کے لیے کوئی غور و فکر نہ کیا۔ جو چیز ان کے ذہن میں آئی اور جسے انھوں نے اپنی عقل کی کوتاہی کی بنا پر پسند کیا وہ یہ تھی کہ انھوں نے بت بنائے اور انھیں اپنا خدا سمجھ بیٹھے۔ وہ بتوں کے سامنے جھکتے اور سجدے بجا لاتے تھے۔ اگر انھیں کوئی خوشی نصیب ہوتی تو بتوں کے پاس جا کر اظہار تشکر کرتے اور اگر کوئی تکلیف پہنچتی

تو بتوں سے پناہ مانگتے اور مدد کی التجا کرتے تھے۔

کچھ مدت گزر جانے کے بعد قبیلۂ عاد میں انتشار اور فتنہ و فساد کا دور دورہ ہو گیا۔ طاقتور لوگ کمزوروں کو حقیر سمجھنے لگے اور بڑے چھوٹوں پر زیادتیاں کرنے لگے۔ چنانچہ طاقتور لوگوں کی ہدایت، کمزوروں کے جائز حقوق کی بازیابی، دلوں سے نادانی اور جہالت کے غبار کی صفائی اور لوگوں کے دل کی آنکھوں پر سے غفلت کا پردہ ہٹانے کے لیے خدا نے یہ ارادہ فرمایا کہ اس قوم کے پاس انھی میں سے ایک پیغمبر کو بھیجے کہ جو انھیں کی زبان میں ان سے باتیں کرے۔ وہ ان کے پیدا کرنے والے کی جانب ان کی رہنمائی کرے اور انھیں سمجھائے کہ بتوں کی پرستش کرنا ایک بے فائدہ اور بُرا فعل ہے۔

حضرت ہودؑ ایک نیک شخص تھے جو اس قوم میں عالی نسب اور پسندیدہ اخلاق کے مالک اور سب سے بڑھ کر حلیم اور بردبار تھے۔ خدا نے انھی کو ان لوگوں کی رہنمائی کے لیے اپنا پیغمبر منتخب فرمایا کہ شاید وہ اس قوم کو گمراہی اور بے اصولی سے نجات دلا سکیں۔

حضرت ہودؑ نے پیغمبری کا خلعت زیب تن کیا، رسالت کا جامہ پہنا اور اپنی اس قوت کو بیدار کیا کہ جس سے سب نبیوں کے دل بھرے ہوتے ہیں۔ پھر وہ پہاڑوں کو ہلا دینے والے عزم اور جاہلوں کو پسپائی پر مجبور کر دینے والے حلم کے ساتھ اپنا کام سرانجام دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ اپنی قوم کے پاس آئے، انھیں بتوں کی پرستش پر لعنت ملامت کی اور فرمایا:

اے لوگو! یہ پتھر کیا چیز ہیں کہ جنھیں تم خود تراشتے ہو، پھر

خود ہی ان کی پرستش کرتے ہو اور ان سے پناہ طلب کرتے ہو؟ ان سے تمہیں کیا فائدہ اور کیا نقصان ہو سکتا ہے؟ جبکہ یہ تمہیں نہ کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ تمہاری بدبختی کا سدِّباب کر سکتے ہیں۔ ان کی پرستش تو بس عقل کی خرابی اور انسانیت کی توہین ہے۔ تمہارا خدا ایک ہی ہے کہ جو یگانہ و یکتا ہے اور وہی اس قابل ہے کہ تم اس کی پرستش کرو۔ وہ خدا اس لائق ہے کہ تم اس کی طرف توجہ کرو۔ اس نے تمہیں پیدا کیا اور وہ روزی دیتا ہے۔ اس نے تمہیں زندگی دی اور وہی تمہیں موت دیتا ہے۔ اس نے تمہیں زمین پر رہنے کی جگہ دی ہے اور اسی نے پودے اگائے ہیں۔ اس نے تمہیں صحت مند اور مضبوط جسم دیئے اور حیوانات کو تمہارے اختیار میں دیدیا ہے۔ پس تم اس پر ایمان لاؤ، سیدھے راستے سے نہ ہٹو اور خدا کے ساتھ دشمنی کا اظہار نہ کرو تاکہ کہیں تمہارا بھی وہی حشر نہ ہو جو نوحؑ کی قوم کا ہوا تھا۔ پھر ان کے اور تمہارے درمیان ابھی کچھ زیادہ مدت بھی نہیں گزری۔

جب حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کو یہ نصیحتیں کیں تو انھیں امید تھی کہ ان کی بے لاگ باتیں ان لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر جائیں گی اور وہ انھیں سوچنے پر مجبور کریں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ایمان لاکر ہدایت پائیں گے لیکن اپنی اس توقع کے خلاف انھیں لوگوں کے سخت چہروں اور گستاخ نگاہوں سے دوچار ہونا پڑا کیونکہ انہوں نے

وہ باتیں کہی تھیں جو ان لوگوں نے پہلے کبھی نہ سنی تھیں۔ ان لوگوں نے کہا:

اے ہودؑ! تم یہ کیسی نامعقول باتیں کر رہے ہو اور تم ہم سے کس بنا پر یہ توقع رکھتے ہو کہ ہم خدائے واحد کی پرستش کریں گے۔ ہم ان بتوں کی پرستش اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں خدا کے نزدیک کر دیں اور اس کے ہاں ہماری شفاعت کریں۔

حضرت ہودؑ نے فرمایا:

اے لوگو! بلاشبہ خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کی پرستش ہی بندگی کی حقیقت اور عبودیت کا کمال ہے۔ وہ تمہارے نزدیک اور بے حد نزدیک ہے، لیکن یہ بت کہ جن کی پرستش تم خدا کے تقرب اور اس کے ہاں شفاعت کے لیے کرتے ہو، یہ تمہیں خدا سے دُور کرتے ہیں اور یہ تمہاری جہالت اور نادانی کی نشانی ہیں۔

اس پر لوگوں نے حضرت ہودؑ کی طرف سے منہ پھیر لیے اور کہنے لگے:
تم ایک بیوقوف اور بداخلاق شخص کے علاوہ کچھ نہیں ہو۔ تم ہمیں بتوں کی پرستش کرنے پر ملامت کرتے ہو اور ہمارے باپ دادا کے پرانے طور طریقوں کو بُرا کہتے ہو۔ تم ایسی باتیں کرنے والے کون ہوتے ہو اور تمہیں ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے؟ جبکہ تم بھی ہماری طرح کھانا کھاتے، پانی پیتے اور ہماری طرح ہی زندگی گزارتے ہو۔ پھر خدا نے کس بنا پر

تمہیں پیغمبری عطا کی ہے اور لوگوں کی رہنمائی کے لیے چنا ہے۔ تمہارے متعلق ہمارا اس کے علاوہ کوئی گمان نہیں کہ تم جھوٹے لوگوں میں سے ہو۔

حضرت ہودؑ نے فرمایا: لوگو! مجھ میں بے وقوفی اور ضعیف العقلی کا کوئی شائبہ نہیں۔ میں سالہا سال سے تمہارے درمیان رہ رہا ہوں۔ تم نے میری کوئی بات خلاف قاعدہ نہیں دیکھی اور نہ ہی مجھ میں بیوقوفی اور بدخوئی پائی ہے۔ پھر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ خدائے تعالیٰ کسی قوم میں سے ایک شخص کو چن لے اور رسالت کا بوجھ اس کے کندھے پر ڈال دے۔ ہاں عجیب بات تو یہ ہے کہ خدا لوگوں کو کسی سرپرست کے بغیر ان کے حال پہ چھوڑ دے اور ان کے لیے کوئی پیغمبر نہ بھیجے کہ جو انھیں بے اصولی اور گمراہی سے باز رکھے۔ بہرحال میں تمہارے ایمان لانے سے ناامید اور نادانوں کی باتوں سے غمگین نہیں ہوں۔ اب تم عقل سے کام لو اور دل کی آنکھوں سے خلائق پہ غور کرو تاکہ تم ہر چیز میں خدا کی وحدانیت کی نشانیاں دیکھ سکو۔ تم تخلیق کے حیرت انگیز نظام، ستاروں کی منظم گردش اور اجرام فلکی کی روشنی میں اس کی یکتائی کی نشانیوں کا مشاہدہ کرو گے۔

خدائے واحد پہ ایمان لاؤ تاکہ آسمان کی طرف سے تم پہ رحمت کی بارش برسائی جائے جو تمہیں زیادہ دولتمند اور زیادہ طاقتور بنا دے لیکن تم سرکشی کر کے سچائی سے منہ نہ موڑو۔

یاد رکھو کہ موت کے بعد تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے اور تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ نیکوکاروں کو نیک جزا ملے گی اور بدکاروں کو ان کی بدی کی سزا ملے گی۔ پس اپنے حال پہ غور کرو اور آخرت کے لیے توشہ

جمع کرو۔ کیونکہ جو کام میرے سپرد کیا گیا تھا' میں نے اسے انجام دے دیا اور تمہیں عذاب الٰہی سے خبردار کر دیا ہے۔

حضرت ہودؑ کی قوم نے کہا: ہمیں یقین ہے کہ ہمارے خداؤں میں سے کوئی ایک تم پر غضبناک ہوا ہے جس سے تمہاری عقل میں خلل آگیا ہے اور تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تہ و بالا ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تم ایسی ایسی بے حقیقت باتیں جوڑ رہے ہو۔ بس تمہیں ہو کہ جو اپنی ان فضول اور احمقانہ باتوں پر اعتقاد رکھتے ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ تو بہ کیا ہوتی کہ جس کے نتیجے میں خدا مینہ برساتا ہے اور ہماری دولت اور قوت میں اضافہ کرتا ہے؟ پھر یہ قیامت کا دن کیا ہے کہ جس کے آنے کا تم گمان کرتے ہو اور کہتے ہو کہ مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ اے کاش کہ تمہارے ان وعدوں اور خیالات کی کوئی حقیقت بھی ہوتی! بات یہ ہے کہ ہماری یہ دنیاوی زندگی کہ جس میں ہم فطری قوانین کے مطابق جیتے اور مرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی دوسری زندگی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ کیونکہ فطرت اور دہر کے علاوہ کوئی چیز ہمیں ہلاک اور نابود نہیں کرتی۔

یہ عذاب کہ جس کے نزول سے تم ہمیں ڈرا رہے ہو' وہ کیا ہے اور کہاں ہے؟ ہم تمہاری ان باتوں پر ہرگز یقین نہیں کرتے' اس لیے ہم اپنے خداؤں کی پرستش سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ اگر تم سچے ہو تو جس عذاب کا ہم سے وعدہ کرتے ہو' اسے ہم پر نازل کر دو۔

جب حضرت ہودؑ کو اپنی قوم کی باتوں سے دشمنی اور سرکشی کی

ہو آئی تو انھوں نے کہا: میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے اور جو کام میرے سپرد کیا گیا تھا اسے انجام دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میں آئندہ بھی تمہاری رہنمائی کرنے کی کوشش جاری رکھوں گا اور مجھے تمہارے اکھٹے اور سخت گیری کا کوئی خوف نہیں۔ لیکن تم بھی اپنے کام میں آزاد ہو۔ اگر تم میرے خلاف منصوبہ تیار کرنا چاہتے ہو تو ایسا ہی کرو۔ میں تمہارے مقابلے میں اس خدا پہ توکل کرتا ہوں جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے اور تمام جاندار اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

حضرت ہودؑ پہلے کی طرح تبلیغ وہدایت کے کام میں مشغول تھے اور ان کی قوم بھی سرکشی اور سچائی سے روگردانی پہ تلی ہوئی تھی۔ اسی دوران میں ابر کا ایک سیاہ ٹکڑا اٹھا اور اس نے آسمان کو تاریک کر دیا۔ وہ لوگ یہ اندازہ لگانے کے لیے اس پہ نظریں جمائے ہوئے تھے کہ دیکھیں یہ کہاں جا کے برستا ہے۔ تب وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے: یہ ابر نفع دینے والا اور فائدہ پہنچانے والا مینہ برسائے گا۔ پھر وہ اپنے کھیتوں کو بارش کا پانی اٹھانے کے قابل بنانے میں لگ گئے۔

ہودؑ نے ان سے کہا: یہ ابر رحمت نہیں ہے بلکہ غضب اور عذاب ہے۔ یہ وہی عذاب ہے جس کو تم نے بہت جلدی لے لیا ہے۔ یہ ایک ایسی ہوا ہے جس میں دردناک عذاب پوشیدہ ہے۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ان لوگوں نے دیکھا کہ ہوا اپنی پوری قوت کے ساتھ ان کے سامان اور جانوروں کو اٹھا اٹھا کر دور پھینک رہی تھی۔ یہ دیکھ کر ان پہ شدید خوف وہراس چھا گیا اور جتنی جلدی

ہو سکا انھوں نے اپنے گھروں میں پناہ لی اور کواڑ بند کر لیے۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ اس طرح ان کے بچاؤ کی صورت نکل آئے گی۔ تاہم یہ عذاب بڑا سخت اور ہمہ گیر تھا۔ کیونکہ ہوا بیابانوں کی ریت اٹھا اٹھا کر ان کے گھروں پر پھینک رہی تھی اور یہ طوفان سات راتیں اور سات دن لگاتار جاری رہا۔ جب سات دن گزر گئے تو ہودؑ کی قوم کے افراد زمین پر اس طرح مرے پڑے تھے جس طرح کھجور کے اکھڑے ہوئے درخت کی جڑیں بکھری پڑی ہوں۔ وہ ظالم لوگ ہلاک ہو گئے۔ "ان کے آثار مٹ گئے اور فقط ان کا نام ہی صفحۂ ہستی پر باقی رہ گیا (اور تیرا پروردگار کبھی بھی ایک نیکوکار قوم کو ظلم کے ساتھ ہلاک نہیں کرتا)۔

ادھر حضرت ہودؑ نے اپنے اصحاب اور قوم کے مومنین کو ایک جگہ جمع کر لیا، جہاں انھوں نے وہ وقت کمال آرام سے گزارا جبکہ آندھی کی آواز فضا میں گونج رہی تھی اور وہ دوسرے لوگوں پر بیابان کی ریت ڈال رہی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ آندھی تھم گئی اور موسم اپنے حال پر آ گیا۔ تب حضرت ہودؑ حضرموت چلے گئے اور اپنی بقیہ عمر وہیں گزاری۔

حضرت صالح علیہ السلام

قوم عاد کو اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ بھگتنا پڑا اور وہ ہلاک ہو گئی۔ تب خدائے تعالیٰ نے ان لوگوں کی سرزمین قوم ثمود کے حوالے کر دی۔ اس کو آباد کرنے کے لیے قوم ثمود نے قوم عاد سے بھی زیادہ محنت کی۔ انھوں نے کاریز کھودے اور باغ باغیچے لگائے۔ عظیم الشان عمارتیں تعمیر کیں اور ناگہانی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے پہاڑوں کو تراش کر گھر بنائے۔ قوم ثمود کی زندگی بڑے سکھ چین سے گزر رہی تھی اور انہیں بے اندازہ دولت اور ہر طرح کی نعمتیں میسر تھیں لیکن ان تمام نعمتوں کے باوجود جو خدا نے انھیں عنایت فرمائی تھیں، وہ لوگ اس کی نعمتوں اور مہربانیوں کا شکر بجا نہیں لاتے تھے۔ اس کے برعکس وہ روز بروز سرکش ہوتے جا رہے تھے اور حق و صداقت سے روگردانی، "تکبر"، غرور اور فتنہ و فساد کے راستے پہ چل کھڑے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ خدا سے لاتعلق ہو کر بتوں کو پوجنے لگے اور

اور انہیں خدا کا شریک قرار دیتے تھے۔ نیز یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ ہمیشہ ناز و نعمت میں زندگی بسر کریں گے اور جو آسائش انھیں میسر ہے وہ دائمی اور جاودانی ہو گی۔

خدائے تعالیٰ نے حضرت صالحؑ کو ان لوگوں کے پاس اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا۔ آپ بڑے حلیم الطبع، بردبار، روشن ضمیر اور ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ چنانچہ آپ نے ان لوگوں کو خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دی اور سمجھایا کہ وہی ہے جس نے انھیں پیدا کیا، ان کے ہاتھوں اس سرزمین کو آباد کرایا، انھیں قوم عاد کی جگہ منتخب کیا اور انھیں یہ ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ پھر آپ نے انھیں بتوں کی پرستش کرنے سے منع فرمایا اور بتایا کہ یہ بت کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ خدا کی قدرت کے سامنے ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ حضرت صالحؑ نے اس غرض سے کہ ان لوگوں کو کسی طرح کی غلط فہمی نہ ہو ان سے اپنی رشتہ داری کا ذکر کیا اور کہا:

> تم سب میرے عزیز و اقارب ہو، میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور تمہارے لیے میں کوئی غلط ارادہ نہیں رکھتا۔ بس تم آگے آؤ، خدا سے معافی مانگو اور گناہوں سے توبہ کرو۔ کیونکہ جو لوگ خدا کو پکاریں وہ ان کے نزدیک ہوتا ہے، ان کی دعائیں قبول کرتا ہے اور ان کی آہ و زاری کو سنتا ہے۔

مگر اس قوم نے صالحؑ کی نصیحت آمیز باتوں کے مقابلے میں اپنی آنکھوں، کانوں اور دل کو جہالت کی نادانی کے پردے میں لپیٹ لیا اور ان کی پیغمبری سے انکار کر دیا۔ انھوں نے ان کی دعوت کا مذاق اڑایا اور ان سے

سچائی اور حقیقت سے بعید سمجھا۔ پھر انہوں نے ان صائب الرائے اور عقلمند بزرگوار کو سرزنش اور ملامت کی اور کہا:

اے صالحؑ! ہم تمہیں ایک دوراندیش اور حقیقت شناس انسان سمجھتے تھے اور تم میں اچھائی اور بھلائی کے آثار نظر آتے تھے۔ اس لیے ہم تمہیں حوادثِ زمانہ کے لیے اپنا سہارا سمجھتے تھے اور ہمارا خیال تھا کہ تم اپنی عقل کے نور سے تاریکیوں کو روشن کردو گے اور اپنی صائب رائے کے ذریعے ہماری مشکلات کی گرہ کھول دو گے۔ ہمیں امید تھی کہ سختی اور مصیبت کے وقت تم ہمارے لیے جائے پناہ بنے رہو گے لیکن تم نے ناپسندیدہ طور طریقے اپنا لیے ہیں اور بے عقلی کی باتیں کرنے لگے ہو۔ یہ کونسا طریقہ ہے کہ جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم ان بتوں کو پوجنا چھوڑ دیں، جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد ایک طویل مدت سے کرتے چلے آئے ہیں۔ پھر ہم نے اسی عقیدے کے تحت پرورش پائی ہے اور ہمیں اسی طرزِ عمل کی تربیت دی گئی ہے۔ ہمیں تمہاری دعوت کے بارے میں شک ہے اور تمہاری باتوں پر ہمیں کوئی بھروسہ اور یقین نہیں ہے۔ اس لیے ہم اپنے بزرگوں کا مسلک ہرگز ترک نہیں کریں گے اور تمہارا بنایا ہوا راستہ نہیں اپنائیں گے۔

حضرت صالحؑ نے انہیں اس مخالفت کرنے سے خبردار کیا۔ ان کے سامنے اپنی نبوت کا کھل کر اعلان کیا اور انہیں خدا کی عطا کردہ بیشمار نعمتیں یاد دلائیں اور اس کے عذاب سے ڈرایا۔ انہوں نے لوگوں پہ یہ بھی واضح کر دیا کہ مجھے اس دعوت سے کوئی فائدہ مطلوب نہیں ہے۔ نہ ہی تمہارا حاکم بننا چاہتا ہوں اور نہ ہی تم سے اس رہبری اور رہنمائی کا

کوئی اجر مانگتا ہوں کیونکہ میرا اجر تو خداوند عالم کے ہاں ہے حضرت صالحؑ نے یہ باتیں اس لیے کہیں کہ شاید ان کے دلوں میں کوئی شبہ پیدا نہ ہو جائے اور وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

حضرت صالحؑ کی ان تمام تبلیغات کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ کمزور لوگ ان پر ایمان لے آئے۔ قوم کے سرکش افراد کی دشمنی اور مخالفت میں اضافہ ہو گیا۔ انھوں نے بتوں کی پرستش پر اصرار کیا اور کہنے لگے: اس میں شک نہیں کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے اور تمہاری عقل میں خلل آ گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ تم پر کسی نے قابو پا لیا ہے اور ایک شیطان کو تم پر مسلّط کر دیا ہے یا تم پر جادو ڈال دیا ہے۔ بس یہی وجہ ہے کہ تم ایسی بے سر و پا باتیں کرنے لگے ہو۔ آخر تم بھی تو ہماری ہی طرح کے ایک انسان ہو اور حسب و نسب اور مال و جاہ کے لحاظ سے ہم سے برتر نہیں ہو۔ پھر ہمارے درمیان ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو اس پیغمبری کے لیے تم سے زیادہ اہلیت رکھتے ہیں۔ تمہیں تو فقط بڑائی کے شوق اور حکومت کی خواہش نے اس بات پر اکسایا ہے کہ تم رسالت اور پیغمبری کا دعوےٰ کر رہے ہو۔

وہ لوگ چاہتے تھے کہ ایسی ایسی باتیں کر کے صالحؑ کو ان کے دین سے منحرف کر دیں اور ایک خدا کی طرف بلانے سے باز رکھیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ حضرت صالحؑ کی پیروی کریں گے تو سچائی اور حقیقت کے راستے سے بھٹک جائیں گے۔

حضرت صالحؑ نے ان لوگوں کے بہتانوں اور بیکار باتوں کو رَدّ کرتے ہوئے فرمایا:

اے لوگو! جب میں اپنے پروردگار کی جانب سے واضح

ثبوت رکھتا ہوں اور اس کی رحمت سے بہرہ مند ہوں، تو
اگر میں تمہاری پیروی کروں، تمہارے راستے پر چلوں
اور اپنے رب کی نافرمانی کروں تو اس صورت میں کون
ہوگا جو مجھے اس کے عذاب سے بچالے؟ بلاشبہ تم
جھوٹے لوگ ہو۔

حضرت صالحؑ کے اس پختہ عزم اور غیر متزلزل ارادے کو دیکھ کر قوم کے سرکش لوگ گھبرا گئے۔ انھیں خوف ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رفتہ رفتہ حضرت صالحؑ کے ساتھی اور پیروکار بڑھتے چلے جائیں۔ علاوہ ازیں ان کے لیے اس بات کو برداشت کرنا بھی مشکل تھا کہ حضرت صالحؑ قوم کے رہنما بن جائیں۔ لوگ مصیبت کے وقت ان کے پاس پناہ لیں اور مشکل حالات میں ان کی صائب رائے سے استفادہ کریں اور تمام اہم مسائل لیکر ان کے گھر پہنچیں، تو اس صورت میں لازم تھا کہ وہ انھیں ایسے راستے پر چلاتے جو انھیں خدا کے نزدیک کر دیتا اور ان کاموں سے روکتے جو ان کی خدا سے دوری کا باعث بنتے۔ اس کے علاوہ قوم کے سرداروں کو یہ خوف بھی ہوا کہ مبادا ان کی دولت چھن جائے اور قوم کی قیادت ان کے ہاتھ سے جاتی رہے۔

چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ کوئی ایسا اڑنگا دیا جائے کہ جس کے نتیجے میں عام لوگوں پر حضرت صالحؑ کی کمزوری اور ناتوانی ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت وہ حضرت صالحؑ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ وہ ایک ایسا معجزہ دکھائیں جو ان کی دعوت اور رسالت کی سچائی کی دلیل ہو۔ حضرت صالحؑ نے ان کے سامنے ایک اونٹنی پیش کی اور

فرمایا کہ یہی اونٹنی میرا معجزہ ہے۔ اس سرزمین کا سارا پانی ایک دن یہ پیا کرے گی اور دوسرے دن وہ تم لوگوں کے حصے میں آئے گا۔ پس تم اسے آزاد چھوڑ دو تاکہ یہ خدا کی زمین پر چرتی پھرے۔

ان لوگوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی ایسا اونٹ نہ دیکھا تھا جو ہر دوسرے دن اس سرزمین کا سارا پانی خود پی لے اور لوگوں کو اس سے محروم رکھے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ حضرت صالح ؑ کو بخوبی علم تھا کہ یہ لوگ اپنے کفر پر سختی سے قائم ہیں اور یہ بھی جانتے تھے کہ ایک منکر شخص مدمقابل کی جانب سے ثبوت کے ظاہر ہونے پر ناخوش ہو جاتا ہے اور خوف محسوس کرنے لگتا ہے۔ مزید یہ کہ گواہ اور دلیل کا پیش کرنا اس کی پوشیدہ دشمنی کو اور بھی ابھارتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت صالح ؑ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ اونٹنی کو مار ڈالنے کے درپے نہ ہو جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ان لوگوں کو کوئی ایسی حرکت کرنے سے خبردار کیا اور کہا:

> دیکھو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اونٹنی کو تکلیف دو اور اس کے ساتھ کوئی زیادتی کر بیٹھو لیکن اگر تم ایسا کرو گے تو بہت جلد شدید عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

حضرت صالح ؑ کی اونٹنی ایک مدت تک اس سرزمین میں چرتی رہی۔ وہ ایک دن تو پانی پیتی لیکن دوسرے دن پانی کو منہ نہ لگاتی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا معجزہ تھا جس نے بہت سے لوگوں کو حضرت صالح ؑ کی جانب مائل کر دیا اور وہ اسے دیکھ کر ان کی رسالت کے معترف ہو گئے اور ان پر ایمان لے آئے۔ اس بات نے قوم کے سرکش لوگوں کو اور بھی پریشان کر دیا اور انھیں ڈر ہوا کہ بس اب ان کی دولت اور قیادت

کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ پس جن کے دل ایمان کے نور سے منور ہو چکے تھے وہ بڑے لوگ ان سے کہنے لگے:

کیا تمہیں یقین ہے کہ حضرت صالحؑ اپنے پروردگار کی طرف سے پیغمبری پر مبعوث ہوتے ہیں؟

ان لوگوں نے جواب دیا: ہاں! ہم ان کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اس سے ان کی ضد اور سرکشی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی، بلکہ انھوں نے اپنے کفر کا اور بھی کھل کر اظہار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ تم لوگ جس چیز پر ایمان لائے ہو، ہم اس سے انکاری ہیں۔

قرآن سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالحؑ کی اونٹنی کا قد و قامت بہت بڑا تھا اور اس کی ایک خاص شکل تھی۔ اس لیے قوم ثمود کے چوپائے جانور اسے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ اونٹ بھی اس سے ڈرتے تھے۔ شاید یہی بات تھی کہ اس قوم کے لوگ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اونٹنی وہاں رہے۔ شاید ان کے اس کو ناپسند کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب ان کو پانی کی شدید ضرورت ہوتی تھی تو وہ اونٹنی انھیں اس سے محروم کر دیتی تھی کیونکہ معاہدے کے مطابق ایک دن پانی اونٹنی کے لیے مخصوص تھا اور دوسرے دن ان لوگوں کو ملتا تھا۔

ممکن ہے کہ ان لوگوں کی بد طینتی بھی انھیں حضرت صالحؑ کے معجزے پر پردہ ڈالنے اور ان کے پیش کردہ ثبوت کا اثر زائل کرنے پر اکساتی تھی، کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ یہی اونٹنی عام لوگوں کو حضرت صالحؑ کی طرف مائل کر رہی ہے اور ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ ان کے پیروؤں کی تعداد بڑھ جائے، ان کے ساتھی طاقتور ہو جائیں اور وہ اقتدار پر قبضہ کر لیں۔

بہرحال ان میں سے کسی ایک یا دونوں وجوہ کی بنا پر وہ لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ حضرت صالحؑ نے انہیں اونٹنی کے مار ڈالنے پر عذابِ الٰہی سے ڈرایا ہے، اس کی کونچیں کاٹنے اور اسے مار ڈالنے کا تہیہ کر لیا۔

حضرت صالحؑ کی قوم کے لوگ اس اونٹنی کو اپنے لیے ایک عظیم خطرہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس کے بارے میں بے حد غور و خوض کیا۔ پھر وہ اسے مار ڈالنے سے ڈرتے بھی تھے کیونکہ ایسا کرنے میں انھیں اپنی ہلاکت کا خوف تھا۔ اس لیے جب کبھی وہ اونٹنی کو ہلاک کرنے کی غرض سے قدم آگے بڑھاتے، خوف کے مارے واپس لوٹ آتے تھے۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے اور عذاب کے خوف نے انھیں اونٹنی کے بارے میں کوئی اقدام کرنے سے باز رکھا اور ان کو اسے کوئی تکلیف پہنچانے کی ہرگز جرأت نہ ہوئی۔ آخر کار انھوں نے عورتوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے حسن و جمال سے جوانوں کے دلوں کو لبھائیں اور انھیں جوش دلائیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک حسین و جمیل عورت کوئی فرمائش کرے تو ہوس پرست مرد اس کی تعمیل کرتے ہیں اور اگر وہ کوئی خواہش ظاہر کرے تو وہ اسے پورا کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسی طرح اس معاملے میں بھی حسن و جمال نے اپنا کرشمہ دکھایا اور ایک دوشیزہ، صدوق بنت محیا نے مصدع بن مہرج نامی جوان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ حضرت صالحؑ کی اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالے تو وہ اس کو اپنے وصل سے بہرہ ور کر دے گی۔

علاوہ ازیں عنیزہ نامی ایک بدطینت اور کافرہ بڑھیا نے قدار بن سالف

کو اپنے پاس بلایا اور اپنی لڑکیوں میں سے ایک خوبرو لڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: یہ لڑکی تمہارے لیے بلا معاوضہ حاضر ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تم حضرت صالح کی اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالو۔ کیونکہ اس اونٹنی نے عام لوگوں کے دلوں کو ایمان کی جانب مائل کر کے ہماری قوم کو پریشان کر دیا ہے۔ پھر یہ کہ ایک دن پورے کا پورا پانی بھی پی جاتی ہے اور جانوروں کو خوفزدہ کر کے بھگا دیتی ہے۔

یہ ہوس انگیز باتیں ان دو بے عقل مردوں کے دلوں میں گھر کر گئیں، جس سے ان کی ہمت اور قوت میں اضافہ ہو گیا اور ان میں ایک نئی جرأت اور جسارت پیدا ہو گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اپنی قوم میں سے کچھ اور آدمیوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے جو اس کام میں ان کا ساتھ دے سکیں۔ چنانچہ سات دوسرے آدمیوں نے ان کا ساتھ دینے کی حامی بھر لی اور وہ سب مل کر اونٹنی کی گھات میں بیٹھ گئے۔ جب وہ پانی پی کر واپس آ رہی تھی تو مصدع نے اپنی کمینگاہ سے اس پر ایک تیر پھینکا، جس سے اس کی پنڈلی پر زخم آ گیا۔ دوسری جانب سے قدار بن سالف نے تلوار کا وار کر کے اس کا پاؤں کاٹ دیا اور وہ زمین پر گر گئی۔ اس نے ایک اور وار اس کے گلے پر کیا اور اس طرح انھوں نے اونٹنی کا خاتمہ کر دیا۔ پھر وہ قوم کو اپنی کامیابی کا مژدہ سنانے کے لیے خوش خوش واپس آ گئے۔

لوگوں نے ایک ہر دلعزیز رہنما اور فاتح بادشاہ کی طرح ان کا استقبال کیا اور ان کے اس کارنامے کی دل کھول کر داد دی۔ یوں ان لوگوں نے اونٹنی کو مار ڈالا، پروردگار کے حکم سے سرتابی کی اور حضرت صالح

کی دی ہوئی وعید کی کوئی پرواہ نہ کی۔ وہ کہنے لگے:

اے صالح! اگر تم پیغمبر ہو تو جس عذاب کا تم نے وعدہ کیا ہے اسے ہم پر نازل کردو۔

حضرت صالحؑ نے فرمایا:

میں نے تمہیں خبردار کیا تھا کہ اونٹنی کو تکلیف مت پہنچانا لیکن تم نے اپنے آپ کو گناہ سے آلودہ کر ہی لیا۔ اب تم کو تین دن تک اپنے گھروں میں رہنا ہے۔ اس کے بعد تمہیں تمہارے کیے کی سزا ملے گی اور تم عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ ہاں یہ ایک ایسا وعدہ ہے جس میں جھوٹ کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

حضرت صالحؑ نے تین دن کی مدت کا تعین شاید اس لیے کیا تھا کہ ممکن ہے وہ توبہ کر لیں۔ خدا کی طرف لوٹ آنے پر مائل ہو جائیں اور ان کی دعوت قبول کر لیں۔ لیکن ان کے دلوں پر شک و شبہ کا اتنا تسلّط ہو چکا تھا کہ حضرت صالحؑ کی وعیدوں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں نے سیدھے راستے کی جانب اپنے قدم نہ بڑھائے۔ اس کے برعکس انہوں نے حضرت صالحؑ کی باتوں کو بے حقیقت سمجھا اور انتہائی حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ جلدی سے جلدی ان پر عذاب نازل کر دیں۔

حضرت صالحؑ نے کہا: اے لوگو! اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے میں کیوں جلدی کر رہے ہو۔ ارے تم خدائے تعالیٰ سے معافی کیوں نہیں مانگتے کہ شاید اس کی رحمت تمہارے شامل حال ہو جائے۔

تاہم وہ لوگ اتنے گمراہ ہو چکے تھے اور سرکشی ان کی فطرت میں اتنی رچ بس گئی تھی کہ وہ جواباً حضرت صالحؑ سے کہنے لگے:

اے صالح! ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی قوم کے لیے منحوس سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد قوم کے کچھ لوگ جمع ہوئے اور انہوں نے قسم کھائی کہ آج رات جبکہ سب لوگ سو رہے ہوں گے وہ لوگوں کی نظر سے بچا کر حضرت صالح اور ان کے ساتھیوں پر حملہ کر دیں گے اور انھیں مار ڈالیں گے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ اس منصوبے کو خفیہ رکھیں اور کسی کو کانوں کان اسکی خبر نہ ہونے دیں۔

ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ اگر وہ حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھیوں کو مار ڈالیں گے تو آنے والا عذاب ان پر سے ٹل جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے دلوں میں ان کے خلاف کینہ رکھ لیا اور انہیں قتل کرنے پر تل گئے۔ تاہم خدائے تعالیٰ نے انھیں ایسا کرنے کی مہلت نہ دی، ان کا منصوبہ خاک میں ملا دیا اور ان کا مکر خود انہیں کی جانب لوٹا دیا۔ چنانچہ خدا نے حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھیوں کو قوم کی سازش اور اپنے عذاب سے محفوظ رکھا۔ اس نے اپنے پیغمبر کی مدد کی خاطر اور کافروں کے ساتھ اپنے وعدے کے مطابق ان پر عذاب بھیجا اور انہیں ہلاک کر دیا۔ تب آسمان سے ایسی بجلی گری کہ جس نے ظالموں کو ان کے کیے کی سزا دی اور وہ اپنے گھروں میں مردہ پڑے رہ گئے۔ ان کے عالیشان محل، بے اندازہ دولت، وسیع باغ اور پہاڑوں میں تراشے ہوئے قلعے عذاب الٰہی کا راستہ نہ روک سکے اور انہیں ہلاکت سے بچا نہ سکے۔

جب حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کے لوگوں کے جھلسے ہوئے مردہ

جسم اور خالی گھر دیکھے تو گو انھیں بے حد ملال ہوا لیکن انھوں نے انکی طرف سے منہ موڑ لیا اور ان کے بے جان جسموں کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اے لوگو! میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچا دیا تھا اور تمھیں نصیحت کی تھی، لیکن تم نصیحت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام

نمرود بن کنعان، شہر بابل پر حکومت کرتا تھا۔ جب اس کے اقتدار کا دائرہ وسیع ہو گیا تو اس نے لوگوں کو دعوت دی کہ وہ اس کی پرستش کریں۔ چونکہ لوگ بھی پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے بتوں کو سجدہ کیا کرتے تھے۔ اس لیے وہ آسانی سے اس کی غلامی قبول کرنے پر تیار ہو گئے اور اسے اپنا خدا تسلیم کر لیا۔

لوگوں کو اس گمراہی اور ضلالت میں زندگی بسر کرتے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا اور وہ خدائے تعالیٰ کو قطعاً بھلا چکے تھے۔ حتیٰ کہ پروردگار عالم نے اس قوم میں سے ایک عظیم رہنما پیدا کرنے اور اس کی نصیحت کے ذریعے لوگوں کی رہنمائی کرنے کا ارادہ فرمایا۔

ایک نجومی نمرود کے دربار میں بڑا اونچا مقام رکھتا تھا۔ ایک دن اس نے نمرود سے عرض کیا کہ ستارے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جلد ہی ایک شخص اٹھے گا، وہ بت پرستی کی بساط اُلٹ دے گا اور لوگوں کو ایک نئے دین کی جانب بلائے گا۔

نمرود نے پوچھا: وہ کونسی سرزمین سے اُٹھے گا؟

نجومی نے جواب دیا: وہ اسی سرزمین سے اُٹھے گا، لیکن ابھی نطفہ اس کی ماں کے رحم میں منتقل نہیں ہوا۔

نمرود نے اس صورتِ حال کا سدِّباب کرنے کے لیے ایک تاکیدی فرمان جاری کیا کہ عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے، تاکہ کوئی ایسا بچّہ وجود میں ہی نہ آسکے۔ نادان نمرود یہ سمجھتا تھا کہ ان حیلوں سے وہ خدائے تعالیٰ کے ارادے کے آگے بند باندھ سکے گا اور قضائے الٰہی کو ٹال دے گا۔

انھیں افراتفری کے دنوں میں حضرت ابراہیمؑ بصورتِ نطفہ رحم مادر میں منتقل ہوئے اور وہ حاملہ ہوگئیں، لیکن حمل کے آثار ظاہر نہ ہوئے۔ حمل کی مدت ختم ہونے کو آئی تو وہ نمرود کے کارندوں کے خوف کے مارے شہر سے باہر چلی گئیں اور وہاں پہاڑ کے ایک غار میں پناہ لے لی۔

ابراہیمؑ اسی غار میں پیدا ہوئے، ان کی والدہ نے انھیں وہیں چھوڑا اور غار کے دہانے کو پتھروں سے بند کر کے شہر کو لوٹ آئیں۔ خدائے تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی انگلیوں سے دودھ کے سوتے جاری کردیے اور یوں انھیں غذا بہم پہنچتی رہی حتیٰ کہ

آہستہ آہستہ وہ بڑے ہو گئے۔ جب ان کی عمر تیرہ سال ہو گئی تو وہ چھپ چھپا کر اپنی ماں کے ساتھ شہر آ گئے۔

حضرت ابراہیمؑ کا چچا آزر بابل کا ایک مشہور بت تراش تھا اور اس کے بیٹے بت فروشی کیا کرتے تھے۔ جب آزر نے ابراہیمؑ کو دیکھا تو انہیں بھی اپنے بچوں کے ساتھ بت بیچنے کے لیے بھیج دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے بتوں کے گلے میں رسّی باندھی اور انہیں زمین پر گھسیٹتے ہوئے لے چلے، جس سے وہ مٹی، کیچڑ اور کوڑے کرکٹ سے آلودہ ہو گئے۔ پھر آواز لگائی:

"اے لوگو! آؤ اور مجھ سے وہ بت خریدو جو بے جان ہیں، عقل و ہوش سے عاری ہیں اور کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"

بتوں کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کا یہ سلوک بت پرستوں کی نظر میں بے حد توہین آمیز تھا۔ پھر نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ آزر نے حضرت ابراہیمؑ کو اس بارے میں نصیحت کی۔ جب ان پر اس کا بھی اثر نہ ہوا تو انہیں قید میں ڈال دیا گیا۔

حضرت ابراہیمؑ اور قیامت کی ایک نشانی

جب ابراہیمؑ نے درخواست کی کہ اے میرے پروردگار! مجھے بھی دکھا دے کہ تو مردہ کیونکر زندہ کرتا ہے۔ خدا نے فرمایا کہ کیا تجھے اس کا یقین نہیں۔ ابراہیمؑ نے کہا یقین تو ہے۔ مگر میں اطمینان قلب چاہتا ہوں۔ فرمایا تو پھر چار پرندے لو انکے ٹکڑے کر ڈالو اور ہر پہاڑ پہ

ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو۔ اس کے بعد ان کو بلاؤ، دیکھنا کہ وہ دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آتے ہیں اور خدا بے شک غالب اور حکمت والا ہے۔

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۶۰)

خدا نے ابراہیمؑ کو گمراہ اور بت پرست لوگوں کی رہنمائی کے لیے پیدا کیا ۔۔۔ انھیں نبوت کے بلند مرتبے پر فائز فرمایا ۔۔۔ حضرت ابراہیمؑ کا دل خدا پر ایمان سے معمور تھا ۔۔۔ اور اس میں پروردگار کی قدرت کے بارے میں رتی بھر شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ تاہم اس غرض سے کہ چیزوں کے حقائق ان پر واضح ہو جائیں اور ان کی بصیرت میں اضافہ ہو جائے، انھوں نے خدا سے درخواست کی کہ وہ انھیں یہ نظارہ دکھائے کہ وہ مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔

خداوند عالم نے خطاب فرمایا: کیا تم موت کے بعد جی اُٹھنے پر ایمان نہیں لائے؟

حضرت ابراہیمؑ نے کہا: ایمان تو لایا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ مجھے مکمل اطمینان اور یقین حاصل ہو جائے۔

چونکہ حضرت ابراہیمؑ کا مقصد اطمینان قلب حاصل کرنا تھا، اس لیے خدا نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ چار پرندے پکڑو، انھیں ذبح کرنے کے بعد ان کا قیمہ کرو اور اسے ملا دو۔ پھر اسے چند حصوں میں تقسیم کرو اور ہر حصہ ایک پہاڑی پر رکھ دو۔ تب ان پرندوں کو بلاؤ۔ تاکہ وہ خدا کے اذن سے زندہ ہو کر تمہارے پاس آجائیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے حکم پر عمل کیا اور پرندوں کو ذبح کرنے، ان کے گوشت کا قیمہ باہم ملا دینے اور پھر تقسیم کرنے کے بعد انھیں آواز

دی۔ ہر جگہ سے ٹکڑے اڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے' ان میں جان پڑ گئی اور وہ پرندے دوبارہ زندہ ہو گئے۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے مُردوں کو زندہ کرنے کی شکل میں قدرت کا یہ عظیم مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو ان کے قلب کو جو پہلے ہی ایمان کی دولت سے مالا مال تھا' مزید اطمینان حاصل ہوا۔

حضرت ابراہیمؑ بُت خانے میں

خدا کی قسم! تمہارے پیٹھ پھیرنے کے بعد میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک چال چلوں گا۔ چنانچہ آپ نے ان کے بتوں کو چکنا چور کر ڈالا۔ مگر بڑے بُت کو رہنے دیا۔ تاکہ واپس آنے پر وہ اسکی طرف رجوع کریں۔ (سورۃ ابراہیمؑ آیت ۸۵)

حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے حکم سے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے چچا آزر کو پروردگار کی طرف بلایا اور اسے خدائے واحد کی پرستش کی کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ایک خدا کے وجود کے دلائل اس کے سامنے پیش کیے لیکن اس نے آپ کو سختی اور غصے کا جواب دیا اور اپنے ہاں سے نکال باہر کیا۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ کو ابتدائے کار میں ہی اس چوٹ سے دوچار ہونا پڑا اور وہ افسردہ دل ہو کر آزر کے گھر سے نکل گئے لیکن آزر کے اس بُرے سلوک سے ان کے اندر کوئی سستی پیدا نہیں ہوئی بلکہ قوم کی رہنمائی کے لیے ان کے ارادے کو مزید پختگی حاصل ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ لوگوں کے پاس انھیں یہ سمجھانے کے لیے آتے کہ بت پرستی گمراہی کا راستا

ہے۔ آپ نے سب سے پہلے ان سے پوچھا: لوگو! تم کس کی پرستش کرتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: یہ بت ہمارے معبود ہیں، ہم انہیں کی پرستش کرتے ہیں اور ہم اپنی تمام حاجتوں کے لیے انھیں سے مدد مانگتے ہیں۔ نیز اگر کبھی ہمیں ناگوار حوادث پیش آجائیں تو ہم انہیں کے پاس پناہ لیتے ہیں۔

ابراہیمؑ نے پوچھا: کیا یہ بت تمہاری باتیں سنتے ہیں اور کیا وہ تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟

انھوں نے جواب دیا: نہیں! لیکن بات یہ ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد ان بتوں کو پوجتے چلے آئے ہیں، اس لیے ہم بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے انہی بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے کہا: تمہارے آباؤ اجداد اور تم بھی کھلی گمراہی میں مبتلا رہے ہو۔ کیونکہ یہ پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے بت کہ جو خود اپنے آپ کو بھی کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے، ہرگز پرستش کے قابل نہیں ہیں۔ پرستش تو خدائے واحد کے لیے مخصوص ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور ان کا انتظام چلانے والا ہے۔

پھر ابراہیمؑ نے پروردگار عالم کی قدرت کو اپنا موضوع بنایا اور فرمایا: خدائے تعالیٰ وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی مجھے ہدایت دیتا ہے۔ وہی ہے جو مجھے کھانے پینے کو دیتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے۔ وہی ہے جو مجھے موت دے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ وہی ہے جس سے میں یہ امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن وہ مجھے بخش دے گا۔

یہ باتیں کہہ کر حضرت ابراہیمؑ نے لوگوں کو خدائے تعالیٰ کی پرستش کرنے کی دعوت دی، لیکن انھوں نے آپ کے ان دلائل کے جواب چند بیہودہ الفاظ میں دیے اور بت پرستی کو ترک کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ اس پر ابراہیمؑ نے فیصلہ کیا کہ وہ شرک اور گمراہی کو روکنے کے لیے ان بتوں کو توڑ دیں اور یوں ان نادان لوگوں کو باور کرائیں کہ یہ بے جان اور بے طاقت بت پرستش کے قابل نہیں ہیں۔

نمرود کو ماننے والے لوگ ہر سال ایک عید منایا کرتے تھے اور اس دن وہ کچھ خصوصی مراسم انجام دیتے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ وہ سارا دن شہر سے باہر گزارتے تھے۔ پھر جب عید کا دن آیا اور وہ لوگ شہر سے باہر جانے لگے تو حضرت ابراہیمؑ تھکاوٹ کی بنا پر ان کے ساتھ نہ گئے اور شہر میں ہی رہ گئے۔

اس طرح سب بوڑھے اور جوان شہر سے باہر چلے گئے اور شہر خالی ہو گیا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا کہ شہر خالی ہے اور بت کدے کا کوئی محافظ بھی موجود نہیں تو وہ بت کدے میں داخل ہو گئے۔ پھر وہ اس عالیشان دالان میں بتوں کو دیکھنے لگے جس کو بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا۔ اس میں مختلف بت اپنے اپنے رتبے کے مطابق رکھے گئے تھے۔

تب آپ نے بتوں کا مذاق اڑانے کے لیے وہ کھانا ان کے آگے رکھا جو آپ ساتھ لے گئے تھے۔ آپ نے ان سے کہا: کیا تم کھانا کھاؤ گے؟ جب بتوں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو ازراہ تمسخر پھر کہا: تم بولتے کیوں نہیں؟ لیکن اب بھی کوئی جواب نہ ملا۔

اس پر حضرت ابراہیمؑ نے ایک کلہاڑا اٹھا لیا اور بتوں کی توڑ پھوڑ شروع کردی۔ ابھی کچھ زیادہ وقت نہ گزرا ہوگا کہ وہ خوبصورت اور سجے سجائے بت ٹوٹ پھوٹ کر پتھر اور لکڑی کے ٹکڑوں میں تبدیل ہو گئے۔ بس ایک بڑا بت ہی تھا جو حضرت ابراہیمؑ کے کلہاڑے کی مار سے بچا رہا۔ لیکن اس کو تو حضرت ابراہیمؑ نے خود ہی چھوڑ دیا تھا۔ تاکہ وہ آئندہ کے لیے استدلال کی بنیاد بنے اور خود ان کی اپنی بریت اور نجات کا ذریعہ ثابت ہو۔

جب قوم نمرود کے لوگ عید کے مراسم انجام دینے کے بعد شہر کو لوٹے اور انھوں نے اپنی عبادت گاہ اور بتوں کو ٹوٹا پھوٹا پایا تو وہ بے حد رنجیدہ اور غضبناک ہوئے۔ ان کے بتوں کی جو توہین کی گئی تھی اس پر انھیں بے حد طیش آیا اور انھوں نے مجرم کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ آپس میں کہنے لگے: ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی ہے؟ بلاشبہ وہ بڑا ظالم ہے۔

بعضوں نے کہا: ہم نے ایک نوجوان کو ان بتوں کی برائی بیان کرتے سنا ہے کہ جس کا نام ابراہیم ہے۔ وہ بتوں کی عبادت کو بے عقلی کا کام سمجھتا ہے اور اس نے ہمیں لعنت ملامت بھی کی تھی۔ اس لیے ممکن ہے کہ یہ کام اسی نے کیا ہو۔

اس طرح انھوں نے بتوں کو توڑنے والے کی شناخت کر لی۔ جب حضرت ابراہیمؑ کو شناخت کر لیا گیا تو ان کو مقدمہ چلانے اور سزا دینے کے لیے وہاں لایا گیا جہاں بت پرست جمع ہوئے بیٹھے تھے۔ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ سے پوچھا: کیا ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک تم نے کیا ہے؟

حضرت ابراہیمؑ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: میں نے نہیں بلکہ بڑے بت نے ان کا یہ حشر کیا ہے، اگر یہ بولتے ہیں تو تم خود انہیں سے پوچھ لو۔

اس حقیقت کے مقابلے میں نمرودیوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بتوں کے عجز اور ناتوانی کا اعتراف کر لیں حضرت ابراہیمؑ کو بھی یہی توقع تھی، لہٰذا جب ان لوگوں نے کہا کہ یہ بت تو بولنے اور کوئی جواب دینے سے قاصر ہیں۔ تب حضرت ابراہیمؑ نے فقط ایک جملے کے ساتھ بت پرستی کی بنیاد ڈھا دی اور انہیں سرزنش اور ملامت کرتے ہوئے کہا:

> تم خدا کی بجائے ایک ایسی چیز کی پرستش کرتے ہو کہ جو تمہیں کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتی، تف ہے تم پہ اور ان پہ جن کی تم پرستش کرتے ہو۔

یوں حضرت ابراہیمؑ پہ چلایا جانے والا مقدمہ انجام کو پہنچا اور جو قرائن موجود تھے ان کی بنا پہ آپ کو مجرم قرار دیا گیا۔

ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا

> وہ لوگ کہنے لگے کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو ابراہیم کو آگ میں جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو۔
>
> (سورۂ انبیاء۔ آیت ۶۸)

نمرودیوں نے حضرت ابراہیمؑ کو زندہ جلا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چونکہ ان کے عقیدے کے مطابق ابراہیمؑ نے ایک قومی جرم کیا تھا، اس لیے

ضروری سمجھا گیا کہ سبھی لوگ اس کام میں شریک ہوں اور ثواب حاصل کریں۔ اس بنا پر سب لوگ ایندھن جمع کرنے میں جُت گئے اور ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ جلانے کی لکڑیوں کا ایک پہاڑ کھڑا ہو گیا۔ پھر آگ جلا دی گئی اور اس کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ ایندھن اتنا زیادہ تھا کہ اس بیابان میں بڑی خطرناک آگ بھڑک اٹھی اور اس کی تپش اس حد تک پہنچ گئی کہ کسی کو اس کے نزدیک جانے کا یارا نہ تھا۔ تب ان ظالم لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک گوپھن کے ذریعے آگ میں پھینک دیا اور اس طرح انھوں نے اپنے دل کی آگ بجھائی۔

حضرت ابراہیمؑ جب آگ کے شعلوں میں جا گرے اور ان لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو ان سب نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ آگ نے ابراہیمؑ کے ساتھ کیا کیا؟ جب حضرت ابراہیمؑ آگ میں گرے تو اسی وقت خدا کا مقرب فرشتہ جبرئیلؑ ان کے پاس پہنچا اور کہنے لگا:

اے ابراہیمؑ! کیا تمھیں میری مدد کی ضرورت ہے؟

حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا: مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں، لیکن خدا کی مدد ضرور چاہتا ہوں۔ پھر انھوں نے خدا سے دعا کی کہ اے پروردگار! مجھے آگ سے نجات دے۔

چنانچہ خدا کے حکم سے وہ آگ حضرت ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی ہو گئی اور انھیں اس کی حرارت سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ نمرود اور اس کی قوم کے لوگ جو اس آگ کو چاروں طرف سے دیکھ رہے تھے، وہ یہ دیکھ کر بڑے حیران ہوئے کہ بھڑکتی آگ نے حضرت ابراہیمؑ کو کچھ

بھی ضرر نہیں پہنچایا اور وہ اس میں بڑے آرام اور اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے یہ منظر تعجب اور تحسین کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا اور نمرود نے اپنے مصاحبین سے کہا:

"اگر کوئی شخص اپنے لیے خدا کا انتخاب کرتا ہے تو اسے ابراہیمؑ کے خدا جیسے خدا کا انتخاب کرنا چاہیے جو اتنا قادر اور توانا ہے۔"

جب لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی یہ عظیم نشانی دیکھی تو انھیں حضرت ابراہیمؑ کی سچائی کا پتا چل گیا اور ان پر یہ ثابت ہو گیا کہ سیدھا راستا وہی ہے جس کی حضرت ابراہیمؑ دعوت دیتے ہیں۔ لیکن دشمنی اور ضد نیز عہدے اور دولت کی ہوس نے انھیں ابراہیمؑ پر ایمان لانے سے باز رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر لوگ بت پرستی پر قائم رہے اور فقط گنتی کے چند افراد ہی حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لائے۔

ابراہیمؑ اور نمرود کا مباحثہ

(اے رسولؐ!) کیا تم نے اس شخص پر نظر نہیں کی جو صرف اس برتے پر کہ خدا نے اس کو سلطنت دی تھی' ابراہیمؑ کے ساتھ ان کے پروردگار کے بارے میں الجھ پڑا۔ جب ابراہیمؑ نے کہا: میرا پروردگار وہ ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے' وہ شخص کہنے لگا کہ میں بھی زندگی اور موت دیتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا: خدا تو سورج کو پورب سے نکالتا ہے تم بھلا اس کو پچھم سے نکال دو۔ اس پر وہ

کا فر ہکا بکا رہ گیا اور خدا ظالموں کو منزل مقصود تک
نہیں پہنچایا کرتا۔

(سورۂ بقرہ - آیت ۲۵۸)

اس خوفناک آگ سے حضرت ابراہیمؑ کے محفوظ رہنے سے نمرودیوں کے دلوں میں ایک عجیب سراسیمگی اور حیرت پیدا ہوئی اور بالخصوص نمرود گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چنانچہ اس نے ابراہیمؑ کو بلوا بھیجا اور ان سے پوچھا: کون ہے تمہارا خدا کہ جس کی پرستش کی تم لوگوں کو دعوت دیتے ہو؟ کیا میرے علاوہ کوئی اور خدا بھی ہے؟ تم نے لوگوں میں کیوں تفرقہ پیدا کردیا اور ان کے بتوں کو کیوں توڑ ڈالا ہے۔ ہاں مجھے بتاؤ کہ تمہارا خدا کون ہے؟

حضرت ابراہیمؑ نے کہا: میرا خدا وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ وہ جانداروں کو جان عطا کرتا ہے اور پھر ان سے واپس لے لیتا ہے۔ تمام ذی روح موجودات کی زندگی اور موت اس کی قدرت اور ارادے کے ہاتھ میں ہے۔ نمرود نے چاہا کہ فریب اور مغالطے کے ذریعے حقیقت کے چہرے پر پردہ ڈال دے اور حضرت ابراہیمؑ کو لاجواب کردے۔

چنانچہ اس نے کہا: میں بھی تو زندہ کر سکتا ہوں اور مار بھی سکتا ہوں۔ مثلاً اگر میں دو قیدیوں کو بلواتا ہوں کہ جنہیں سزائے موت ہو چکی ہے۔ اب ان میں سے ایک کو مروا دیتا ہوں اور دوسرے کو آزاد کرتا ہوں۔ دیکھو تو میں نے پہلے کی جان لے لی اور دوسرے کو زندگی بخش دی ہے۔

ابراہیمؑ نے کہا: اگر تم سچے ہو تو جسے مروا ڈالا ہے، اسے دوبارہ

زندہ کر دکھاؤ۔ علاوہ ازیں میرا خدا وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ اگر تم قدرت رکھتے ہو تو اسے مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ اس پر نمرود نے بے بسی کے ساتھ اس منطق کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور وہ چپ ہو کر رہ گیا۔ لیکن اس نے اپنی سرکشی اور ضد ترک نہیں کی اور فقط رسوائی کے خوف سے حضرت ابراہیمؑ کو آزاد کر دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ابراہیمؑ آسمانی قوت رکھتے ہیں اور ان کو انسانی طاقت سے نابود کرنا ناممکن ہے۔ تاہم اس نے حکم دیا کہ انھیں شہر بدر کر دیا جائے۔ تاکہ کوئی شخص ان کا پیرو نہ بنے اور ان کا دین اختیار نہ کرے۔ ادھر خود ابراہیمؑ بھی نمرودیوں کے ساتھ ان کے شہر میں رہنے پر خوش نہ تھے۔ اس لیے وہ شہر چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بھیڑ بکریاں اکٹھی کیں اور انہیں اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ چونکہ آپ کے ساتھ بہت سی بھیڑ بکریاں اور دوسرا سامان بھی تھا، اس لیے نمرود نے حکم دیا کہ یہ سارا مال بحق سرکار ضبط کر لیا جائے۔

حضرت ابراہیمؑ نے کہا: اگر تم میری بھیڑ بکریاں اور مال و متاع لے لینا چاہتے ہو تو میں نے اس سرزمین میں اپنی جتنی عمر صرف کر کے یہ بھیڑ بکریاں جمع کی ہیں، تم میری وہ عمر مجھے لوٹا دو اور پھر میرا مال ضبط کرو۔ جب بات بڑھ گئی تو یہ مقدمہ نمرود کے ایک منصف کے پاس پہنچا۔ اس نے فریقین کے بیانات سننے کے بعد فیصلہ حضرت ابراہیمؑ کے حق میں دیدیا۔ تب آپ اپنی بھیڑ بکریاں اور دوسرا سامان لے کر حضرت لوطؑ کے ہمراہ نمرود کی قلمرو سے نکل کر شام اور بیت المقدس کی جانب روانہ ہو گئے۔

ایک اور پریشانی

چونکہ حضرت ابراہیمؑ ایک غیور انسان تھے، اس لیے انہوں نے اس سفر میں اپنی بیوی (سارہ) کو ایک صندوق میں بٹھا دیا۔ تاکہ وہ غیر لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہیں لیکن راستے میں ایک ایسے ملک میں پہنچے جس پر ایک عرب بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس ملک کی سرحد پر ایک افسر نے ابراہیمؑ کو محصول ادا کرنے کے لیے روک لیا۔ وہ آپ کے سامان کی جانچ پڑتال کرتے کرتے اس صندوق کے پاس آیا اور بولا: یہ صندوق کھول کر دکھائیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے کہا: فرض کرو کہ یہ صندوق سونے یا چاندی سے بھرا ہوا ہے۔ اب اس کے لیے جو کچھ تم چاہتے ہو میں وہ تمہیں دے دیتا ہوں، لیکن تم اس صندوق کو مت کھولو۔

اس نے کہا: یہ نہیں ہو سکتا اور اس کے ساتھ ہی صندوق کو کھول دیا۔ جب اس کی نظر سارہ کے حسین و جمیل چہرے پر پڑی تو وہ کہنے لگا: اب تو میں جب تک تمہارے اور اس عورت کے بارے میں بادشاہ کو اطلاع نہ دیدوں، تمہیں آگے نہیں جانے دوں گا۔ چنانچہ اس نے کسی شخص کو بھیج کر بادشاہ کو اس معاملے سے آگاہ کیا اور بادشاہ نے انھیں اپنے پاس بلوا بھیجا۔ جب آپ اس کے سامنے پہنچے اور اس کی نظر سارہ پر پڑی تو اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ ان کی جانب بڑھایا۔ حضرت ابراہیمؑ جو غیرت کی کان اور حمیت کا سرچشمہ تھے، وہ سخت پریشان ہوئے اور ادھر سے منہ پھیر کر کہا: اے پروردگار! میرے

اہل حرم کو اس شخص کے ہاتھ سے محفوظ رکھنا۔ اسی وقت بادشاہ کا ہاتھ ایک خشک لکڑی کی مانند ہو گیا اور اس نے حضرت ابراہیمؑ کو مخاطب کر کے کہا:

کیا تمہارے خدا نے میرا ہاتھ خشک کر دیا ہے؟

حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: ہاں! میرا خدا غیور ہے اور وہ حرام کاموں کو ناپسند کرتا ہے۔

بادشاہ نے کہا: آپ اپنے خدا سے دعا کریں کہ وہ میرا ہاتھ ٹھیک کر دے، میں آپ کے حرم سے کوئی تعرض نہ کروں گا چنانچہ ابراہیمؑ نے دعا کی اور بادشاہ کا ہاتھ ٹھیک ہو گیا۔ تاہم اس نے دوبارہ سارہ کی جانب دیکھا اور اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔ اس پہ پہلے کی طرح اس کا ہاتھ پھر خشک ہو گیا۔ تب اس نے بار دیگر ابراہیمؑ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا:

اب میں تمہارے ہاتھ کے شفایاب ہونے کے لیے اس شرط پہ دعا کرتا ہوں کہ تم پھر سے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھاؤ گے لیکن اگر تم ایسا کرو اور تمہارا ہاتھ خشک ہو جاتے تو پھر تم مجھ سے دعا کے لیے نہیں کہو گے۔ بادشاہ نے یہ شرط مان لی۔ تب ابراہیمؑ نے کہا: اے پروردگار! اگر یہ سچ کہہ رہا ہے تو اس کے ہاتھ کو اچھا کر دے۔ اس پہ بادشاہ کا ہاتھ اپنی اصلی حالت پہ آگیا اور اس کے دل میں حضرت ابراہیمؑ کا رعب بیٹھ گیا۔ اس نے ان کا بے حد احترام کیا اور ہاجرہ کو بطور کنیز سارہ کے حوالے کر دیا اور کہا: تم جہاں جی چاہے جا سکتے ہو۔

ابراہیمؑ اور ستارہ پرست

اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمان اور زمین کی سلطنت کا انتظام دکھاتے رہے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں ۔ تو جب ان پر رات کی تاریکی چھا گئی تو انھوں نے ایک ستارہ دیکھا تو بول اٹھے کہ کیا یہی میرا خدا ہے ؟ جب وہ غروب ہو گیا تو کہنے لگے : میں غروب ہو جانے والے کو پسند نہیں کرتا۔ پھر چاند کو جگمگاتے ہوئے دیکھا تو بولے : کیا یہی میرا خدا ہے ؟ جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہنے لگے : اگر میرا پروردگار مجھے ہدایت نہ دیتا تو میں ضرور گمراہ لوگوں میں سے ہو جاتا۔

(سورۃ انعام - آیت ۷۵ تا ۷۷)

بابل سے فلسطین اور بیت المقدس کی جانب سفر کے دوران حضرت ابراہیمؑ کی ملاقات کچھ ایسے لوگوں سے ہوئی جو ستارہ پرست تھے اور انھوں نے خدائے واحد کی بجائے ستاروں کو اپنا خدا مان رکھا تھا۔

جب ابراہیمؑ کو ان کی گمراہی کا پتا چلا تو آپ نے ان کو خدا کی راہ سجھانے اور گمراہی سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔

جیسا کہ انبیاء کا طریقہ ہے کہ وہ جاہلوں اور گمراہوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتے ہیں۔ نیز ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ لوگوں کی رہنمائی کے سلسلے میں انتہائی نرمی سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ یہاں بھی انھوں نے ایک خاص طرز عمل اپنایا اور گفتگو کے آغاز

میں خود کو ستارہ پرستی کے حامی کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ پھر اپنی اس گفتگو کے دوران میں ان کے مذہب کی بنیاد بھی ڈھادی۔

جب رات ہوگئی اور دنیا میں اندھیرا چھا گیا تو آسمان پہ ستارے چمکنے لگے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ نے ان کی ہمنوائی کرتے ہوئے کہا: یہ ستارہ میرا خدا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر گزری تھی کہ وہ ستارہ ڈوب کر نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ تب آپ نے کہا: میں اس خدا کو دوست نہیں رکھتا جو غروب ہو جائے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد افق کے ایک سرے سے چاند نکل آیا۔ ابراہیمؑ نے چاند پہ نگاہ ڈالی جبکہ وہ لوگ آپ کی باتیں توجہ سے سن رہے تھے، آپ نے فرمایا: یہ میرا خدا ہے کہ یہ اس ستارے سے بڑا ہے لیکن کچھ دیر کے بعد چاند بھی ڈوب گیا۔ تب ابراہیمؑ نے کہا: اگر میرا خدا مجھے ہدایت نہ کرے تو بلاشبہ میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا۔

آخر کار رات گزر گئی اور سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ مشرق سے طلوع ہوا۔ اب حضرت ابراہیمؑ نے سورج کی بڑائی اور روشنی پہ نگاہ ڈالی اور کہا: یہ میرا خدا ہے کہ یہ سب ستاروں سے بڑا ہے۔ لیکن جب دن ختم ہوگیا اور سورج بھی ستارے اور چاند کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تو حضرت ابراہیمؑ نے شرک اور بت پرستی سے بیزاری کا اظہار کیا اور فرمایا: میں ان تبدیل ہوتی رہنے والی موجودات سے بیزار ہوں۔ بلاشبہ میں اپنا منہ اس خدا کی جانب کرتا ہوں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ میں تو فقط اسی کی پرستش کرتا ہوں اور مشرکوں کے گروہ میں سے نہیں ہوں۔

اس طریقے سے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے دلائل کو اختتام تک پہنچایا اور ان لوگوں کو معبودِ حقیقی کی جانب متوجہ کیا لیکن وہ لوگ ابراہیمؑ کی اس رہنمائی کو دل و جان سے قبول کرنے کی بجائے الٹے بحث مباحثے پر تیار ہو گئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا: کیا تم خدا کے بارے میں مجھ سے بحث کرتے ہو جبکہ خدا نے میری رہنمائی سیدھے راستے کی جانب فرمائی ہے۔ جب ان لوگوں نے دیکھا کہ ان کی باتیں ابراہیمؑ کو سیدھے راستے سے نہیں ہٹا سکیتں تو انھوں نے آپ کو ڈرایا اور ستاروں کے غضب سے خبردار کیا۔ تاہم حضرت ابراہیمؑ نے ان باتوں کو تمسخر کی نگاہ سے دیکھا، کیونکہ یہ بات ان پر روشن اور واضح تھی کہ پروردگارِ عالم کے علاوہ کوئی اور کسی طرح کی قدرت نہیں رکھتا۔ نیز یہ کہ ستارے بے جان موجودات ہیں اور وہ آسمانوں اور زمین کے خدا کے زیرِ فرمان ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کی بیوی سارہ بانجھ تھیں اور ان کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوتا تھا لیکن وہ دیکھتی تھیں کہ ان کے مہربان اور باوفا شوہر کو ہمیشہ سے فرزند کی آرزو ہے اس لیے وہ کچھ اداس رہا کرتی تھیں۔ چونکہ وہ عمر کے اس مرحلے میں پہنچ چکی تھیں، جب انھیں خود اپنے ہاں بچہ پیدا ہونے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنی کنیز ہاجرہ کو ابراہیمؑ کے لیے مباح کر دیا۔ چنانچہ ہاجرہ حاملہ ہو گئیں اور انھوں نے ایک لڑکے کو جنم دیا، جس کا نام اسماعیل رکھا گیا۔ اس نوزائیدہ بچے نے باپ کی آنکھوں کو نور بخشا اور ان کے قلب کو خوشی سے لبریز کر دیا لیکن اس کے ساتھ ہی سارہ کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ بیحد غمگین اور پریشان رہنے لگیں۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ ہاجرہ اور اسماعیل کو دیکھنے کی روادار نہ ہوتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے

ابراہیمؑ سے درخواست کی کہ وہ ہاجرہ اور ان کے بیٹے کو ایک ایسے دُور دراز مقام پر چھوڑ آئیں جہاں سے ان کی خبر تک نہ آئے۔

اس صورتِ حال میں ابراہیمؑ نے خدائے تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں سارہ کی درخواست قبول کرلی اور ہاجرہ و اسماعیلؑ کو ساتھ لے کر خدا کی رہنمائی میں روانہ ہوگئے، حتیٰ کہ مکہ کی سرزمین میں جا پہنچے۔ آپ نے فرمانِ خداوندی کے مطابق ان دونوں ماں بیٹے کو وہاں چھوڑا اور خود سارہؑ کے پاس لوٹ گئے۔

ایک بے سہارا عورت اور ایک دودھ پیتا بچہ، آبادی سے دُور ایک بے آب و گیاہ بیابان میں تنہا رہ گئے۔ تاہم ہاجرہ ایک ایسی خاتون تھیں جنہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے خدا پر توکل کرنے کا سبق سیکھ رکھا تھا۔ انہوں نے خدائے تعالیٰ پر اپنے ایمان اور توکل کے ساتھ صبر کا دامن تھام لیا اور کھانے پینے کا جو سامان ان کے پاس تھا اس کو تھوڑا تھوڑا کرکے استعمال کرتی رہیں۔ آخر وہ وقت آگیا جب یہ سامان ختم ہوگیا اور وہ بھوک اور پیاس میں مبتلا ہوگئیں جس سے ان کا دودھ بھی خشک ہوگیا۔ تب ہاجرہ اس بیابان میں ادھر ادھر پھرنے لگیں کہ شاید کہیں پانی مل جائے اور وہ اپنے پیارے بیٹے کی جان بچاسکیں۔ بدقسمتی سے پانی کی تلاش میں ناکامی ہوئی، تھک ہار کر وہ اسماعیلؑ کے پاس واپس آگئیں اور دیکھا کہ وہ رو رو کر پریشان ہورہے ہیں۔

اپنے بچے کو روتے دیکھ کر تنہا اور مجبور ماں کو بے حد دکھ ہوا لیکن اب پانی کی تلاش ان کے بس کی بات نہ تھی۔ تاہم وہ ایک بار پھر اٹھیں اور اس سدا کے پیاسے بیابان میں پانی تلاش کرنے لگیں مگر اس بار بھی

انہیں کامیابی نہ ہوئی اور وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے بیٹے کے پاس پہنچیں۔ انھوں نے دیکھا کہ بچے کی حالت خطرناک ہو چکی ہے اور شاید وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ ہاجرہ اپنے فرزند کے پاس بیٹھی یہ جانگداز منظر دیکھ رہی تھیں کہ اچانک اسماعیلؑ کے پاؤں کے نیچے صاف شفاف پانی کا ایک چشمہ اُبل پڑا۔ یہ دیکھ کر ہاجرہ کا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔

اب ماں اپنے بچے کے پاس زمین پہ بیٹھ گئی اور اس کے خشک گلے میں پانی ٹپکانے لگی، جس سے اس کا مرجھایا ہوا چہرہ تر و تازہ ہو گیا اور اس کو پیاس کی موت کا جو خطرہ لاحق تھا وہ دُور ہو گیا۔ پھر خود بھی پانی پیا اور زندگی کی امید کے ساتھ خدا کا شکر ادا کیا۔

پانی کے اس چشمے کی بدولت اس خشک سرزمین میں رفتہ رفتہ پرندے بھی منڈلانے لگے۔ اسی دوران میں قبیلہ جرہم کے لوگ کہ جو قریب ہی رہتے تھے پرندوں کی ٹولیاں دیکھ کر کھوج لگاتے ہوئے اس چشمے تک آپہنچے اور اس کے پاس آباد ہو گئے۔ ہاجرہ ان لوگوں سے مانوس ہو گئیں اور ان کو تنہائی کا جو خوف لگا رہتا تھا وہ بھی جاتا رہا۔

اس طرح ان ماں بیٹے کے بارے میں ابراہیمؑ کی وہ دعا مستجاب ہو گئی جو انھوں نے اس سرزمین سے واپس جاتے وقت مانگی تھی جیسا کہ انھوں نے ہاجرہ کو الوداع کہتے ہوئے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا تھا:

اے پروردگار! میں نے اپنے خاندان اور ذریت میں
سے بعض افراد کو اس بے آب و گیاہ سرزمین میں تیرے
قابلِ احترام گھر کے پاس بسا دیا ہے تاکہ وہ یہاں نماز

کو قائم کریں۔ اے پروردگار! لوگوں کے دل ان کی جانب مائل کر دے اور انھیں پھلوں کے ذریعے روزی بہم پہنچا، امید ہے کہ وہ تیرے شکر گزار رہیں گے۔

ہاجرہ اس چشمے پر اپنے فرزند اسماعیلؑ کے ساتھ اور قبیلہ جرہم کی ہمسائیگی میں ہنسی خوشی دن گزار رہی تھیں۔ کبھی کبھی حضرت ابراہیمؑ بھی اپنی بیوی اور بچے سے ملنے کے لیے آجاتے تھے اور انھیں دیکھ کر اپنے دل کو ٹھنڈک پہنچاتے تھے۔

اسماعیلؑ پلتے بڑھتے جوانی کی عمر کو پہنچ گئے۔ اسی دوران میں حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا، جس میں خدائے تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو خود اپنے ہاتھ سے قربان کر دیں۔

حضرت ابراہیمؑ جانتے تھے کہ ان کا خواب خدا کی طرف سے الہام ہے اور اس میں وسوسۂ شیطانی کا کوئی دخل نہیں۔ اسی بنا پر وہ ایمان سے سرشار دل کے ساتھ ارشادِ خداوندی کی تعمیل پر آمادہ ہو گئے اور وہ فوراً آکر اسماعیلؑ سے ملے اور ان سے کہا:

پیارے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمھارا سر تن سے جدا کر رہا ہوں، اس بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟

حضرت اسماعیلؑ کہ جو اس خاندان کے لال اور اسی عالی مرتبت باپ کے فرزند تھے، انھوں نے کسی تردد اور پریشانی کے بغیر جواب دیا: باباجان! جو حکم آپ کو دیا گیا ہے آپ اس پر عمل کریں، انشاءاللہ آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔

حضرت ابراہیمؑ یعنی وہ برگزیدہ انسان جو شدید مشکلوں اور پریشانیوں

سے دوچار ہوتے رہے اور ہر آزمائش میں پورے اترے تھے، وہ اس امتحان میں بھی کامیاب رہے۔ انہوں نے منیٰ کے بیابان میں اپنے عزیز بیٹے کا رخسار زمین پہ رکھا اور چھری ہاتھ میں لے لی۔ جب وہ حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے لگے تو انھوں نے کہا:

بابا جان! رسی مضبوطی سے باندھیے تاکہ جان دیتے وقت میں ہاتھ پاؤں نہ ماروں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے اجر میں کمی نہ ہو جائے۔ علاوہ ازیں آپ اپنے کپڑے بھی اچھی طرح سنبھال لیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ میرے خون کے قطرے آپ کے کپڑوں پہ گر جائیں اور انھیں دیکھ کر میری والدہ کے ہاتھ سے صبر کی باگ چھوٹ جائے۔ آپ چھری کی دھار بھی تیز کر لیں اور جتنی جلد ہو سکے میرا سر دھڑ سے جدا کر دیں تاکہ موت کی تکلیف کا برداشت کرنا میرے لیے کچھ آسان ہو جائے کہ جو بڑی سخت اور دشوار چیز ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے کہا: پیارے بیٹے! تم خدا کے حکم کی تعمیل کرنے میں میرے اچھے رفیق ہو۔ پھر انہوں نے چھری بیٹے کے گلے پر رکھی اور اسے چلا دیا لیکن خداوند کے فرمان کے مطابق وہ اسماعیل کا گلا کاٹنے سے باز رہی اور اس نے ان کے گلے پر خراش تک نہ لگائی۔ دریں اثنا حضرت ابراہیمؑ پر وحی نازل ہوئی کہ: اے ابراہیمؑ! بلاشبہ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا، جو کچھ خواب میں دیکھا تھا اس کے مطابق عمل کیا اور اپنے اخلاص اور عبودیت کا اظہار کیا۔ پھر اسماعیلؑ کے فدیہ میں ایک بڑی شان کی قربانی خدا کی طرف سے بھیجی گئی۔ چنانچہ ابراہیمؑ نے اس مینڈھے کے گلے پر چھری پھیر دی اور اسے اپنے بیٹے کی بجائے قربان کر دیا۔

اس دن سے منیٰ کی سرزمین میں قربانی کرنا ایک سنت قرار دے دی گئی۔ پھر اسلام میں بھی اس کا حکم دیا گیا۔ تاکہ حاجی لوگ ہر سال اسماعیلؑ کی قربانی کے دن اس بیابان میں قربانی دیا کریں۔

جب حضرت ابراہیمؑ اور ان کا بیٹا قربان گاہ سے لوٹے تو اسماعیلؑ تو اپنی ماں کے پاس آ گئے اور ابراہیمؑ اپنی بیوی سارہ کے پاس واپس چلے گئے۔ کچھ مدت گزری تو حضرت اسماعیلؑ قبیلہ جرہم کے ساتھ بہت مانوس ہو گئے جو ہجرت کر کے وہاں آپ سے آ ملے تھے۔ آپ نے اُن کی زبان سیکھ لی اور پھر اسی قبیلے کی ایک لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ ایک دفعہ حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے سے ملنے آئے تو اتفاق سے وہ اس وقت گھر پر موجود نہ تھے۔ تب حضرت ابراہیمؑ کو اس عورت کے طور طریقے پسند نہ آئے اور آپ نے اسے اپنے بیٹے کی زوجیت کے قابل نہ پایا۔ چنانچہ واپس جاتے ہوئے وہ حضرت اسماعیلؑ کے لیے یہ پیغام چھوڑ گئے کہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دو۔ حضرت اسماعیلؑ اس پیغام کا مطلب سمجھ گئے اور انہوں نے اس عورت کو طلاق دیدی۔ پھر انہوں نے ایک اور عورت سے شادی کر لی جو ہر لحاظ سے ان کی رفیقۂ حیات بننے کے قابل تھی اور خدا نے اس کے بطن سے انھیں اولاد بھی عطا کی۔

کچھ عرصے کے بعد حضرت اسماعیلؑ کی والدہ ہاجرہ اسی سرزمین میں انتقال کر گئیں۔ حضرت اسماعیلؑ کو اپنی ماں کی وفات پر بے حد صدمہ ہوا اور وہ پریشان ہو گئے۔ تاہم حضرت ابراہیمؑ کبھی کبھی ان سے ملنے آجاتے تھے اور اس طرح حضرت اسماعیلؑ کا غم غلط ہو جاتا تھا اور انہیں تسکین حاصل ہو جاتی تھی۔

ایک اور موقع پر جبکہ حضرت ابراہیمؑ حجاز آئے، انہوں نے اپنے بیٹے کو بتایا کہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس بیابان میں ایک گھر تعمیر کروں۔ حضرت اسماعیلؑ نے بھی اس کام کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کی۔ پھر خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے باپ بیٹے نے ضروری سامان جمع کیا۔ مقررہ جگہ پر گئے اور پختہ ارادے کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ اس وقت وہ خدائے تعالےٰ سے یہ عرض کر رہے تھے:

اے پروردگار! ہماری طرف سے یہ خدمت قبول فرما لے، کیونکہ تو جاننے اور سننے والا ہے۔ اے پروردگار! ہمیں توفیق دے کہ ہم مسلمان بن کر زندہ رہیں۔ نیز ہماری ذریت میں سے بھی ایک مسلم امت پیدا کرنا۔ تو ہمیں مناسکِ حج کی تعلیم دے اور ہماری توبہ قبول فرما کہ تو ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان خدا ہے۔

اسماعیلؑ پہاڑ سے پتھر اٹھا کر لاتے اور ابراہیمؑ چنائی کرتے تھے۔ حتیٰ کہ دیواریں اٹھ گئیں۔ خدا کا مقرب فرشتہ جبرئیلؑ کہ جو خدا کے حکم سے ہر موقع پر ابراہیمؑ کی رہنمائی کرتا تھا۔ اس نے انہیں وہ جگہ بتائی کہ جہاں حجرِ اسود دبا پڑا تھا۔ چنانچہ وہ جگہ کھود کر پتھر کو باہر نکالا گیا اور ابراہیمؑ نے اسے اس مقام پر نصب کر دیا جہاں ان دنوں موجود ہے۔ انہوں نے خانہ کعبہ کے دو دروازے رکھے جن میں سے ایک مشرق اور دوسرا مغرب کی طرف کھلتا تھا۔

جب خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام مکمل ہو گیا تو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اعمالِ حج بجا لائے۔ پھر ابراہیمؑ نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور کہا: اے پروردگار! اس زمین کو امن و امان کا مقام قرار دے اور یہاں رہنے والوں کو پھلوں کی شکل میں روزی عنایت فرما۔

حضرت لوط علیہ السلام

حضرت لوطؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔ وہ ان پر ایمان لائے اور ان کے ہمراہ بابل کی سرزمین سے خدا کی راہ میں، ہجرت کی۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ مصر میں خوب دولت مند ہو گئے اور ان کے پاس بہت سے چوپائے اور کافی مال و دولت جمع ہو گیا۔ پھر وہ مصر سے فلسطین اور بیت المقدس منتقل ہو گئے۔ وہاں جانوروں اور ساز و سامان کی کثرت کے باعث وہ جگہ ان کے لیے تنگ ہو گئی۔ تب حضرت لوطؑ، حضرت ابراہیمؑ کی رضامندی سے اردن میں واقع سدُوم کے قصبے میں سکونت پذیر ہو گئے۔

اس قصبے کے باشندے کمینے، بداخلاق اور شریر تھے۔ نیز ان کے معاشرے میں ہر طرف اخلاقی برائیوں کا دور دورہ تھا۔

اگر کوئی مسافر اس قصبے میں سے گزرتا تو وہ یکے بعد دیگرے آتے

اور اس کا سامان یا تجارت کا مال اٹھا لے جاتے۔ یہاں تک کہ وہ بیکس اور تہی دست ہو کر رہ جاتا۔

مندرجہ ذیل داستان جو ایک مصری مصنف نے نقل کی ہے، یہ کسی حد تک اس بات کا پتا دیتی ہے کہ حضرت لوطؑ کی قوم کتنی بد طینت اور رذیل تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی بیوی سارہ نے ایک غلام کو قصبۂ سدوم بھیجا، تاکہ وہ ان کے بھائی حضرت لوطؑ کے بارے میں کوئی خیر خبر لاتے۔ جب وہ غلام قصبے میں پہنچا تو اسے وہاں کا ایک آدمی ملا جس نے کچھ کہے سنے بغیر ہی پتھر مار کر اس کا سر پھوڑ دیا اور اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ اس شخص نے اسی پر بس نہیں کی، بلکہ اس کا سر پھوڑنے کے بعد اس کا گریبان پکڑ لیا اور کہا: اگر یہ خون تمہارے بدن میں رہتا تو تمہارے لیے خطرناک تھا، لہٰذا تم مجھے خون نکالنے کا معاوضہ ادا کرو۔ اس پہ ان دونوں کا جھگڑا ہو گیا اور معاملہ عدالت تک پہنچا۔ جج نے طرفین کے بیانات سننے کے بعد نہ صرف غلام کے خلاف فیصلہ صادر کیا، بلکہ اسے یہ حکم بھی دیا: اس شخص نے تمہارے بدن سے خون نکالنے کے لیے جو تکلیف اٹھائی ہے تم اسے اسکا معاوضہ ادا کرو۔

غلام نے جب ایسا ظلم اور پھر یہ ناانصافی دیکھی تو اس نے جج کے سر پہ پتھر کھینچ مارا، جس سے اس کا خون بہہ نکلا۔ تب غلام نے کہا: میں نے تمہارے بدن سے خون نکالنے کی خاطر جو زحمت اٹھائی ہے، اس کا جو بھی معاوضہ بنتا ہے، تم وہ اس آدمی کو دے دو۔

حضرت لوطؑ کی قوم کے لوگ ایک سے ایک نئی برائی کرتے تھے۔ وہ ایسے ایسے برے کاموں کے مرتکب ہوتے کہ جن کی نظیر نہیں ملتی تھی۔ ایک بدترین فعل جو وہ بے کھٹکے حتیٰ کہ کھلے بندوں کرتے تھے وہ اغلام تھا۔ یہ برا فعل ان لوگوں میں اتنا عام تھا کہ مرد اپنی بیویوں سے کنارہ کش رہ کر فقط مردوں کے ساتھ مجامعت کیا کرتے تھے۔ شہوت رانی، قماربازی اور گلوکاری کے علاوہ سرِراہ بیٹھ کر راہ چلتوں پر پتھر پھینکنا اور نجاست سے پرہیز نہ کرنا اس قوم کے معمولات تھے۔

ان حالات میں خدائے تعالیٰ نے ان لوگوں کی ہدایت کے لیے حضرت لوطؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا جو ایک شائستہ اور لائق انسان تھے۔ انہوں نے اس قوم کو نصیحت کی اور اپنے قول و عمل سے نیکی اور سعادت کے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی، لیکن ان سیاہ دل لوگوں پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر!

حضرت لوطؑ کی تیس سال کی تبلیغ کے نتیجے میں فقط چند آدمی ان کی جانب مائل ہوئے کہ جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ باقی سب لوگ اپنی بے دینی اور بداعمالی پر اڑے رہے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت لوطؑ ان برے کاموں کی مزاحمت اور مخالفت کرتے ہیں، تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں اور ان کے پیروؤں کو شہر بدر کر دیا جائے۔

جب حضرت لوطؑ کو ان کے ارادے کا علم ہوا تو انھوں نے وعظ و نصیحت پر اور بھی توجہ دی اور انہیں خدا کے عذاب سے بہت بہت

ڈرایا، لیکن وہ لوگ اپنی روش پر قائم رہے اور کہنے لگے: تم جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو ہم پر نازل کردو۔

قوم کی بدکاری اور بے شرمی دیکھ کر حضرت لوطؑ ان کے ہدایت پانے سے مایوس ہوگئے۔ انہوں نے جان لیا کہ اب ان لوگوں پر نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوگا اور اب یہ شفا بخش دوائیں بھی ان خطرناک مریضوں کے لیے مفید ثابت نہ ہوں گی۔ ان لوگوں کی مثال ایک ایسے عضو کی تھی جو فاسد ہو چکا تھا۔ اس لیے اب اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ دوسرے اعضاء کو بچانے کے لیے اس فاسد عضو کو کاٹ دیا جائے۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت لوطؑ نے بارگاہِ الٰہی میں اپنے ہاتھ پھیلائے اور یہ دعا کی کہ وہ ان لوگوں کو انکے کیے کی سزا دے اور ان پر اپنی طرف سے عذاب نازل فرمائے۔

خدا نے حضرت لوطؑ کی دعا قبول فرمائی اور چند فرشتوں کو اس قوم کی ہلاکت پر مامور کردیا۔ تب وہ فرشتے آدمیوں کی شکل میں سرِ شام ابراہیمؑ کے گھر پہنچے لیکن وہ سمجھے کہ یہ مسافر ہیں جو اس راستے سے کہیں جا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بڑی خوشی سے ان کا استقبال کیا اور ان کے لیے بڑا عمدہ کھانا تیار کرایا لیکن انھوں نے کھانے کی کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ پریشان ہونے کے علاوہ کچھ خوفزدہ بھی ہوئے۔ تب انہوں نے اپنا تعارف کرایا اور انھیں خوشخبری دی کہ خدا انھیں اسحاقؑ نام کا ایک فرزند عنایت فرمائے گا۔ انہوں نے ابراہیمؑ کو یہ بھی بتایا کہ خدا نے ایک اہم کام ہمارے سپرد کیا ہے اور ہم قومِ لوطؑ کو ہلاک کرنے جا رہے ہیں۔

جب حضرت ابراہیمؑ کو اپنے مہمانوں کی پہچان ہو گئی تو ان کا خوف زائل ہو گیا۔ پھر انھوں نے قومِ لُوطؑ کی سفارش کی تاکہ ان پر آنے والا عذاب ٹل جائے۔

فرشتوں نے جواب دیا: آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ کیونکہ خدا کا فرمان جاری ہو چکا ہے اور اب قومِ لوطؑ کی ہلاکت ایک یقینی امر ہے۔ تاہم حضرت لوطؑ اور ان کے کنبے کے لوگ محفوظ رہیں گے مگر ان کی بیوی کہ جو کفر کی طرف میلان رکھتی ہے، وہ ھلاک ہو جائے گی۔

فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے گھر سے نکلے اور خوبصورت جوانوں کی شکل میں سدُوم پہنچے اور سیدھے لوطؑ کے گھر آ گئے۔

حضرت لوطؑ انہیں دیکھ کر ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ ایک طرف وہ ان مہمانوں کو دیکھتے تھے کہ جن کا استقبال کرنا ان کے لیے لازم تھا۔ دوسری طرف وہ اس قوم کی بے حیائی سے بھی واقف تھے۔ اس بنا پر وہ مہمانوں کے لیے خطرے کا احساس کر رہے تھے۔ تاہم وہ ان کے گھر آ گئے تھے اور حضرت لوطؑ کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ ان کا استقبال کریں اور ان کے ساتھ عزت سے پیش آئیں۔

ابھی مہمانوں کو آئے ہوتے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ لوطؑ کی بیوی نے ان لوگوں کو ان مہمانوں کی آمد سے مطلع کر دیا۔ تب وہ لُوطؑ کے گھر کے سامنے جمع ہو گئے اور کہنے لگے: ان مہمانوں کو ہمارے سپرد کر دو تاکہ ہم ان سے لطف اٹھائیں اور یہ رات مسرت اور لذت کے ساتھ گزاریں۔

حضرت لوطؑ نے ان لوگوں کو نصیحت کی اور انہیں قسم دی کہ مجھے رسوا نہ کرو اور میرے مہمانوں سے کوئی تعرض نہ کرو لیکن ان لوگوں نے دیوانوں یا وحشی جانوروں کی مانند غوغا کیا اور پھر گھر کا دروازہ توڑ کر اندر آگئے۔

اب لوطؑ کے لیے واقعی کوئی چارۂ کار نہ رہا' انھیں شدید پریشانی ہوئی اور ان سے کہنے لگے: "اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو میں تمہارا دماغ درست کر دیتا اور تمہاری بدکاریوں کی قرار واقعی سزا دیتا۔"

فرشتوں نے لُوطؑ کی پریشانی اور رنج و غم دیکھا تو بولے: اے لُوطؑ! ہم پروردگار کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ ہم اس قوم کو سزا دینے اور آپ کو ان سے نجات دلانے کی خاطر آتے ہیں۔" ابھی ایک لحظہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ لوگ بے حد خوفزدہ ہو گئے اور وہاں سے بھاگ نکلے۔

ان لوگوں کے چلے جانے سے لوطؑ کا رنج و غم دور ہو گیا اور وہ مطمئن ہو گئے۔ فرشتوں نے انھیں مشورہ دیا کہ آپ رات کے آخری حصے میں اپنے گھر والوں کو ساتھ لے کر اس قصبے سے نکل جائیں تاکہ خدا کے حکم پر عمل درآمد ہو اور اس قوم پر عذاب نازل کیا جائے۔

حضرت لُوطؑ اپنی بیٹیوں کو ساتھ لے کر قصبے سے چلے گئے۔ پھر وہ شدید زلزلہ آیا کہ جس نے زمین کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا اور ان لوگوں پر سنگریزوں کی بارش ہوئی۔ یوں اس گمراہ اور فسادی قوم کو اس کی بدکاریوں کی سزا مل گئی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام

حضرت اسحاقؑ نے اپنے چچا کی بیٹی رفقا سے شادی کی چنانچہ خدا نے انہیں دو جڑواں بیٹے عطا فرمائے جن کے نام عیسو اور یعقوب رکھے گئے۔ ان دونوں میں یعقوبؑ اپنے والدین کو خاص طور پر عزیز تھے بعد میں حضرت اسحاقؑ نے ان کے حق میں دعا کی کہ خدا انہیں طویل عمر، خیر و برکت اور خوشگوار زندگی عطا فرمائے۔ ان کی یہی محبوبیت ان کے بھائی عیسو کے غصے کا موجب بنی۔ اس نے انہیں ڈرایا دھمکایا اور برا بھلا کہا۔ ان حالات میں حضرت یعقوبؑ اپنے والدین کے کہنے پر فلسطین سے فدان آرام چلے گئے، جہاں ان کے ماموں (لابان) رہتے تھے۔ وہاں جا کر وہ اپنے ماموں کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے ماموں اس خدمت کے عوض اپنی بیٹی راحیل کا نکاح ان سے کر دیں لیکن ان کے ماموں نے اپنی دوسری بیٹی لیاہ کو ان سے بیاہ دیا۔ اس کے بعد یعقوبؑ

نے راحیل کے بارے میں اپنے ماموں سے بات کی۔اس نے جواب دیا کہ اگر تم راحیل سے شادی کرنا چاہتے ہو تو تمہیں مزید دس سال تک میری خدمت کرنا ہو گی۔ چنانچہ حضرت یعقوبؑ اس بات کو مان گئے اور راحیل سے نکاح کر لیا۔

پھر لابان نے اپنی دونوں بیٹیوں کو خدمت کے لیے ایک ایک کنیز بھی بخش دی۔ پھر وہ وقت آیا کہ حضرت یعقوبؑ نے وہاں سے رخت سفر باندھا۔ وہ اپنے اہل خانہ اور کافی مال و دولت کے ساتھ واپس فلسطین پہنچے اور اپنے بھائی عیسو کے لیے تحفے بھیجے۔ اس نے وہ تحفے قبول کر لیے اور پھر خندہ پیشانی سے حضرت یعقوبؑ کا استقبال کیا۔ اس طرح ان دونوں بھائیوں میں پائی جانے والی رنجش ختم ہو گئی۔ یہاں آ کر حضرت یعقوبؑ نے کنعان میں سکونت اختیار کی اور خدا نے انہیں بارہ بیٹے دیے جو بعد میں اسباط کے نام سے مشہور ہوئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام

جب صبح کے وقت حضرت یوسفؑ نیند سے جاگے تو ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ اپنے والد کے پاس آئے اور کہا:

بابا جان! آج رات میں نے ایک بڑا اچھا خواب دیکھا ہے کہ جس سے میں بہت خوش ہوا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے نیز چاند اور سورج مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

حضرت یعقوبؑ جو یہ خواب سن کر بہت خوش ہوئے، انھوں نے کہا:

پیارے بیٹے! تمہارا یہ خواب سچا ہے اور تمہارے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے جس کی مجھے ہمیشہ توقع رہی ہے لیکن یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ بتانا کیونکہ ممکن ہے وہ تم پر رشک کریں اور تمہارے خلاف کوئی منصوبہ بنائیں۔

ان دنوں حضرت یوسفؑ کی عمر سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ ان کی والدہ فوت ہو چکی تھیں جس سے وہ اور ان کے بھائی بنیامین بن ماں کے رہ گئے تھے۔ اس لیے حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ سے بیحد محبت تھی اور باپ کی اسی محبت کے باعث بھائیوں نے ان کو باپ سے جدا کرنے کا منصوبہ بنایا، تاکہ حضرت یوسفؑ کی بجائے خود انہیں باپ کی محبت میسر آسکے۔

ایک دن وہ باپ کے پاس آئے اور کہنے لگے: باباجان! آپ یوسفؑ کے بارے میں ہم پر اعتماد کیوں نہیں کرتے، حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں۔ اجازت دیجیے کہ کل وہ ہمارے ساتھ جنگل کو چلے اور وہاں گھومے پھرے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم دل و جان سے اس کی حفاظت کریں گے۔

حضرت یعقوبؑ کو اپنے بیٹوں کے خیالات کا علم تھا اور ایک حد تک ان کے خطرناک عزائم کا اندازہ بھی تھا۔ لیکن وہ انھیں کھل کر یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ مجھے تمہاری جانب سے خوف ہے۔ لہٰذا انھوں نے کہا: یوسفؑ سے جدائی مجھے پریشان اور غمگین کر دیتی ہے۔ پھر مجھے یہ ڈر بھی ہے کہ مبادا تم اس کے حال سے غافل ہو جاؤ اور کوئی بھیڑیا اسے پھاڑ کھائے۔

تاہم یوسفؑ کے بھائی خاموش نہیں رہے، بلکہ انہوں نے جواب دیا: اگر ہماری شجاعت اور قوت کے باوجود کوئی ایسا حادثہ پیش آجائے تو یہ ہماری بدقسمتی ہوگی، ورنہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

دوسرے دن کی صبح کو حضرت یوسفؑ کے بھائی ان کو ہمراہ لے کر

کنعان کے دروازے سے باہر نکلے۔ ابھی وہ زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ ان کے چہروں سے دشمنی اور غصے کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

چلتے چلتے وہ کنعان کے کنوئیں پر جا پہنچے، وہاں انھوں نے حضرت یوسفؑ کی قمیض اتار لی اور انہیں برہنہ کر کے کنوئیں میں پھینک دیا۔ حضرت یوسفؑ بہت روئے دھوئے لیکن ان کا نالہ و فریاد بھائیوں کے سینوں میں بھڑکتی ہوئی حسد کی آگ کو نہ بجھا سکا اور انھیں اس جرم سے باز نہ رکھ سکا۔

چنانچہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے ان کو کنوئیں میں پھینک کر سکھ کا سانس لیا۔ پھر سوچنے لگے کہ اب ہمارے باپ کا دل یوسفؑ کی محبت سے خالی ہو جائے گا اور اب وہ یوسفؑ کی بجائے خود ان سے محبت کرنے لگیں گے۔ وہ تو یہ سوچ رہے تھے لیکن تقدیر ان کی بے عقلی پہ ہنس رہی تھی۔

جب سورج ڈوب گیا اور اندھیرا چھا گیا تو یوسفؑ کے بھائی روتے ہوئے باپ کے پاس پہنچے۔ حضرت یوسفؑ کی قمیض جس پر انھوں نے کسی اور چیز کا خون لگا رکھا تھا وہ باپ کو دکھائی اور کہا: بابا جان! جس بات سے آپ ڈرتے تھے وہ ہو کر رہی۔ یعنی جب ہم آپس میں تیراندازی کا مقابلہ کر رہے تھے تو ہماری توجہ حضرت یوسفؑ کی طرف سے ہٹ گئی تھی۔ تب ایک بھیڑیے نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے چیر پھاڑ ڈالا۔ یہ ہے اس کی خون آلود قمیض اور ہماری آنسو بہاتی ہوئی آنکھیں اس حقیقت کی گواہ ہیں۔ تاہم اگر ہم سچ بھی کہیں تو آپ ہماری باتوں کا یقین نہیں کرتے۔

اگرچہ حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹوں کے جرم کو بھانپ گئے تھے لیکن آپ جانتے تھے کہ خدا نے یوسفؑ کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہے اس کو ٹالنا ممکن نہیں۔ پھر ان کو جواب دیا: تمہارے سرکش نفس اور حسد کی آگ نے تم سے ایک ناجائز کام کرایا ہے۔ تاہم میں اس پر صبر اختیار کرتا ہوں اور اپنے پروردگار سے مدد مانگتا ہوں۔

ادھر حضرت یوسفؑ کنوئیں کی تہ میں بیٹھے تھے اور گہرے اندھیروں نے انھیں اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ اپنے مستقبل کی فکر اور اپنے باپ کی حالتِ زار کا خیال کر کے پریشان ہو رہے تھے۔ انھیں رہ رہ کر اپنے بے قصور ہونے کا احساس ہو رہا تھا اور ان کا دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

اسی دوران میں ایک قافلہ کہ جو مصر جا رہا تھا وہ اس سرزمین پر پہنچا۔ قافلے والوں نے وہاں پڑاؤ ڈال دیا اور اپنے ایک غلام کو پانی لانے کے لیے کنوئیں پر بھیجا۔ غلام نے ڈول کنوئیں میں لٹکایا اور پھر اوپر کھینچا تو دیکھا کہ پانی کی بجائے ڈول کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکا لٹک رہا ہے۔ جس کا چہرہ چاند کا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ اس غلام کی حیرت اور مسرت کی کچھ انتہا نہ رہی اور اس نے بہ آوازِ بلند کہا: آؤ دیکھو کہ یہ ایک لڑکا ہے جسے میں نے کنوئیں میں سے نکالا ہے۔

یہ سنتے ہی قافلے کے لوگ کنوئیں کے کنارے جمع ہو گئے۔ وہ خوف اور پریشانی کے ساتھ یوسفؑ کو دیکھ رہے تھے۔ آخر انھوں نے طے کیا کہ اس لڑکے کو مصر لے جائیں اور غلام بنا کر بیچ دیں۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ ان لوگوں نے یوسفؑ سے ان کی سرگزشت دریافت نہ کی اور انہیں ان کے گھر تک نہ پہنچایا۔ لیکن اگر

وہ عالی ظرف لوگ ہوتے تو سوچتے کہ اس لڑکے کا باپ، ماں اور دوسرے عزیز تو ضرور ہوں گے جو اس کی جدائی میں رو پیٹ رہے ہوں گے لیکن وہ قافلے والے ان لوگوں میں سے تھے جو فقط اپنے نفع کی سوچتے ہیں اور اپنے ہی فائدے کے لیے کام کرتے ہیں۔ ایسے لوگ آج بھی موجود ہیں جو اپنے مفاد کے لیے دوسروں کو تکلیف دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے

بہرحال قافلہ روانہ ہو گیا اور منزلیں طے کرتا ہوا مصر جا پہنچا۔ ان لوگوں نے یوسفؑ کو مصر کے بازار میں کم قیمت پر بیچ ڈالا اور عزیز مصر کہ جس کا نام قوطیفار تھا، اس نے انھیں خرید لیا۔

حضرت یوسفؑ کو عزیز مصر اور اس کے گھر والوں کی نظر میں بڑا بلند مقام حاصل ہو گیا۔ انہیں گھر کے تمام امور نیز غلاموں اور خدمتگاروں پر پورا اختیار حاصل ہو گیا اور ہر کام ان کی مرضی کے مطابق انجام پانے لگا۔ عزیز مصر نے اپنی بیوی سے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ یہ کنعانی جوان بڑا لائق اور شریف ہے۔ تمہیں چاہیے کہ اس کا پورا پورا خیال رکھو اور اس کی خوشی اور آرام کے تمام وسائل مہیا کرو۔ مجھے امید ہے کہ وہ آئندہ ہمارے لیے سودمند ثابت ہو گا یا ہم اسے اپنا بیٹا بنا لیں گے۔

یوسفؑ عزیز کے گھر میں

ابھی حضرت یوسفؑ اپنے پہلے دکھ اور تکلیف کے بعد آرام نہ کر پائے تھے کہ زمانے نے ایک نیا گل کھلایا اور ان کے لیے ایک نئی مصیبت کا باب کھول دیا۔

جب عزیز کی بیوی نے یوسفؑ کا بے پناہ حسن دیکھا تو بے اختیار

ان کے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ چونکہ وہ اس کے گھر میں ہی رہتے تھے' اس لیے جب بھی اس کی نگاہ ان پر پڑتی' اس کے سینے میں عشق کی آگ زیادہ شدت سے بھڑک اٹھتی۔ وہ لاکھ کوشش کرتی کہ اس بات کو اپنے دل اور دماغ سے نکال دے لیکن وہ ایسا نہ کرسکی اور ہر گھڑی یوسفؑ کی یاد میں گم رہتی۔

آخر اسے اپنے دکھ کا مداوا کرنے کے لیے اس کے علاوہ کچھ نہ سوجھا کہ وہ یوسفؑ کا دامن پکڑ لے اور ان سے وصال کی بھیک مانگے چنانچہ ایک مناسب موقع پر جب کہ انہیں خلوت میسر تھی' اس نے اپنے دل کی بات یوسفؑ سے کہہ دی لیکن یوسفؑ کہ جو خاندان نبوت کا جوہر تھے اور جنہوں نے دامنِ عصمت میں پرورش پائی تھی' انھوں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

اگرچہ حضرت یوسفؑ نے بے اعتنائی برتی' تاہم عزیز کی بیوی نے اس بات کو جانے نہ دیا اور حضرت یوسفؑ کی بے توجہی نے اس کے عشق کی آگ اور بھڑکا دی۔ تب اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔

پھر ایک دن جب کہ یوسفؑ محل میں موجود تھے۔ عزیز کی بیوی بھی وہاں آپہنچی۔ اس نے محل کے تمام دروازے بند کرکے حضرت یوسفؑ کے باہر جانے کی راہیں مسدود کردیں اور پھر ان سے وصال کی درخواست کی۔ جب حضرت یوسفؑ نے اپنے آپ کو اس کے چنگل میں گرفتار دیکھا تو وہ محل کے ایک سے دوسرے کمرے کی طرف بھاگنے لگے۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی دروازہ کھول کر باہر نکل جائیں۔ عزیز کی بیوی جوان کا پیچھا کررہی

تھی، اس نے پیچھے سے ان کی قمیض کا دامن پکڑ کر ان کو اپنی طرف کھینچا جس سے حضرت یوسفؑ کی قمیض پیچھے سے پھٹ گئی اور عین اسی وقت عزیزِ مصر محل میں داخل ہوا۔

اس نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ قریب تھا وہ دیوانہ ہو جاتے۔ اس نے محل کے دروازے کے سامنے حضرت یوسفؑ کو پھٹی ہوئی قمیض کے ساتھ آگے اور اپنی بیوی کو عجیب سی حالت میں اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے دیکھا۔

تاہم عزیز کی بیوی نے کسی گھبراہٹ کے بغیر معاملے کو ایک نیا رُخ دیدیا اور حضرت یوسفؑ کو گنہگار ٹھہرانے کی کوشش کی چنانچہ اس نے عزیز کو مخاطب کر کے کہا:

> "اس کنعانی جوان نے احسان فراموش ہونے کا ثبوت دیا ہے اور تمہاری غیر موجودگی میں تمہاری عزت سے کھیلنے کا قصد کیا ہے۔ اب تمہیں بتاؤ کہ جو شخص تمہاری بیوی کے ساتھ زیادتی کرنے کا قصد کرے، اس کی سزا اس کے علاوہ کیا ہو سکتی ہے کہ اسے قید کر دیا جائے یا سخت اذیت دی جائے؟"

پاک دامن یوسفؑ کہ جو ہمیشہ راست گوئی پر کاربند رہے تھے، انہوں نے اس موقع پر بھی حقیقت کا اظہار کیا اور کہا:

اے عزیزِ مصر! اس عورت نے مجھ سے ناجائز فعل انجام دینے کی درخواست کی اور مجھے اپنی طرف کھینچا، لیکن میں اس کی طرف سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہوا اور گناہ کے ارتکاب پر رضامند نہیں ہوا۔

دریں اثنا عزیز کے خاندان میں سے ہی ایک گواہ سامنے آگیا۔ جس نے حضرت یوسفؑ کے حق میں شہادت دی۔ اس نے کہا:

"یوسفؑ کی قمیض کو دیکھو' اگر وہ سامنے سے پھٹی ہے تو یوسف گنہگار ہے اور اگر پیچھے سے پھٹی ہے تو یوسفؑ سچا ہے اور عزیز کی بیوی نے اس پر ناحق تہمت لگائی ہے۔"

تب عزیز مصر نے دیکھا کہ یوسفؑ کی قمیض پیچھے سے پھٹی ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس معاملے میں یوسفؑ کی کوئی خطا نہیں۔ لہٰذا اس نے یوسفؑ کو مخاطب کر کے کہا:

اے یوسفؑ! اس قصے کو یہیں ختم کر دو اور اس موضوع پر کسی سے گفتگو نہ کرو تاکہ لوگ ہمارے بارے میں چہ میگوئیاں نہ کرنے لگیں۔

پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا:

یہ تم عورتوں کے مکر کا کرشمہ ہے' بلاشبہ تمہارا مکر و فریب بہت بڑا ہے۔ جاؤ اور خدا کی بارگاہ میں توبہ و استغفار کرو کہ تم خطاکاروں میں سے ہو۔

یوسفؑ کی بیگناہی پر گواہی

حضرت یوسفؑ اور عزیز مصر کی بیوی کے قصے کے بارے میں شیعوں کا موقف یہ ہے کہ یوسفؑ عالی مرتبت اور پاکباز انبیاء میں سے ہیں۔ جہاں تک پیغمبروں کا تعلق ہے تو وہ گناہ نہیں کرتے اور معصوم ہوتے

ہیں بلکہ ان کے دماغ میں گناہ کا خیال تک پیدا نہیں ہوتا۔چنانچہ اس موقع پر حضرت یوسفؑ کے ذہن میں بھی کوئی ناروا خیال نہیں آیا جیسا کہ سورۂ یوسفؑ کی آیت ۲۴ میں ہے کہ زلیخا نے تو برا ارادہ کر ہی لیا تھا .... تو یہ بھی قصد کر بیٹھتے۔اس میں حضرت یوسفؑ کا ارادہ نہ کرنے کا لولا کے ساتھ مذکور ہونا یوسفؑ کی عصمت اور پاکی کی دلیل ہے۔

"تاہم کچھ نادان اور بے عقل لوگ حضرت یوسفؑ پر گناہ کا ارادہ کرنے کا اتہام لگاتے ہیں حالانکہ قرآن مجید اور روایات کے محکم دلائل ان کے قول کا باطل ہونا ثابت کرتے ہیں۔

ایک مفسر کہتے ہیں: خدائے تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کی بیگناہی کی شہادت دی اور فرمایا ہے:

"یوسفؑ ہمارے با اخلاص بندوں میں سے ہیں"۔

(سورۂ یوسف - آیت ۲۴)

شیطان نے بھی ان کی پاکی پر گواہی دی اور کہا ہے:

"خدایا! میں تیری بزرگی کی قسم کھاتا ہوں کہ میں تیرے با اخلاص بندوں کے علاوہ سب بندوں کو گمراہ کروں گا۔ (سورۂ صٓ - آیت ۸۳-۸۲)

عزیز کے خاندان میں سے بھی ایک گواہ نے ان کی پاکی پر گواہی دی اور کہا:

"اگر یوسفؑ کی قمیض آگے سے پھٹی ہے تو یوسفؑ گنہگار ہے اور اگر پیچھے سے پھٹی ہے تو عزیز کی بیوی کا گناہ ہے"۔ (سورۂ یوسف - آیت ۲۶-۲۷)

مصر کی عورتوں نے بھی ان کی پاکدامنی کا اعتراف کیا اور کہا:

"ہم نے تو یوسفؑ کو کوئی ناجائز کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا"

پھر خود عزیز کی بیوی نے حضرت یوسفؑ کی بے گناہی کا اقرار کیا اور کہا:

"اب حقیقت ظاہر ہو گئی ہے۔ میں یوسفؑ سے متعرض ہوئی اور وہ سچے لوگوں میں سے ہے"

(سورۂ یوسف۔ آیت ۵۱)

جو شخص حضرت یوسفؑ پر تہمت لگاتا ہے، اگر وہ خدا پرست ہے تو اسے ان گواہیوں کی صورت میں خدا کی شہادت کو قبول کر لینا چاہیے، لیکن اگر اس کا تعلق شیطان کے گروہ سے ہے تو پھر شیطان کی گواہی قبول کرلے۔ لیکن دونوں ہی صورتوں میں یوسفؑ کی بے گناہی ثابت ہے اور اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔

مصری بیگمات کی محفل میں

اگرچہ عزیز مصر نے کوشش کی تھی کہ اس کی بیوی کے عشق کا راز افشا نہ ہونے پائے لیکن مصر کے سربر آوردہ اشخاص کی بیگمات کو اس کی بھنک پڑ گئی اور وہ اپنی محفلوں میں اس کی باتیں کرنے لگیں۔ بلکہ بعض نے تو عزیز مصر کی بیوی پر کھلی تنقید شروع کر دی اور وہ اسے لعنت ملامت کرتی تھیں۔

مصری بیگمات کی طرف سے اس سرزنش کی اطلاع عزیز کی بیوی کو بھی ملی۔ اس پر وہ بہت رنجیدہ اور پریشان ہو گئی۔ پھر سوچنے لگی کہ کوئی

ایسی تدبیر کی جائے جس سے وہ عورتیں اس کے سامنے زبان نہ کھول سکیں اور اس کی ہمنوا بن جائیں۔

بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے کسی خاص دن پر اپنے ہاں ایک محفل منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور مصر کی تمام بیگمات کو اس میں شرکت کی دعوت دی۔ جب وہ آئیں اور تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں تو انہیں ایسے پھل پیش کیے گئے جن کو کھانے کے لیے چھری سے کاٹنا پڑتا تھا۔ اس لیے ہر عورت کو ایک چھری دیدی گئی اور عین اس وقت عزیز کی بیوی کے اشارے پر حضرت یوسفؑ اس کمرے میں داخل ہوئے۔

حضرت یوسفؑ کے آتے ہی ان عورتوں کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ وہ ان کا جمال بے مثال دیکھنے میں محو ہو گئیں اور بے خبری میں پھلوں کی بجائے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور کہنے لگیں: یہ انسان نہیں بلکہ ایک بڑی شان والا فرشتہ ہے۔

عزیز مصر کی بیوی اپنی اس کامیابی پر پھولی نہ سماتی تھی، اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ظاہر ہوئی اور اس نے کہا: یہ وہی یوسفؑ ہے جس کے عشق پر تم مجھے ملامت کرتی رہی ہو۔ تم نے اسے ایک بار، ہاں ایک ہی بار دیکھا ہے اور اپنے ہاتھ کاٹ لیے ہیں۔ لیکن میں نے مختلف اوقات میں اس کا اٹھنا بیٹھنا اور سونا جاگنا، سب دیکھا ہے۔ کیونکہ وہ میرے گھر میں رہتا ہے۔ اس لیے میں اس کے سامنے اپنا دل ہار بیٹھی ہوں اور اس سے وصل کی طالب ہوئی ہوں۔ تاہم اس نے پاکدامنی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے اور وہ مجھ سے منہ موڑے رہتا ہے۔ وہ اپنی ملکوتی روح کے ساتھ فقط اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور پاکدامنی کی حد سے آگے قدم نہیں بڑھاتا

اس کے باوجود بھی میں اس سے بڑا اچھا سلوک کرتی ہوں اور اگر وہ میری بات نہیں مانے گا تو اسے قید کر دیا جائے گا۔

وہ دن گزر گیا تو عزیز مصر کی بیوی پھر سے یوسفؑ کو رام کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں حتیٰ کہ وہ بالکل نا امید ہو گئی۔ حضرت یوسفؑ بھی اس مصیبت کے ہاتھوں سخت پریشان تھے۔ وہ عورتوں اور بالخصوص عزیز کی بیوی کے شر سے خدا کی پناہ مانگتے تھے۔ بلا شبہ ایک مومن ہر حالت میں خدا کی پناہ مانگتا ہے اور اسی سے مدد طلب کرتا ہے۔

چنانچہ حضرت یوسفؑ نے بارگاہِ الٰہی میں اپنے ہاتھ پھیلائے اور کہا:

اے پروردگار! قید خانے کا اندھیرا اور تکلیف برداشت کرنا میرے لیے اس مصیبت سے آسان ہے اور اگر تو مصر کی عورتوں اور عزیز مصر کی بیوی کا شر مجھ سے دور نہ کر دے تو خطرہ میرے نزدیک پہنچ جائے گا۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ میں گناہ کے گڑھے میں جا گروں اور میرا نام جاہلوں کی فہرست میں شامل ہو جائے۔

خدائے تعالیٰ نے یوسفؑ کی دعا قبول فرمائی اور انھیں اس بہت بڑے فتنے سے نجات بخشی۔

یوسف قید خانے میں

جب عزیز مصر کی بیوی یوسفؑ کی طرف سے مایوس ہو گئی، تو اپنے شوہر سے ان کی شکایت کی اور کہنے لگی: یوسفؑ نے مجھے مصر کی عورتوں میں بدنام کر دیا ہے اور میری آبرو اور وقار کو بٹہ لگا دیا ہے۔ اگر تم میری کھوئی ہوئی عزت مجھے واپس دلانا چاہتے ہو تو اسے قید کر دو اور میرے دامن پر لگا ہوا داغ دھو ڈالو۔

اگرچہ عزیز مصر نے حضرت یوسفؑ کی پاکیزگی کا ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور ان کی قمیض کے بارے میں گواہی بھی سُن لی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی بیوی کے بہکاوے میں آگیا اور اس نے بے گناہ یوسفؑ کو قید خانے میں ڈال دیا۔

جس دن حضرت یوسفؑ کو قید خانے میں لے جایا گیا۔ اسی دن بادشاہ کے دو نوجوان درباری بھی قید میں ڈالے گئے۔ ان میں سے ایک بادشاہ کا ساقی اور دوسرا باورچی تھا۔ ان پر الزام یہ تھا کہ وہ بادشاہ کو زہر دے دینا چاہتے تھے۔

دوسرے دن وہ قیدی ساقی حضرت یوسفؑ کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں بادشاہ کے لیے انگور کا رس نچوڑ رہا ہوں۔ پھر اس کے ساتھی نے کہا کہ میں نے بھی خواب میں دیکھا ہے کہ میں نے کچھ روٹیاں سر پہ اٹھا رکھی ہیں اور پرندے ان کو نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ تب انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی اور کہا: تم ہمیں نیک آدمی نظر آتے ہو اور تمھارے

چہرے پر بزرگی کے آثار نمایاں ہیں۔

جب حضرت یوسفؑ نے دیکھا کہ یہ دو آدمی ان کی باتیں سننے پر آمادہ ہیں تو انھوں نے وقت کو غنیمت سمجھا اور قید خانے کے اندر ہی دینِ حق کی تبلیغ شروع کر دی۔ انہوں نے فرمایا: میں تمھارے خوابوں کی تعبیر تمہارا کھانا آنے سے پہلے پہلے بتا دوں گا۔ یہ علم بھی ان علوم میں سے ہے جن کی تعلیم خدا نے مجھے دی ہے اور مجھے خوابوں کی تعبیر سے آگاہ کر دیا ہے۔ کیونکہ میں نے ان لوگوں کے دین سے منہ پھیر لیا ہے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے اور قیامت کے منکر ہیں۔ میں اپنے آباؤ اجداد یعنی حضرت ابراہیمؑ ــــ حضرت اسحٰقؑ اور ــــ حضرت یعقوبؑ کے دین کا پیرو ہوں اور ہمارے لیے یہ درست نہیں کہ ہم کسی کو خدائے تعالیٰ کا شریک قرار دیں۔

اے میرے ساتھیو! تمھیں انصاف کرو کہ کیا یہ مختلف معبود اور بے مایہ بت بہتر ہیں یا خدائے واحد و قہار بہتر ہے؟

یہ بت جن کی پرستش تم کرتے ہو، صرف نام کے خدا ہیں کہ تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے ان کا نام خدا رکھ دیا ہے لیکن خدا کی طرف سے ان کی حقانیت کی کوئی دلیل نازل نہیں ہوئی۔

یہ چند جملے کہنے کے بعد حضرت یوسفؑ نے اپنی گفتگو جاری رکھی اور ان دونوں کے خوابوں کی تعبیر بیان کرتے ہوئے کہا:

اے میرے ساتھیو! تم میں سے جس نے یہ خواب دیکھا ہے کہ وہ انگوروں کو نچوڑ رہا ہے۔ اس کے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ جلد ہی اس کی آزادی کا حکم صادر ہو گا اور وہ

اپنے عہدے پر بحال ہو جائے گا اور جس نے خواب میں دیکھا ہے کہ وہ سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہے اس کے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ جلد ہی اسے سزائے موت دے دی جائے گی۔ وہ سولی پر لٹکا دیا جائے گا اور پرندے اس کا مغز نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ یہی ہے ان خوابوں کی تعبیر جو تم نے مجھ سے بیان کیے ہیں۔

پھر حضرت یوسفؑ کو خیال آیا کہ یہ ساقی کہ جو جلد ہی رہا ہو کر شاہی دربار میں جانے والا ہے، کیوں نہ وہ اس کے ذریعے سے اپنی رہائی کی صورت پیدا کریں۔ لہٰذا انھوں نے اسے مخاطب کر کے کہا:

جب تم شاہی دربار میں پہنچو تو بادشاہ کو میرے بارے میں بتانا اور میری بے گناہی کا ذکر کرنا۔ شاید وہ مجھے قید سے رہا کر دے۔

ان دونوں اشخاص کے خوابوں کی جو تعبیر حضرت یوسفؑ نے بتائی تھی وہ اسی طرح پوری ہوئی۔ یعنی ان میں سے ایک کو قید سے رہائی ملی اور دوسرا سولی پر لٹکا دیا گیا لیکن افسوس ہے کہ وہ ساقی حضرت یوسفؑ کو بھول گیا اور انھیں مزید کئی سال قید خانے ہی میں گزارنے پڑے۔

قید سے آزادی اور نجات

ایک صبح کو جب بادشاہ نیند سے بیدار ہوا تو ایک خواب جو اس نے دیکھا تھا اس سے وہ سخت پریشان نظر آ رہا تھا۔ قوم کے

علماء، رؤسا کو دربار میں طلب کیا گیا اور اس نے اپنا خواب ان سے یوں بیان کیا:

میں نے خواب میں دیکھا کہ سات موٹی تازی اور خوبصورت گائیں ندی سے نکلیں اور ایک سبزہ زار میں چرنے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد سات کمزور اور بدشکل سی گائیں پانی سے باہر آئیں اور وہ پہلی سات گایوں کو کھا گئیں۔ پھر میں نے گندم کی سات ہری اور سات سوکھی بالیاں دیکھیں۔

خواب بیان کرنے کے بعد بادشاہ نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا: اب تم لوگ مجھے بتاؤ کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہے؟

علماء نے بہت غور و خوض کیا لیکن انھوں نے خود کو اس خواب کی تعبیر سے عاجز پایا اور کہنے لگے: جو کچھ آپ نے دیکھا ہے وہ آپ کی دماغی پریشانی کا نتیجہ ہے اور ہم اس قسم کے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔

تاہم بادشاہ کا خواب ایک وسیلہ تھا جو خدا نے حضرت یوسفؑ کی رہائی کے لیے فراہم کیا تھا۔ چنانچہ اس خواب نے اس ساقی کو یوسفؑ کی یاد دلا دی اور اسے برسوں پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔ وہ فوراً بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: بادشاہ سلامت! آپ کے قید خانے میں ایک عالی ظرف، روشن خیال اور دانشمند شخص موجود ہے جو خواب کی تعبیر بتانے میں ماہر ہے۔ آپ مجھے قید خانے تک جانے دیں تاکہ میں اس سے آپ کے خواب کی تعبیر پوچھ آؤں۔

وہ ساقی بادشاہ سے اجازت لیکر قید خانے میں آیا حضرت یوسفؑ سے ملا اور کہنے لگا: اے راستگو یوسفؑ! آپ مجھے بتائیں کہ اگر خواب میں یوں دیکھا جائے کہ سات کمزور گائیں، سات موٹی تازی گایوں کو کھا گئیں اور پھر گندم کی سات ہری اور سات خشک بالیاں نظر آئیں تو اس کی تعبیر کیا ہے؟ تم مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ تاکہ میں قوم کی طرف لوٹ جاؤں اور انھیں اس سے باخبر کروں!

حضرت یوسفؑ خدا کے ایک برگزیدہ پیغمبر تھے اور انہیں لوگوں کے دین اور دنیا کے معاملات کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا تھا۔ پس انھوں نے بادشاہ کے خواب کی تعبیر بیان کرنے کے علاوہ لوگوں کے لیے نجات اور خوش بختی کے راستے کی طرف رہنمائی بھی کر دی اور فرمایا:

مصر میں سات سال تک فصلیں بہت اچھی ہوں گی اور لوگوں کو بہت سا غلہ حاصل ہو گا۔ اس کے بعد سات سال قحط اور سختی کے ہوں گے جن میں پہلے سالوں کا بچایا ہوا غلہ کام آئے گا اور لوگ بے حد پریشانی سے دوچار ہونگے۔ اس کے پیش نظر تمہیں چاہیے کہ پہلے سات سالوں میں کھیتی باڑی کو وسعت دو اور زیادہ سے زیادہ غلہ اگانے کی کوشش کرو۔ اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق صرف کرو اور بقایا کو بالیوں کی شکل میں ذخیرہ کر لو تاکہ خشک سالی اور قحط کے دنوں میں اسے کام میں لاسکو۔

ساقی فوراً ہی بادشاہ کے پاس آپہنچا اور اس کے خواب کی یہ تعبیر اسے بتائی۔

اپنے خواب کی یہ تعبیر سن کر بادشاہ کا چہرہ کھل اٹھا اور اسکا رنج و غم زائل ہو گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ تعبیر اس کے خواب کے عین مطابق ہے۔ جو کسی بہت ہی عقلمند آدمی نے بیان کی ہے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا: یوسفؑ کو میرے پاس لے آؤ تاکہ میں زندگی کی پریشانیوں اور مشکلات میں اس سے مدد لے سکوں اور اس کے نظریات سے فائدہ اٹھاتا رہوں۔

اس پر شاہی نمائندے حضرت یوسفؑ کو رہائی دلانے کے لیے قید خانے پہنچے، لیکن انھوں نے رہائی حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ اس وقت ان کے لیے آزادی کی بڑی اہمیت تھی کیونکہ وہ سالہا سال سے قید خانے کی گھٹی گھٹی فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک عرصے سے انھوں نے کھلے آسمان میں سورج۔ چاند اور ستاروں کو نہیں دیکھا تھا۔ کبھی آرام کی نیند نہیں سوئے تھے اور کبھی ڈھنگ کا کھانا نہیں کھایا تھا، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے کہ انہیں معافی کے طور پر قید خانے سے رہا کر دیا جائے۔ انھوں نے کہا:

میں اس وقت تک قید خانے سے باہر نہیں آؤں گا جب تک بادشاہ میرے بارے میں تحقیقات نہ کرلے۔ میری مسل نہ پڑھ لے اور میری بیگناہی اس پر ثابت نہ ہو جائے۔ بادشاہ سے کہہ دو کہ وہ مصری عورتوں سے یہ دریافت کرے کہ انھوں نے اپنے ہاتھ کیوں کاٹے اور مجھے کیوں تنگ کیا تھا؟

شاہی نمائندے دوبارہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسے صورتِ حال سے مطلع کیا۔ بادشاہ نے مصر کی عورتوں ــــ جن کے نام شاید

حضرت یوسفؑ نے بتائے تھے، اپنے پاس بلایا اور ان سے ہاتھ کاٹنے کے بارے میں پوچھا۔ تب ان عورتوں کو حقیقت کا اعتراف کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہ آیا اور انہوں نے متفقہ طور پر گواہی دی کہ یوسفؑ بے گناہ ہے۔ عزیزِ مصر کی بیوی نے بھی اپنے گناہ اور یوسفؑ کی بے گناہی کا اقرار کر لیا اور یوں حضرت یوسفؑ عزت و آبرو کے ساتھ قید خانے سے باہر آئے۔

یوسفؑ مصر کے دربار میں

بادشاہ بڑے اشتیاق کے ساتھ حضرت یوسفؑ کو دیکھنے کا منتظر تھا۔ جب کچھ دیر گزری تو آپ دربار میں آپہنچے۔

بادشاہ نے آپ سے بڑی دیر تک باتیں کیں اور انہیں عقلمند روشن دماغ اور قابل پایا۔ تب اس نے کہا:

اے یوسفؑ! ہمارے دل میں تمہاری بڑی عزت ہے اور ہم تم پہ پورا پورا بھروسہ کرتے ہیں۔ تم جو عہدہ بھی پسند کرو ہم تمہیں اس پر تعینات کر دیں گے۔

حضرت یوسفؑ نے جواب دیا:

آپ مجھے امورِ خوراک اور محکمہ مال کا ناظر مقرر کر دیں۔ کیونکہ میں یہ کام خوش اسلوبی سے انجام دے سکتا ہوں۔

بادشاہ نے فرمان جاری کیا کہ یہ عہدہ یوسفؑ کو سپرد کیا جائے۔ نیز درباریوں اور اہل کاروں کو حکم دیا کہ وہ یوسفؑ کے احکام کی تعمیل کریں اور ان کے حکم کو شاہی حکم سمجھیں۔

اب حضرت یوسفؑ اپنے فرائض منصبی کو انجام دینے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ دریائے نیل چند سال تک تو لوگوں کی زمینیں اچھی طرح سیراب کرتا ہے لیکن پھر اچانک ہی اس کے پانی میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور خشک سالی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے طے کیا کہ موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور لوگوں کو آئندہ سالوں میں رونما ہونے والے قحط اور تکلیفوں سے نجات دلا دی جائے۔

چنانچہ آپ نے مملکت مصر کے مختلف علاقوں کا ایک طوفانی دورہ کیا تاکہ حالات سے واقفیت پیدا کریں اور کام کاج کے لیے ضروری وسائل فراہم کر سکیں۔ اس دورے میں انہوں نے جو زرخیز علاقے دیکھے' وہاں کے کاشتکاروں کو معقول رقم فراہم کر دی۔ تاکہ وہ اپنی زراعت کو وسعت اور ترقی دے سکیں اور پیداوار میں اضافہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بڑے بڑے گودام تعمیر کرائے کہ جن میں سے ہر ایک میں سیکڑوں من غلہ ذخیرہ کرنے کی گنجائش تھی۔

پہلے سات سالوں میں حضرت یوسفؑ نے لوگوں کی ضرورت کے مطابق انہیں غلہ مہیا کیا اور جو باقی بچا اسے گوداموں میں ڈال دیا۔ اس طرح گودام غلے سے بھر گئے اور ادھر قحط کے سال بھی آ پہنچے۔ دریائے نیل میں پانی کی کمی واقع ہو گئی اور کھیتیاں سوکھ گئیں۔ تاہم حضرت یوسفؑ کی عاقلانہ پیش بینی کی بدولت لوگوں کو خوراک کے بارے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کیونکہ سرکاری گوداموں میں ان کی ضرورت کے مطابق بلکہ اس سے بھی زیادہ غلہ موجود تھا۔

مصر کے قحط نے رفتہ رفتہ ہمسایہ ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس کا دائرہ فلسطین اور کنعان تک وسیع ہوگیا، جہاں حضرت یعقوبؑ اوران کے فرزند سکونت پذیر تھے۔ اس وقت ہر جگہ عزیز مصر (حضرت یوسفؑ) کا نام وردِ زبان تھا اور انھوں نے مملکت مصر کی جو خدمت انجام دی تھی سبھی اس کی تعریف کر رہے تھے۔ مصر کے ہمسایہ ممالک کے لوگ بھی یہی کہتے تھے کہ مصر کا نظام حکومت ایک قابل وزیر کے ہاتھوں میں ہے اور اس کی خوش تدبیری کی بدولت مصر ایک سخت قحط سے بچ گیا ہے۔ وہ ایک بلند فطرت اور کریم النفس انسان ہے جو سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا ہے اور سب کو غلہ مہیا کرتا ہے۔

یہ باتیں سن کر حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور کہا:

میرے بیٹو! اب ہم قحط اور تکلیف سے دوچار ہیں۔
تم سفر کی تیاری کرو اور عزیز مصر کے پاس جاؤ کہ جس کی
کریم النفسی کی ہر جگہ تعریف ہو رہی ہے لیکن بنیامین
کو میرے پاس چھوڑتے جاؤ کہ تمہاری جدائی مجھ پر شاق
نہ گزرے اور تنہائی کی وجہ سے میں اداس نہ ہو جاؤں۔

حضرت یوسفؑ کے بھائی اپنے اونٹ لے کر مصر روانہ ہو گئے۔ تاکہ وہاں سے غلہ خرید کر کنعان لے آئیں۔

یوسفؑ کے بھائی مصر میں

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کنعان اور مصر کی درمیانی مسافت طے کی اور مصر آ پہنچے۔ جب وہ غلہ خریدنے کے لیے یوسفؑ کی خدمت میں

حاضر ہوئے تو حضرت یوسفؑ نے انھیں پہچان لیا، لیکن وہ ان کو نہ پہچان سکے کیونکہ انہیں یہ یقین نہ تھا کہ یوسفؑ ابھی زندہ ہیں۔ اس کے علاوہ یوسفؑ کے چہرے بشرے میں کچھ تبدیلیاں بھی آچکی تھیں۔

حضرت یوسفؑ اپنے بھائیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ ان کا سگا بھائی (بنیامین) ان کے ساتھ نہیں ہے تو وہ افسردہ خاطر ہو گئے۔ انہوں نے صدق دل سے بھائیوں کا استقبال کیا اور انہیں مہمان کے طور پر اپنے پاس ٹھہرایا۔ اس اثنا میں آپ نے ان سے یہ بھی کہا کہ تم لوگ ہمیں اپنا تعارف کرادو۔

تب انہوں نے بتایا کہ ہم بارہ بھائی ہیں جو پیغمبر عالی مقام حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اس وقت ہم دس آپ کے سامنے موجود ہیں اور آپ کی عنایت کے امیدوار ہیں۔ ہمارا ایک بھائی ہمارے والد بزرگوار کی خدمت کے لیے ان کے پاس رہ گیا ہے۔ اب رہا بارہواں تو بہت عرصہ پہلے وہ گم ہو گیا تھا۔ سالہا سال سے ہمیں اس کے بارے میں کوئی علم نہیں کہ وہ کہاں ہے!

بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے والد بزرگوار اور پیارے بھائی کی خیر خبر سن کر بڑا اطمینان ہوا۔ تب انھوں نے حکم دیا کہ ان کے بھائیوں کو گندم دیدی جائے۔ علاوہ ازیں جو رقم ان کے بھائی لائے تھے وہ بھی خفیہ طور پر ان کی بوریوں میں رکھ دی۔ حضرت یوسفؑ نے یہ عمل اس مقصد سے انجام دیا تاکہ ان کے بھائی جلدی مصر آجائیں اور رقم کا انتظام کرنے میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔

پھر بوریاں اونٹوں پر لاد دی گئیں اور یوسفؑ کے بھائی

واپس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس موقع پر آپ نے ان سے کہا: جب تم دوبارہ مصر آؤ تو اپنے چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ لیتے آنا تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے کہ جو کچھ تم نے بتایا، وہ واقعی درست ہے لیکن اگر تم اسے ساتھ نہ لائے تو تمہیں غلہ نہیں ملے گا اور پھر تم کبھی بھی میرے پاس آنے کا قصد نہ کرنا۔ انھوں نے جواب دیا: اس بارے میں ہم اپنے والد بزرگوار سے بات کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اس بات کو مان لیں گے اور ہم اس چھوٹے بھائی کو ساتھ لا سکیں گے۔

حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو الوداع کہا اور وہ خوش خوش کنعان لوٹ گئے۔ جب وہ اپنے باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کہنے لگے:

> بابا جان! جیسا کہ عزیز مصر کے بارے میں مشہور تھا، ہم نے اسے بڑا عالی ظرف اور شریف انسان پایا ہے۔ اس نے ہماری بڑی عزت کی۔ ہمارا ہر طرح خیال رکھا اور اس نے ہمیں بہت سا غلہ دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ہم سے یہ وعدہ بھی لے لیا ہے کہ اب کے ہم اپنے چھوٹے بھائی بنیامین کو بھی اپنے ساتھ لیکر آئیں تاکہ وہ اس بات کو جان لے کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ درست ہے۔ تاہم ہمارا مصر کا سفر غلہ حاصل کرنے کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے نہیں تھا۔

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا: میں تمہیں بنیامین کو ساتھ لے جانے کی اجازت ہرگز نہ دوں گا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ جو کچھ تم نے یوسفؑ کے

ساتھ کیا تھا اس کے ساتھ بھی وہی کرو؟ نہیں! بس تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور مجھے مجبور نہ کرو۔

پھر انھوں نے غلے کی بوریاں کھولیں اور دیکھا کہ جو رقم وہ گھر سے لے کر گئے تھے وہ بھی غلے میں رکھ دی گئی ہے۔ وہ خوش خوش باپ کے پاس آئے اور کہنے لگے: بابا جان! ہم نے غلط نہیں کہا تھا۔ ذرا عزیز مصر کی عالی ظرفی تو دیکھیے کہ اس نے ہماری ادا کی ہوئی رقم بھی اپنے پاس نہیں رکھی اور مخفی طور پر ہمیں واپس کردی ہے۔ لہٰذا آپ خوفزدہ مت ہوں اور ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں۔ ہم دل و جان سے اس کی حفاظت کریں گے اور اسے صحیح سلامت آپ کے پاس واپس لے آئیں گے۔

حضرت یعقوبؑ نے دیکھا کہ ان کے بیٹوں کو غلے کی ضرورت ہے اور وہ مصر جانے کے لیے بے چین ہیں۔ علاوہ ازیں وہ عزیز مصر سے وعدہ کر چکے ہیں کہ اپنے بھائی کو اپنے ساتھ لائیں گے۔ ان حالات کے پیش نظر انھوں نے ان کو اجازت دیدی کہ وہ بنیامین کو اپنے ساتھ مصر لے جائیں۔ تاہم انھوں نے ان سے وعدہ لیا کہ بنیامین کو بحفاظت واپس لے آئیں گے، بجز اس کے کہ کوئی ایسا ناگہانی حادثہ پیش آجائے۔ جس سے ان کے لیے بنیامین کی حفاظت کرنا ممکن نہ رہے۔ سب بھائیوں نے اس عہد پر خدا کو گواہ ٹھہرایا اور بنیامین کو ہمراہ لے کر مصر روانہ ہوگئے۔ حضرت یعقوبؑ نے انہیں ہدایت کی کہ مصر پہنچنے پر وہ سب کے سب ایک دروازے سے نہیں بلکہ بٹ کر مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہوں۔ یہ ہدایت کرنے سے شاید ان کے پدر بزرگوار کا مقصد

یہ تھا کہ ان کے بیٹے لوگوں کی چشم بد سے محفوظ رہیں اور شاید وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز نہ بنیں۔ تاکہ ان کے بارے میں اس قسم کی غلط رائے قائم نہ کر لی جائے کہ یہ جاسوس ہیں یا چوری کرنے یا ڈاکہ ڈالنے کی غرض سے مصر آئے ہیں۔

بہرحال حضرت یوسفؑ کے بھائی مصر پہنچے' ان سے دوسری بار ملاقات کی اور اپنے بھائی بنیامین کو ان کے سامنے پیش کیا۔ حضرت یوسفؑ اپنے اس بھائی کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور غلاموں کو حکم دیا کہ وہ دوپہر کے لیے نسبتاً زیادہ کھانا تیار کریں تاکہ سبھی مل کر کھائیں۔

دوپہر کے وقت حضرت یوسفؑ اپنے بھائیوں کو گھر لے گئے اور انہیں دو دو کر کے دسترخوان پر بٹھا دیا۔ بنیامین اکیلا رہ گیا تو بے اختیار رو دیا اور کہنے لگا: اگر آج میرا بھائی یوسفؑ زندہ ہوتا تو میں اکیلا نہ رہتا۔ یوسفؑ نے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ جب رات ہو گئی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے دو دو بھائیوں کو ایک ایک کمرے میں سلایا اور بنیامین کو اپنے پاس رکھا اور کہا: کیا تم اس بات کو پسند کرو گے کہ یوسفؑ کی جگہ میں تمہارا بھائی بن جاؤں؟ بنیامین نے جواب دیا: آپ جیسا بھائی کہاں مل سکتا ہے! لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ آپ یعقوبؑ اور راحیل کے بیٹے نہیں ہیں۔ تب حضرت یوسفؑ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے بنیامین کو سینے سے لگا لیا اور کہا: میں ہی تمہارا گمشدہ بھائی یوسفؑ ہوں جس کی جدائی میں تم غمگین رہتے ہو۔ وہ میں ہی ہوں کہ جس نے بھائیوں کے ہاتھوں دکھ اٹھائے اور پھر کئی ناکامیوں کا منہ دیکھا۔ لیکن خدائے تعالیٰ نے مہربانی فرما کر میری

تکلیفیں دور کیں اور مجھے اس رتبے پر پہنچا دیا۔ تاہم تمہیں یہ بات ان بھائیوں سے پوشیدہ رکھنی چاہیے۔

بنیامین کو روکنے کی تدبیر

مہمانداری کے دن ختم ہو گئے اور حضرت یوسفؑ کے بھائی غلہ خریدنے کے بعد واپس جانے کو تیار ہو گئے۔ حضرت یوسفؑ نے بنیامین کو اپنے پاس رکھنے کے لیے ایک تدبیر سوچی اور غلاموں کو حکم دیا کہ پانی پینے کا ایک کٹورا بنیامین کی بوری میں ڈال دیں۔ جب قافلہ کچھ دور نکل گیا تو حضرت یوسفؑ کے ایک اہلکار نے آواز دی:

> اے کنعان والو! رک جاؤ۔ تم کتنے برے لوگ ہو جنہوں نے نیکی کا بدلہ بدی سے دیا اور عزیز کا احسان فراموش کر کے اس کا کٹورا چرا لیا۔

حضرت یعقوبؑ کے غیور بیٹے یہ آواز سن کر جہاں تھے وہیں کے وہیں جم کر رہ گئے اور کہنے لگے: خدا کی قسم! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم شرارت کی نیت سے یہاں نہیں آئے تھے اور ہم چور نہیں ہیں۔ اہلکار نے پوچھا: اگر تم میں سے کسی نے کٹورا چرایا ہو تو اس کی سزا کیا ہوگی؟ انھوں نے جواب دیا: ہمیں اپنی بے گناہی کا یقین ہے اور ہم ایک ایسے دین اور قانون کے پیرو ہیں جس کے مطابق تم لوگ وہ کٹورا چرانے والے شخص کو گرفتار کر کے اپنا غلام بنا سکتے ہو۔

اس گفتگو کے بعد اونٹوں پر سے بوریاں اتاری گئیں اور ان کی جانچ پڑتال شروع ہو گئی۔ پہلے اور بھائیوں کی اور پھر بنیامین کی

بوریوں کی تلاشی لی گئی۔ تب وہ سونے کا کٹورا بنیامین کی بوری سے نکل آیا۔
وہ سب بھائی شہر کو لوٹ آئے اور انتہائی رنج وغم کے عالم میں حضرت یوسفؑ کے سامنے پیش ہوئے۔ پہلے تو یوسفؑ نے انھیں ڈانٹ ڈپٹ کی اور پھر کہا: تمہارے ہی قول کے مطابق ہم بنیامین کو اپنے پاس رکھیں گے۔ اس پر سارے بھائی منت سماجت کرتے ہوئے کہنے لگے:

اے عزیز مصر! اس کا باپ بوڑھا اور کمزور ہے۔ آپ ہم میں سے کسی ایک کو اپنے پاس رکھ لیں اور اسے آزاد کر دیں۔

حضرت یوسفؑ نے کہا:

یہ ناممکن ہے کہ ہم ایک چور کی بجائے کسی بے گناہ شخص کو پکڑ لیں۔ کیونکہ اگر ہم ایسا کریں گے تو ایک مظلوم پر ظلم روا رکھیں گے۔

اب بھائیوں نے بنیامین کو جس نے انہیں اس مصیبت میں پھنسا دیا تھا، خشم آلود نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگے: اگر اس نے چوری کی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس کا ایک بھائی تھا، اس سے پہلے اس نے بھی چوری کی تھی۔ اس سے ان کا مقصد حضرت یوسفؑ کی چوری کے معاملے کی طرف اشارہ کرنا تھا اور وہ قصہ یوں ہے:

حضرت یوسفؑ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ان کی والدہ انتقال کر گئیں۔ ان کی پھوپھی انہیں اپنے گھر لے گئیں اور ان کی پرورش کرنے لگیں۔ جب وہ ذرا بڑے ہو گئے تو حضرت یعقوبؑ نے انھیں پھوپھی کے ہاں سے اپنے گھر لے آنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن حضرت یوسفؑ کی پھوپھی جو انہیں بے حد چاہنے لگی تھیں ان کی جدائی برداشت نہ کر سکیں۔ انھوں نے ایک کمر بند

حضرت یوسفؑ کی کمر میں باندھ دیا اور انھیں حضرت یعقوبؑ کے گھر بھیج دیا۔ بعد میں آکر کہنے لگیں کہ یوسفؑ میرے گھر سے کمر بند چرا لایا ہے۔ چنانچہ ان کی تلاشی لے کر کمر بند برآمد کر لیا۔ پھر اپنے مذہبی قوانین کے مطابق حضرت یوسفؑ کو اپنے گھر لے گئیں تاکہ وہ چوری کی سزا کے طور پر ایک مدت تک ان کی خدمت کریں۔

بھائیوں نے غصے کی حالت میں اس بات کی جانب اشارہ کیا تو حضرت یوسفؑ نے بھی ان کی بات سن لی۔ لیکن انہوں نے اپنے چہرے سے اس پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ تاہم دل ہی دل میں کہا: تم اس سے بدتر ہو اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو خدا اس سے واقف ہے۔

بالآخر بھائی بنیامین کی رہائی سے ناامید ہو گئے اور انہوں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ان کے بڑے بھائی (یہودا) نے کہا: کیا تم بھول گئے ہو کہ تمہارے باپ نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ تم بنیامین کو اس کے پاس واپس لاؤ گے۔ خدا کی قسم! جب تک میرا باپ اجازت نہ دے یا خدا میرے حق میں حکم نہ دے میں مصر سے باہر قدم نہیں رکھوں گا۔ تم کنعان جاؤ اور باپ سے کہہ دو کہ بنیامین نے چوری کی ہے اور عزیز مصر نے اسے اپنا غلام بنا لیا ہے۔ جی ہاں! یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے سب نے دیکھا ہے اور ہم جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔

پھر دوسرے بھائی تو واپس کنعان چلے گئے لیکن یہودا اور بنیامین مصر میں ہی رہ گئے۔ حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹوں سے مل کر بہت خوش ہوئے لیکن یہ خوشی عارضی تھی کیونکہ بنیامین انہیں نظر نہ آیا۔ انہوں نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو بھائیوں نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ یہ

قصہ سن کر حضرت یعقوبؑ کے ہوش جاتے رہے اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی روح بدن سے نکلی جا رہی ہے۔ انہوں نے بیٹوں کی بات کا یقین نہ کیا اور یہ سمجھے کہ انہوں نے بنیامین کے ساتھ بھی کوئی ایسی ہی چال چلی ہے، جیسی یوسفؑ کے بارے میں تھی۔ جس کے غم میں انکی بصارت جاتی رہی تھی۔ تب یوسفؑ کی یاد میں ان کے دکھی دل سے ایک دردناک آہ نکلی۔

چند سے سکون ہوا تو حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو مصر جا کر یوسفؑ اور ان کے بھائی کو تلاش کرنے کی ترغیب دی۔ آپ نے انھیں ناامید ہونے سے روکا اور فرمایا: خدا کی رحمت سے مایوس مت ہو اور اپنے کھوئے ہوئے بھائیوں کے پیچھے جاؤ۔

باپ کے حکم کے مطابق حضرت یوسفؑ کے بھائی مصر روانہ ہو گئے اور پھر تیسری مرتبہ عزیز مصر کے سامنے حاضر ہوئے۔ انہوں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے بڑے رقت آمیز لہجے میں کہا:

> اے عزیز مصر! ہم اور ہمارا خاندان شدید تکلیف اور پریشانی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ہم تھوڑی سی رقم لے کر آپ کے پاس آتے ہیں۔ آپ ہمیں زیادہ غلہ دے کر ہم پر احسان کیجیے اور ہمارے بھائی کو رہا کر دیجیے کہ خدا نیکوکاروں کو بے حساب بدلہ دیتا ہے۔

حضرت یوسفؑ نے انہیں وہ بدسلوکی یاد دلائی جو انہوں نے خود ان سے کی تھی اور کہا: کیا تمہیں یاد ہے کہ اس سے پہلے تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کتنی زیادتی کی؟ تم نے ان کے درمیان جدائی

ڈال دی اور انہیں فراق کی آگ میں جلایا۔ حضرت یوسفؑ نے یہ الفاظ شاید کنعانیوں اور خود اپنے بھائیوں کی زبان میں کہے تھے۔ اس لیے انھوں نے انھیں پہچان لیا اور کہا: کیا تم یوسفؑ ہو؟

حضرت یوسفؑ نے جواب دیا: ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ دیکھ لو کہ خدا نے ہم پر احسان کیا ہے۔ بے شک جو شخص بھی پرہیزگاری کو اپنا شعار بنائے اور زندگی میں پیش آنے والی مشکلات اور تکالیف کے مقابلے میں صبر اختیار کرے تو خدا ایسے نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

بھائیوں نے شرم کے مارے سر جھکا لیے اور اپنے کیے پر معافی مانگنے لگے۔

حضرت یوسفؑ نے کہا: تمھیں ڈرنے کی ضرورت نہیں، امید ہے کہ خدا تمہارا یہ گناہ بخش دے گا۔ اب تم میری یہ قمیض لے کر والد بزرگوار کے پاس جاؤ اور ان کے چہرے سے مس کرو تاکہ ان کی آنکھیں بینا ہوجائیں، پھر تم سب کے سب میرے پاس چلے آؤ۔

ملاقات

کنعانی بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کی قمیض لی اور بڑی تیز رفتاری سے کنعان کی جانب روانہ ہوگئے۔ ان کا قافلہ ابھی مصر کے دروازے سے نکلا ہی تھا کہ حضرت یعقوبؑ نے کنعان میں اپنے پاس موجود لوگوں سے کہا: میں یوسفؑ کی بُو سونگھ رہا ہوں۔ ہاں! جس باپ نے اپنے بیٹے کے فراق میں سالہا سال تک آنسو بہائے تھے، اس نے حضرت یوسفؑ کی بو سونگھ لی اور اپنے پاس موجود لوگوں کو اس کی خبر بھی دیدی۔ لیکن

وہ کہنے لگے: خدا کی قسم! آپ ابھی تک اس مغالطے میں ہیں کہ یوسفؑ زندہ ہے، حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ بشیر آپہنچا۔ اس نے حضرت یوسفؑ کی قمیض حضرت یعقوبؑ کے سر پر ڈال دی۔ جس کے اثر سے ان کی آنکھیں روشن ہوگئیں اور ان کے بدن میں تازہ قوت آگئی۔

پھر حضرت یعقوبؑ اور ان کے اہل خاندان نے مصر جانے کا ارادہ کیا اور یوسفؑ کو دیکھنے کے شوق میں اس سرزمین پر جا پہنچے۔

جب حضرت یوسفؑ نے انہیں دیکھا تو اپنے والد اور والدہ[ل] سے گلے ملے اور انہیں اپنے خاص تخت پر بٹھایا۔ تب ان کے والد، والدہ اور بھائی ان (یوسفؑ) کے مل جانے پر بطور تشکرانہ اپنے سر خاک پر رکھ کر جھک گئے اور سجدہ شکر بجا لائے۔

یوسفؑ نے کہا: بابا جان! یہ ہے اس خواب کی تعبیر کہ جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا۔ خدائے تعالیٰ نے میرے خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دیا اور اس نے مجھ پر بڑے احسان فرمائے ہیں۔ اس نے مجھے قید سے رہائی بخشی اور ملک مصر کے خزانوں کی چابیاں میرے سپرد کر دیں۔ نیز اس نے ایک طویل جدائی کے بعد ہمیں ایک دوسرے سے ملا دیا۔ یہ سب کچھ مجھ پر اور آپ پر اس خدائے واحد کا احسان و کرم ہے۔

ل یہاں والدہ سے مراد یوسفؑ کی خالہ ہیں کیونکہ ان کی والدہ راحیل انکے بچپنے میں ہی فوت ہوگئی تھیں۔

اس داستان کے نتائج

ایک مصری مصنف کہتا ہے: جو شخص اعلیٰ اخلاق سیکھنا چاہتا ہو اس کے لیے حضرت یوسفؑ کی داستان ایک بہترین درس ہے جو خدا کی راہ میں ثابت قدمی اور اس کے فوائد کو بیان کرتی ہے۔ نیز یہ داستان انسانی نفسیات کے لحاظ سے بھی بہت سے عظیم اور دورس نتائج کی حامل ہے۔ اگر نفسیات کا کوئی عالم اخلاقیات اور نفسیات کے موضوع پر ایک کتاب لکھے اور اس کے تمام مطالب سورۂ یوسف سے اخذ کرے تو اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑیگی۔

مصر کے جمہوری ملک بننے سے پہلے وہاں کا وزیر تعلیم ایک کالج کے معائنے کے لیے آیا۔ اس وزیر نے پرائمری اور مڈل تک کی تعلیم مصر میں پائی تھی اور پھر یورپ چلا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ گویا ایک یورپی شخص بن گیا تھا کہ جس کا طرز فکر بھی انہی لوگوں جیسا تھا۔

جب وہ وزیر ایک کمرۂ تعلیم میں پہنچا تو وہاں ایک استاد اپنے شاگردوں کو اخلاق کا درس دے رہا تھا۔ استاد کے پڑھانے کا طریقہ اور اس کے بیانات وزیر کو بڑے پسند آئے۔ چنانچہ جب درس ختم ہوا تو اس نے استاد سے پوچھا: آپ اس درس کے لیے کونسی کتاب سے استفادہ کرتے ہیں؟ استاد نے جواب دیا: قرآن سے۔ یہ سن کر وزیر کا چہرہ متغیر ہو گیا اور اس نے بے ادبانہ لہجے میں کہا: بھائی صاحب! قرآن کیا ہے؟ آپ اخلاق کا سبق زلیخا کی عشق بازی سے سیکھتے ہیں یا مصر کی عورتوں کی روش سے؟

استاد نے جواب دیا: جناب والا! یہی سورہ کہ جو آپ کو پسند نہیں آتا میں اسی سورے سے فضائل اور اخلاق کے اصول اخذ کرتا ہوں۔ میں آپ کو

ایک ایسے جوان کا حال سناتا ہوں جو اپنی جوانی کے آغاز میں عفت اور فضیلت سے آراستہ تھا۔ پھر اس کے راستے میں خطرناک جال بچھائے گئے اور اس کے لیے مشکلات پیدا کی گئیں، لیکن اس نے خدا سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا یہاں تک کہ اس نے نیکی کی راہ میں تکلیفیں اٹھائیں اور ناکامیوں کا منہ دیکھا۔ اگر وہ ایک شہوت پرست عورت کی خواہش کے مطابق عمل کرنے پر تیار ہو جاتا تو اسے قید خانے میں نہ ڈالا جاتا اور وہ سب تکلیفیں بھی نہ اٹھاتا جو اسے اٹھانی پڑیں۔ اس نے ان تمام طوفانوں کے درمیان اپنے دین کی حفاظت کی اور دین کی حفاظت تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔

استاد کی یہ باتیں سن کر وزیر نے کہا: استاد صاحب! میری غلطی سے درگزر فرمایئے اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے چشم پوشی کیجیے۔

چنانچہ حضرت یوسفؑ کی داستان سے کئی سبق سیکھے جا سکتے ہیں جن میں سے بعض نکات کی جانب ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں

○ یہ داستان ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کا خدا پر ایمان اس کو سختیوں کا مقابلہ کرنے اور مشکلوں کو برداشت کرنے کا خوگر بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسفؑ خدائے تعالیٰ پر ایمان کے وسیلے سے تمام مشکلات پر حاوی ہو گئے۔ حالانکہ وہ جوان تھے اور ان کے لیے لغزش کے تمام اسباب بھی موجود تھے لیکن وہ ان تمام خطروں سے کامیاب اور سرخرو ہو کر نکلے۔

○ اس داستان سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ انسان کو ہر مصیبت میں خدائے تعالیٰ ہی سے پناہ طلب کرنا اور اسی سے مدد مانگنا چاہیے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب حضرت یوسفؑ نے اپنے آپ کو عزیز مصر

کی بیوی کے سامنے پایا اور دیکھا کہ وہ ایک عظیم خطرے سے دوچار ہو گئے ہیں تو انہوں نے خدا سے پناہ مانگی اور اس نے انہیں گناہ کے خوفناک گڑھے میں گرنے سے بچا لیا۔

- حضرت یوسفؑ کی داستان ہمیں دین سے محبت کا درس بھی دیتی ہے۔ اگرچہ قید خانے میں حضرت یوسفؑ گوناگوں تکلیفوں اور پریشانیوں کا مقابلہ کرتے رہے لیکن ان تمام مشکلوں کے باوجود انہوں نے دین کی تبلیغ اور ترویج میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ دو قیدیوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتلانے سے پہلے آپ نے انہیں اپنے عقیدے اور عمل سے آگاہ کیا اور شرک سے تائب ہونے کی دعوت دی، اس کے بعد ان کے خوابوں کی تعبیر بتائی۔

- ایک اور چیز جو اس داستان میں قابل توجہ ہے، وہ اپنی عزت و آبرو کا پاس و لحاظ رکھنا ہے۔ ہر وہ مظلوم جو برسوں سے قید میں پڑا ہو، وہ رہائی کا حکم صادر ہوتے ہی قید خانے سے باہر آجاتا ہے۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ رہا ہونے سے انکار کیا اور فرمایا: میں اس وقت رہا ہونا چاہتا ہوں جبکہ میری بیگناہی ثابت ہو جائے۔ تاکہ معاشرے میں میری عزت و آبرو محفوظ رہے۔

- اس قصے سے صبر و تحمل کا سبق بھی سیکھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے ہاتھوں تکالیف اٹھانے کے باوجود صبر کیا تھا۔ انہوں نے لوگوں کی بے ضمیری پر بھی صبر کیا جنہوں نے انہیں کنوئیں سے نکال کر بیچ ڈالا تھا۔ انہوں نے نفسانی خواہشات کے مقابلے میں اور پھر قید خانے میں بھی صبر کیا۔ حتیٰ کہ خدا نے انہیں اعلیٰ ترین عہدے

پر پہنچا دیا۔

○ ان تمام چیزوں سے بڑھ کر یہ کہ حضرت یوسفؑ کی داستان ہمیں عفو و درگزر کا سبق دیتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کے بھائی بڑی مجبوری اور بے کسی کے عالم میں ان کے پاس آئے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو اس وقت انھیں کڑی سے کڑی سزا دے سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے کمال عالی ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کی خطاؤں سے درگزر کی اور ان کا گناہ معاف کر دیا۔

حضرت یوسفؑ کے قصے میں گوناگوں اسباق پوشیدہ ہیں اور جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ ایک دریائے ناپیدا کنار میں سے ایک قطرے کے برابر ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام

اہل مدین سرزمین حجاز کے پہلو میں شام کی حدود کے اندر آباد تھے۔ وہ تجارت پیشہ تھے اور بڑے چین سے زندگی گزار رہے تھے۔ اگرچہ وہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے مالا مال تھے لیکن وہ اس سے کنارہ کشی کر کے دوسرے موجودات کو پوج رہے تھے۔ بت پرستی کے علاوہ بھی ان میں بہت سی برائیاں پائی جاتی تھیں۔ چنانچہ ان کے معاشرے میں گناہ اور بدکاری کا دور دورہ تھا۔ وہ ناپ تول میں کمی کرنے اور دوسروں کو دھوکا دینے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے اور ان برائیوں کو اپنی طاقتوری اور ہوشیاری کی دلیل تصور کرتے تھے۔

ان حالات میں خدا نے ان لوگوں کی رہنمائی کے لیے حضرت شعیبؑ کو اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا۔ انھوں نے لوگوں کو گناہوں کے ارتکاب سے منع کیا اور انھیں خدا کے عذاب سے ڈرایا۔

مفسرین نے حضرت شعیبؑ کو "خطیب الانبیاءؑ" کا نام دیا ہے۔ کیونکہ وہ وعظ ونصیحت کے وقت بڑی ملائم اور شیریں زبان میں بات کرتے تھے اور ان کا استدلال بڑا دلنشیں اور مؤثر تھا۔ وہ اپنی قوم کو خدا کی عبادت کرنے اور ظلم سے باز رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔

اہل مدین حضرت شعیبؑ کی باتوں کا مذاق اڑاتے اور کہتے :

اے شعیبؑ! جو نماز تم پڑھتے ہو کیا وہ یہ کہتی ہے کہ ہمارے پہلے خدا کہ جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں، ہم ان کو چھوڑ دیں یا اپنے اموال کے بارے میں کوئی دوسرا طرزِ عمل اختیار کریں۔ کم تولنے سے باز رہیں اور اس کے نتیجے میں نقصان اٹھائیں؟ نہیں ہم سے یہ نہیں ہوتا۔ ہم تمہاری بیشتر باتوں کو نہیں سمجھتے۔ پھر تم ہمارے معاشرے میں ایک کمزور اور ناتواں شخص ہو۔ اگر تمہارے اہل خاندان نہ ہوتے تو جو باتیں تم کرتے ہو، ان کی سزا کے طور پر ہم تمہیں سنگسار کر دیتے۔

تاہم لوگوں کے ان اہانت آمیز الفاظ سے حضرت شعیبؑ کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ ایک مہربان باپ کی طرح کہ جو اپنی اولاد کو نصیحت کرتا ہے، ان لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتے رہے اور انکی خیر خواہی اور رہنمائی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔

لیکن ان لوگوں نے آپ کی مخالفت کرنے میں کوئی کمی نہ کی اور تبلیغ کے کام میں روڑے اٹکانے سے باز نہ آئے۔ وہ راستے میں بیٹھ جاتے اور لوگوں کو حضرت شعیبؑ کے پاس جانے اور ان پر ایمان لانے سے

روکتے اور انہیں قتل کی دھمکیاں دیتے تھے۔

رفتہ رفتہ حضرت شعیبؑ سے ان کی قوم کا یہ جھگڑا بڑی نازک شکل اختیار کر گیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے آپ کو واضح طور پر کہہ دیا کہ تم اپنا دین ترک کردو اور ہمارا دین قبول کر لو ورنہ ہم تمہیں اور تم پر ایمان لانیوالوں کو اپنے شہر سے نکال دیں گے۔

ان حالات میں حضرت شعیبؑ اس قوم کے ایمان لانے سے ناامید ہو گئے اور سمجھ گئے کہ ان کی باتیں ان سیاہ دل لوگوں پر اثر نہیں کریں گی۔ لہٰذا انہوں نے پروردگار عالم سے دعا کی کہ وہ اس قوم کو اس کے کفر کی سزا دے اور عذاب میں مبتلا کردے۔

خدائے تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی اور اہل مدین پر زلزلے کی صورت میں عذاب نازل کردیا۔ چنانچہ زمین بڑے زور سے لرزنے لگی اور اس سے پیشتر کہ وہ سنبھل سکیں اور اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کریں عذاب ان پر مسلط ہو گیا اور وہ اپنے کفر اور گناہوں کی سزا کو پہنچے، لیکن حضرت شعیبؑ اور ان پر ایمان لانے والے لوگ اس عذاب خداوندی سے امان میں رہے۔

اہل مدین کی ہلاکت کے بعد حضرت شعیبؑ کو حکم ملا کہ وہ اصحاب ایکہ کو خدائے واحد کی طرف بلائیں جو مدین کے قریب ہی آباد تھے۔

اصحاب ایکہ کے طور طریقے بعینہٖ اہل مدین جیسے ہی تھے۔ چنانچہ ان کی دیکھا دیکھی یہ بھی سرکش ہو گئے اور جن برائیوں میں وہ لوگ مبتلا رہے تھے وہ ان میں بھی موجود تھیں۔

تاہم حضرت شعیبؑ نے خدا کے حکم پر عمل کیا اور انہیں اس کی طرف بلانے لگے، لیکن ان لوگوں نے جواب میں کہا:

بلاشبہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے۔ تم بھی ہمیں جیسے ایک انسان ہو اور ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو آسمان کا ایک ٹکڑا ہمارے سروں پر گرا دو اور ہمیں ہلاک کر دو۔

حضرت شعیبؑ نے ان لوگوں کی بہتری کے لیے جتنی کوششیں کیں وہ بیکار ہو گئیں حتیٰ کہ ان میں سے ایک شخص بھی ان پر ایمان نہ لایا۔ تب خدا نے ان پر شدید گرمی مسلط کر دی کہ جس کی تپش سے پانی جوش کھانے لگا۔ یوں ان لوگوں نے سات دن سخت تکلیف میں گزارے۔ دریں اثنا، بادل کا ایک ٹکڑا آسمان پر نمودار ہوا اور اس کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آنے لگی۔ یہ دیکھ کر وہ لوگ گرمی سے بچنے کے لیے اس بادل کے نیچے جمع ہو گئے۔ عین اسی وقت خدا کے حکم سے اس بادل سے آگ برسنے لگی جس نے اس سرکش قوم کو کیفرِ کردار تک پہنچایا اور چشم زدن میں جلا کر راکھ کر دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت یعقوبؑ اور ان کے اہل خاندان حضرت یوسفؑ کی خواہش پر مصر آگئے۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ وہ ایک بہت بڑا قبیلہ بن گئے اور ان کو بنی اسرائیل کہا جانے لگا۔

حضرت یعقوبؑ سترہ سال مصر میں رہنے کے بعد ۱۴۷ سال کی عمر میں وفات پا گئے اور کچھ مدت کے بعد حضرت یوسفؑ بھی ۱۱۰ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ تب اس ملک کی حکومت دوسرے بادشاہوں کے قبضے میں چلی گئی کہ جنہیں فراعنہ کہا گیا۔

کئی صدیاں اسی طرح گزریں اور ان میں بنی اسرائیل ایک قابل توجہ گروہ کی حیثیت سے ابھرے۔ ان کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی اور اس

میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

جب فرعون مصر کے تخت پر بیٹھا تو بنی اسرائیل کی تعداد میں روزافزوں اضافے کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ حکومت مصر کے دشمنوں کے ساتھ مل جائیں اور ملک کو خطرے میں ڈال دیں۔ اس بنا پر اس نے بنی اسرائیل کے لیے مشکلات پیدا کرنے اور ان پر پابندیاں عائد کرنے کا فیصلہ کیا۔

پھر اس نے اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنایا اور بنی اسرائیل پر سختیاں کرنا شروع کر دیں اور قسم قسم کے حیلے بہانوں سے ان کے لیے مشکلات کھڑی کر دیں۔

انہی دنوں ایک مشہور نجومی نے فرعون سے کہا: بنی اسرائیل میں ایک ایسا لڑکا پیدا ہونیوالا ہے جس کے ہاتھوں آپ کا تخت و تاج نیست و نابود ہو جائے گا۔

فرعون نے اس حادثے کی پیش بندی کرنا چاہی اور اپنے اہلکاروں کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا بھی پیدا ہو وہ اسے مار ڈالیں اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ تقدیر خداوندی کے آگے بند باندھ دے گا اور حکم الٰہی کو جاری نہیں ہونے دے گا۔ تاہم پروردگار عالم کو یہی منظور تھا کہ حضرت موسیٰؑ ایسے ہی خطرناک ماحول میں پیدا ہوں اور ان کے ہاتھوں فرعون کی سلطنت نیست و نابود ہو کر رہے۔

حضرت موسیٰؑ کی والدہ گھر میں بیٹھی تھیں کہ ان کو درد زہ شروع ہو گیا۔ تب دایہ کو بلایا گیا اور حضرت موسیٰؑ نے دنیا میں قدم رکھا۔ لیکن ان کی ولادت کو پوشیدہ رکھا گیا، مبادا یہ خبر فرعون اور اس کے اہلکاروں

پہنچ جائے اور موسیٰؑ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ چند دن اسی طرح گزر گئے جن میں فرعون کے جاسوس بنی اسرائیل کے گھروں کی تلاشی لیتے رہے اور جو لڑکا بھی انہیں ملا اسے قتل کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں حضرت موسیٰؑ کی حفاظت کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ اس موقع پر خدا نے انکی والدہ کو یہ ترکیب سجھائی کہ وہ حضرت موسیٰؑ کو ایک صندوق میں رکھیں۔ اس پر تارکول لگائیں اور اسے دریائے نیل میں ڈال دیں تاکہ خدا کا فرمان جاری ہو۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے ایک صندوق تیار کرایا۔ اپنے پیارے بیٹے کو اس میں لٹایا اور بڑی حسرت کے ساتھ نیل کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ پھر یہ چھوٹی سی کشتی نیل کے پانی پر تیرنے لگی اور رہ رہ دوسری جگہ کو چھوڑتی ہوئی فرعون کے محل کے پاس آ پہنچی۔ تب شاہی ملازموں نے اسے دریا سے نکال لیا اور فرعون کے پاس لے گئے۔

حضرت موسیٰؑ کی بہن دور سے اس پر نظریں جمائے ہوئے تھیں کہ دیکھیں اس صندوق اور بچے پر کیا گزرتی ہے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ صندوق فرعون کے محل میں پہنچا دیا گیا ہے تو وہ بیحد پریشان ہوئیں لیکن خدائے تعالیٰ کی لامحدود رحمت نے حضرت موسیٰؑ پر اپنا سایہ ڈالا اور اس کی مہربانی سے وہ ہر طرح کی تکلیف سے محفوظ رہے۔

جب فرعون نے بچے کو مار ڈالنے کا حکم دیا تو اس کی بیوی نے آگے بڑھ کر کہا: اس خوبصورت لڑکے کو قتل نہ کرو۔ ہم اسے اپنا بیٹا بنا لیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو۔ اگرچہ فرعون بچے کو قتل کرنے سے باز آ گیا تھا لیکن بچے کا رونا بند

نہیں ہو رہا تھا۔ اس پر بہت سی عورتوں کو اسے دودھ پلانے کے لیے لایا گیا لیکن اس نے کسی کا دودھ نہ پیا۔ تب موسیٰؑ کی بہن جو سب کچھ دیکھتی چلی آرہی تھیں، وہ وہاں پہنچیں اور کہنے لگیں:

آیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ میں تمہیں ایک ایسے گھر کا پتا بتاؤں جس کے رہنے والے تمہارے بچے کو پالیں پوسیں اور اس کے ساتھ بہترین سلوک کریں۔ یہ کہہ کر وہ اپنی والدہ کو دربار میں لے آئیں۔ بچہ ہمک کر ماں کی گود میں آیا اور آرام سے دودھ پینے لگا۔ یوں خدا کا وعدہ پورا ہوا اور حضرت موسیٰؑ اپنی والدہ کے پاس پہنچ گئے۔

جب حضرت موسیٰؑ کی شیر خوارگی کا زمانہ ختم ہو گیا تو انکی والدہ انہیں فرعون کے محل میں چھوڑ آئیں، جہاں فرعون کے خدمتگار ہر وقت انکی خدمت کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ اس طرح انہوں نے اپنے لڑکپن کا زمانہ فرعون کے محل میں بڑے آرام سے گزارا۔ جب وہ سن رشد و کمال کو پہنچے تو خدائے تعالیٰ نے انہیں علم و حکمت سے نوازا اور نبوت کے منصب پر فائز کیا۔

موسیٰؑ کا مصر سے نکلنا

خدائے تعالیٰ کے احسانات کو مدنظر رکھتے ہوئے موسیٰؑ نے مظلوموں اور بیکسوں کی مدد اور حمایت کرنے کا عزم کیا۔ انہوں نے طے کر لیا کہ وہ ہر دکھی دل کا دکھ دور کریں گے اور ہر حاجتمند کی حاجت پوری کریں گے۔ وہ بنی اسرائیل ـــــ جو حضرت موسیٰؑ کے قبیلہ والے تھے ـــــ اس وقت

فرعون کے ظلم و ستم کے چنگل میں گرفتار تھے اور ان سب کی نگاہیں حضرت موسیٰؑ کی عالی ہمتی پر جمی ہوئی تھیں۔

ایک دن جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے محل کو جا رہے تھے۔ انہوں نے عین راستے میں دیکھا کہ دو شخص آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک فرعون کی قوم کا آدمی تھا اور دوسرے کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا۔ اس اسرائیلی نے حضرت موسیٰؑ کو مدد کے لیے پکارا تو وہ اس کی حمایت میں آگے بڑھے اور فرعونی کے سر پہ ایک مکا جڑ دیا۔ اتفاق کی بات کہ مکا لگتے ہی فرعونی زمین پہ گر گیا اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

دوسرے دن جب حضرت موسیٰؑ اسی راستے سے گزر رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ وہی اسرائیلی ایک اور فرعونی سے دست و گریبان ہے۔ جب اس نے حضرت موسیٰؑ کو دیکھا تو کل کی طرح آج بھی ان سے مدد طلب کی۔ تب حضرت موسیٰؑ نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک سرکش اور جھگڑالو آدمی ہو۔ تاہم وہ اس کی مدد کے لیے آگے بڑھے۔ لیکن وہ اسرائیلی یہ سمجھا کہ موسیٰؑ خود اسے پیٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہنے لگا:

اے موسیٰؑ! کیا تم مجھے بھی ویسے ہی قتل کر دینا چاہتے ہو' جیسے کل تم نے ایک اور آدمی کو قتل کیا تھا؟ اس جملے نے حضرت موسیٰؑ کی جان خطرے میں ڈال دی اور لوگوں کو پتا چل گیا کہ اس فرعونی کا قاتل کون ہے۔ چنانچہ مقتول کے ورثا کہ جو قاتل کو تلاش کر رہے تھے وہ حضرت موسیٰؑ کو گرفتار کرانے اور سزا دلانے پہ آمادہ ہو گئے۔ تاہم اس موقع پر بھی اللہ کی رحمت موسیٰؑ کے شامل حال ہوئی اور فرعون کا خزانچی جو ایک مومن تھا' لیکن اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا' وہ فوراً حضرت موسیٰؑ کے

پاس پہنچا اور کہنے لگا: اے موسیٰؑ! یہ قوم تم کو قتل کرنے کے درپے ہے۔ اس لیے میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ جتنی جلد ہو سکے اس شہر سے نکل جاؤ اور فرعونیوں کے ہاتھ سے اپنی جان بچا لو۔

موسیٰؑ مدین میں

حضرت موسیٰؑ سفر کی کوئی تیاری کیے یا کھانے پینے کا سامان ساتھ لیے بغیر خوف اور پریشانی کے عالم میں شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ بیابانوں میں تنہا چل رہے تھے اور جب بھوک لگتی تو صحرا کی گھاس چبا لیتے تھے۔ آخر کئی دن رات کے سفر کے بعد وہ مدین کے کنویں پر آپہنچے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ کچھ چرواہے کنویں کے کنارے واقع درخت کے نیچے جمع ہیں اور اپنی بھیڑوں کو پانی پلا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھا کہ دو لڑکیاں اپنی بھیڑیں لیے کنویں سے دور کھڑی ہیں اور ان کو کنویں کے نزدیک جانے سے روکے ہوئے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ ان لڑکیوں کے پاس گئے اور پوچھا: تم اپنی بھیڑوں کو پانی کیوں نہیں پلاتیں؟

انھوں نے جواب دیا: ہمارے لیے انتظار کرنا ضروری ہے۔ جب مرد اپنے جانوروں کو پانی پلا کر چلے جائیں گے تو پھر ہم اپنی بھیڑوں کو پانی پلائیں گی۔ ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں وہ اتنا کام کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

حضرت موسیٰؑ کنویں کے کنارے پہنچے، ڈول پکڑا اور ان لڑکیوں کی بھیڑوں کو پانی پلایا اور پھر درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ یہ وہ وقت

تھا کہ انھیں سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اس لیے انھوں نے خدا سے مدد مانگی اور اس کی بارگاہ میں اپنی حاجت بیان کی۔

ابھی لڑکیوں کو گئے ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ ان میں سے ایک واپس آئی اور کہنے لگی: میرے والد نے تم کو اس لیے بلوایا ہے کہ تم نے ہمارے لیے پانی پلانے کی جو تکلیف اٹھائی ہے تمہیں اس کا معاوضہ دیں۔ یہ سن کر حضرت موسیٰؑ، شعیبؑ کے گھر کی جانب چل پڑے جو ان لڑکیوں کے والد تھے۔

حضرت شعیبؑ نے ان کی سرگزشت دریافت کی اور جب انھیں تمام حالات کا پتا چل گیا تو کہا: اب تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ سرزمین فرعون کی قلمرو سے باہر ہے اور تم یہاں ان لوگوں کے شر سے محفوظ ہو۔

حضرت شعیبؑ کی بیٹی نے کہا: بابا جان! اس جوان کو اپنی مدد کے لیے ملازم رکھ لیجیے کیونکہ یہ ایک طاقتور اور امانتدار شخص ہے۔

حضرت شعیبؑ نے کہا: اس کے طاقتور ہونے کے متعلق تو تمہیں اس وقت پتا چلا ہوگا جب اس نے کنویں سے پانی نکالا تھا لیکن تمہیں یہ اندازہ کیونکر ہوا کہ وہ ایک امانتدار شخص بھی ہے۔

لڑکی نے کہا: جب میں اسے گھر لا رہی تھی تو اس نے مجھ سے کہا: میں آگے چلتا ہوں اور تم میرے پیچھے رہ کر مجھے راستا بتاتی رہو۔ پھر یہ کہا کہ ہم ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں کہ جس کے افراد عورتوں کے ڈیل ڈول پر نگاہ نہیں ڈالتے۔

حضرت شعیبؑ کو اپنی بیٹی کا استدلال پسند آیا اور وہ حضرت موسیٰؑ

سے کہنے لگے: میں اپنی ایک بیٹی (صفورا) کا نکاح تم سے کر دینا چاہتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں رہ کر میری بھیڑیں چراؤ گے اور اگر تم چاہو تو دس سال تک بھی رہ سکتے ہو' لیکن یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔

حضرت موسیٰؑ کہ جو اپنے آپ کو اس علاقے میں تنہا اور اجنبی محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے حضرت شعیبؑ کی یہ بات مان لی' ان کی دامادی کا فخر حاصل کر لیا اور ساتھ ہی ساتھ ان کی بھیڑیں چرانے کا کام بھی سنبھال لیا۔

جب دس سال کی مدّت پوری ہو گئی تو حضرت موسیٰؑ نے حضرت شعیبؑ کی دی ہوئی بھیڑیں اکٹھی کیں اور اپنی بیوی کو لے کر اپنی ماں اور بہن سے ملنے مصر روانہ ہو گئے۔

ایک ٹھنڈی رات میں کہ جب تیز ہوا چل رہی تھی' حضرت موسیٰؑ راستا بھول گئے اور شدید سردی نے ان میاں بیوی کو سخت پریشان کر دیا۔ اس وقت حضرت موسیٰؑ کو اچانک ہی دور سے آگ دکھائی دی اور انہوں نے اپنی بیوی سے کہا: میں اس آگ کی طرف جاتا ہوں' ممکن ہے اس وسیلے سے ہمیں صحیح راستے کا پتا چل جائے یا کم از کم سردی سے بچاؤ کے لیے میں تھوڑی سی آگ لے آؤں۔

یہ کہہ کر حضرت موسیٰؑ آگ کی طرف چل پڑے۔ جب وہ اس جگہ (طورِ سینا) پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ آگ ایک سرسبز درخت پر روشن ہے لیکن نہ تو اس سے درخت جلتا ہے' نہ آگ بجھتی ہے اور نہ وہاں کوئی بشر نظر آتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ حیران کھڑے آگ کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اچانک ایک آواز بلند ہوئی:

اے موسیٰؑ! میں تمہارا پروردگار ہوں۔ یہاں اپنے جوتے اتار دو کہ تم مقدس وادی میں داخل ہو چکے ہو۔

حضرت موسیٰؑ نے اپنے جوتے اتار دیے اور اسی دوران میں وہی آواز سنائی دی: اے موسیٰؑ! تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟

موسیٰؑ نے جواب دیا: یہ عصا ہے جس پر میں ٹیک لگاتا ہوں۔ اس کے ساتھ بھیڑیں ہنکاتا ہوں اور اس سے کئی اور کام بھی لیتا ہوں۔

ادھر سے کہا گیا کہ اسے زمین پر ڈال دو!

موسیٰؑ نے عصا زمین پر ڈالا تو وہ ایک بڑا سا ڈراؤنا سانپ بن گیا۔ موسیٰؑ کے دل میں خوف پیدا ہوا اور وہ بھاگنے کو تھے کہ اتنے میں آواز آئی: اے موسیٰؑ! ڈرو مت اور لوٹ آؤ۔ ہم اس کو اسی پہلی شکل میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ تم ہاتھ بڑھاؤ اور اسے پکڑ لو۔

موسیٰؑ نے پشمینے کا جبہ پہن رکھا تھا۔ انہوں نے سانپ کو پکڑنے کے لیے جبے کی آستین کو اپنے ہاتھ پر لپیٹ لیا۔ ادھر سے آواز آئی: آستین کو پرے کر دو اور بے خوف ہو کر اسے پکڑ لو۔

تب حضرت موسیٰؑ نے ہاتھ بڑھا کر سانپ کا سر پکڑ لیا اور دیکھا کہ یہ تو ان کا وہی عصا ہے۔ پھر خطاب ہوا کہ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو! موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالا اور جب اسے باہر نکالا تو دیکھا کہ وہ سفید اور چمکدار ہو گیا ہے۔ انہوں نے اسے پھر گریبان میں ڈالا اور جب باہر نکالا تو وہ اپنی پہلی حالت پر آ گیا تھا۔

پھر آواز آئی: اے موسیٰؑ! یہ تمہارے رب کی دو بہت بڑی نشانیاں ہیں۔ اب ضروری ہے کہ تم فرعون اور اس کی قوم کے پاس جاؤ اور انھیں ہماری طرف بلاؤ۔

حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا: اے پروردگار! میں نے فرعون کی قوم کے ایک آدمی کو مار ڈالا تھا، اس لیے ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ مجھے قتل نہ کردیں۔ میرا بھائی ہارونؑ کہ جو مجھ سے بڑھ کر روانی سے بول سکتا ہے، تو اس کو میرے ساتھ کردے تاکہ وہ میری تصدیق کرے اور میرا مددگار رہے۔

حضرت موسیٰؑ کی یہ درخواست قبول کرلی گئی اور ہارونؑ کو ان کا معاون مقرر کردیا گیا۔ جب حضرت موسیٰؑ اس جگہ سے واپس ہونے لگے تو ان کا حوصلہ بڑھانے اور انھیں اطمینان دلانے کے لیے کہا گیا: تم اپنے بھائی ہارونؑ کے ساتھ فرعون کے پاس جاؤ اور ہماری آیتیں اس کے سامنے پڑھو۔ ہاں یہ جان لو کہ تم اور تمہارے پیرو ہی کامیاب ہوں گے۔

موسیٰؑ فرعون کے دربار میں

حضرت موسیٰؑ مصر آگئے اور سب سے پہلے اپنی والدہ، بھائی اور بہن سے ملنے گئے۔ انھوں نے اپنے بھائی ہارونؑ کو خدا کا پیغام پہنچایا اور پروردگار عالم کی طرف سے جو کام ان کے سپرد کیا گیا تھا انہیں اس سے مطلع کیا۔ پھر دونوں بھائی فرعون کے دربار میں جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ لیکن موسیٰؑ کی والدہ ان کی اس ماموریت کے باعث بے حد خوفزدہ

تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کے بیٹے اس کام سے باز رہیں۔ تاہم ان کے لیے خدا کے حکم پر عمل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ لہٰذا وہ فرعون کے دربار میں گئے اور جس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے انہیں مامور کیا گیا تھا وہ اس کے کانوں تک پہنچا دی۔

حضرت موسیٰؑ نے کہا: میں دونوں جہان کے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ میں سچی بات کے علاوہ کچھ نہ کہوں۔ میں خدائے تعالیٰ کی طرف سے واضح دلیل کے ساتھ تمہاری رہنمائی کے لیے آیا ہوں۔ پس اب تم بنی اسرائیل کو ان تمام پابندیوں سے آزاد کرو اور انھیں میرے ساتھ جانے دو۔

فرعون نے انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور کہا: تمہارا خدا کون ہے؟

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا: ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے اپنی مخلوق کو اچھی سے اچھی صورت کے ساتھ پیدا کیا اور ان کو اس زندگی کے مقاصد کی ہدایت فرمائی۔

فرعون نے کہا: جب تم ابھی بچے ہی تھے تو کیا ہم نے تمہاری پرورش نہیں کی، تمہارے آرام کے وسائل فراہم نہیں کیے اور پھر کئی سال تک تم ہمارے گھر میں نہیں رہے؟ تو اب یہ دعویٰ جو تم کر رہے ہو اس کی کیا حیثیت ہے؟

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا: اچھا اب تم یہ احسان جتا رہے ہو کہ تم نے اپنے گھر میں میری پرورش کی تھی۔ حالانکہ اس کی وجہ بھی تمہارا وہ ظلم اور سخت گیری تھی جو تم بنی اسرائیل پر کرتے چلے آرہے ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا

تو میری ماں اس بات پر مجبور نہ ہوتی کہ مجھے دریائے نیل میں پھینک دے اور رنج و حسرت کے ساتھ میری جدائی برداشت کرے۔

فرعون نے کہا: یہی نہیں بلکہ وہ تمام احسانات کہ جو ہم نے تم پر کیے ان کے باوجود تم نے ہمارے ایک آدمی کو قتل کیا اور اس جرم کے بعد یہاں سے فرار ہو گئے۔

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا: اس دن یہ واقعہ اچانک پیش آ گیا تھا۔ تاہم خدا نے مجھے اپنے خاص احسان و کرم کا مورد ٹھہرایا اور نبوت کی ذمہ داریوں کا بوجھ میرے کندھوں پر رکھا۔

فرعون نے کہا: اگر تم میرے علاوہ کسی اور کو اپنا خدا ٹھہراؤ گے تو میں تمہیں قید کر دوں گا۔

چونکہ فرعون اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان یہ گفتگو عام لوگوں کے سامنے ہوئی تھی۔ لہٰذا اس سے فرعون کے رعب اور دبدبے میں بہت حد تک کمی آ گئی۔ تب اس نے اپنے کچھ کارندوں کو شہر کے گلی کوچوں میں بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کریں کہ فرعون ضروری تیاری کر کے موسیٰؑ کے خدا سے لڑنے آسمان پر جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں ہامان کو یہ حکم دیا کہ وہ ایک بہت بلند عمارت تعمیر کرا دے "تاکہ فرعون اس پر ہو کر حضرت موسیٰؑ کے خدا سے لڑنے جائے"!

چنانچہ لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا حربہ کسی حد تک مؤثر ثابت ہوا اور ان کے دلوں میں فرعون کے خدا ہونے کا یقین قائم رہا۔ ممکن ہے کہ فرعون خود بھی اپنی ان احمقانہ باتوں پر یقین رکھتا تھا یا شاید وہ اس حد تک نادان نہ تھا اور اس نے محض لوگوں کو بیوقوف

بنانے کے لیے ہی یہ بکھیڑا ڈالا تھا۔

حضرت موسیٰ کے معجزے

فرعون نے حضرت موسیٰ سے مقابلہ کرنے اور انہیں نیچا دکھانے کے لیے دھمکیاں دینی شروع کیں اور کہا: اگر تم اپنے ان دعووں سے دستبردار نہیں ہوگے اور میرے علاوہ کسی اور خدا کو مانوگے تو میں تمہیں قید خانے میں ڈال دوں گا۔

حضرت موسیٰ نے کہا: خواہ میرے پاس اپنی حقانیت کے بارے میں واضح دلیل موجود ہو؟

فرعون نے کہا: تمہاری دلیل کیا ہے؟

حضرت موسیٰ نے اپنا عصا زمین پر ڈال دیا اور وہ اژدھا بن گیا۔

فرعون اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا اور کہنے لگا: کیا تمہارے پاس کوئی اور معجزہ بھی ہے؟

حضرت موسیٰ نے اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالا اور پھر باہر نکالا تو ان کی ہتھیلی سے چمکیلی اور چندھیا دینے والی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اب فرعون کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہی۔ اگر وہ قلب سلیم کا مالک ہوتا تو ان معجزوں اور خدائی نشانیوں کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا اور سرکشی اور بغاوت سے باز رہتا لیکن حکومت کی محبت اس کے دل اور روح پر اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ اب بھی اسے اپنی کامیابی کی امید تھی۔ اس نے حضرت موسیٰ پر جادوگری اور شعبدہ بازی کی تہمت لگائی اور لوگوں سے کہا، موسیٰ اور ہارون دونوں بھائی بہت بڑے جادوگر ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور

سے تمہیں اس ملک سے نکال دیں۔اب تمہیں بتاؤ کہ ہمیں ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔

فرعون کے درباریوں اور حمایتیوں نے کہا: آپ انھیں اپنے پاس روکے رکھیں اور مختلف شہروں میں اپنے کارندے بھیج دیں تاکہ وہ ماہر شعبدہ بازوں اور جادوگروں کو آپ کے پاس لے آئیں اور وہ حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ کریں۔ ان کی یہ تجویز فرعون کو بڑی پسند آئی اور اس نے حکم دیا کہ شعبدہ بازوں اور جادوگروں کو حاضر کیا جائے۔ ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ بہت سے جادوگر اور شعبدہ باز دربار میں حاضر ہو گئے اور انھوں نے حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ کرنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

پھر اس مقابلے کے لیے ایک دن مقرر کر دیا گیا اور اس کا انتظام ایک ایسی جگہ پر کیا گیا جہاں ہزاروں تماشائیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ان شعبدہ بازوں نے میدان میں چند ایسی رسیاں پھینکیں کہ جن میں پارہ بھرا ہوا تھا۔ جب ان پر دھوپ پڑی تو وہ حرکت کرنے لگیں۔ وہ لوگوں کو یوں دکھائی دیتی تھیں، جیسے کہ بڑے بڑے اور خطرناک سانپ چل رہے ہیں۔ شعبدہ بازوں کو اپنی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ وہ بےاختیار کہنے لگے: فرعون کی عزت کی قسم کہ کامیابی اور فتح ہماری ہے۔

جب جادوگروں نے اپنے جادو اور شعبدہ بازی کے بہترین کرتب دکھا کر لوگوں کو حیران کر رکھا تھا۔ اس وقت حضرت موسیٰؑ نے اپنا عصا زمین پر پھینکا تو اس نے ایک اژدہا کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے ساتھ ہی اس اژدھا نے جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو نگل لیا اور اس میدان میں ان کی رسیوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔

جب شعبدہ بازوں نے یہ دیکھا کہ ان کے عمل کا حضرت موسیٰؑ کے عمل سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ نیز یہ کہ وہ جادو کے فن میں ماہر تھے اور سمجھ گئے کہ حضرت موسیٰؑ کا عصا خدا کی جانب سے ایک معجزہ ہے اور انسان کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ لہٰذا وہ سب کے سب سجدے میں گر گئے اور کہنے لگے: ہم تو حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کے خدا پر ایمان لے آئے ہیں۔

فرعون نے کہا: کیا تم میری اجازت سے قبل ہی ایمان لے آئے ہو؟ بیشک وہ تمہارا استاد اور سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ میں ابھی ابھی تمہیں اس عمل کی سزا دوں گا۔ تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالوں گا اور تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا۔

انہوں نے جواب دیا: اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں کیونکہ ہم خدا کی طرف لوٹ جائیں گے اور ہمیں امید ہے کہ وہ ہمارے گناہ بخش دے گا اور ہم پر رحمت فرمائے گا۔

حضرت موسیٰؑ کے قتل کا منصوبہ

فرعون نے شعبدہ بازوں کے معاملے میں بھی شکست فاش کھائی اور لوگوں کے عقائد میں ایک عجیب عدم استحکام پیدا ہو گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں ہار گیا ہے تو اس نے اپنے درباریوں کے مشورے سے حضرت موسیٰؑ کو قتل کرا دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس سبب سے کہ ہر دور میں حق کے کچھ نہ کچھ حامی اور مددگار ضرور ہوتے ہیں، فرعون کی قوم کا ایک آدمی کہ جو اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا، وہ حضرت موسیٰؑ کا دفاع کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بڑی

سنجیدگی سے حضرت موسیٰؑ کی طرفداری کی اور کہا: یہ قطعاً مناسب نہیں ہے کہ تم ایک شخص کو اس جرم کی بنا پر قتل کر دو کہ وہ خدا پرست ہے۔ جبکہ اس کے پاس اپنی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے واضح دلائل بھی موجود ہیں۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ اس نے جھوٹا دعویٰ کیا ہے تو اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں اور اس کا گناہ اس کی گردن پر ہو گا۔ لیکن اگر وہ سچ کہتا ہے تو تم پر خدا کا عذاب نازل ہو گا۔ نیز خدا بھی جھوٹے لوگوں کی ہدایت نہیں کرے گا۔

اے لوگو! یہ درست ہے کہ آج حکومت تمہارے ہاتھوں میں ہے لیکن اگر خدا کا عذاب نازل ہوا تو کون ہے جو تمہیں اس سے بچائے گا؟

اے لوگو! میں ڈرتا ہوں کہ تم اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے قوم نوحؑ، عاد، ثمود اور بعض دوسری قوموں کی طرح عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے اور خدا تمہیں قیامت میں بھی تمہارے گناہوں کی سزا دے گا۔

فرعون کی قوم نے اس باایمان شخص کی باتیں سنیں لیکن بجائے اس کے کہ وہ ان سے نصیحت پکڑیں، انہوں نے اس شخص کو بھی اس کے پاک عقیدے سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی۔ تاہم اس نے انھیں ڈانٹ ڈپٹ کی اور کہا: میں تو یہ کوشش کر رہا ہوں کہ تمہاری رہنمائی بھلائی کی طرف کروں اور تم مجھے برائی میں مبتلا کرنے کی فکر میں ہو۔ میں تمہیں ایمان کی طرف بلا رہا ہوں اور تم مجھے کفر کی طرف بلا رہے ہو۔

اس کی باتیں سن کر لوگوں کو سخت طیش آیا اور انہوں نے اسے قتل کر دینا چاہا، لیکن خدائے تعالیٰ نے اسے بچا لیا اور اسے دونوں جہانوں کی خوش بختی نصیب ہوئی۔

فرعون کے برے ارادوں سے حضرت موسیٰؑ کی سرگرمیوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی اور انہوں نے تبلیغ کا کام پوری شد و مد سے جاری رکھا۔ تاہم بنی اسرائیل پہ فرعون کی سخت گیری بڑھتی چلی گئی اور اس کی سرکشی اور بغاوت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس دوران میں خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو وحی بھیجی کہ فرعون سے صاف صاف کہہ دو: اب تیار ہو جا کہ خدا عنقریب تم پہ اور تمہاری قوم پہ عذاب نازل کردے گا۔

چنانچہ فرعون کو اس بات کا علم ہوگیا لیکن وہ خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوا اور اپنی سرکشی پہ قائم رہا۔ مگر خدائے تعالیٰ تو اپنے بندوں پہ بے حد مہربان ہے۔ اس لیے اس نے اس سرکش قوم کو اپنے عذاب کے کچھ نشان دکھائے تاکہ وہ اس کی بارگاہ کی طرف لوٹ آئیں اور توبہ کریں۔

پھر ہوا یہ کہ خشک سالی آئی اور پھل ناپید ہو گئے۔ سیلاب آیا اور ہر طرف تباہی پھیل گئی۔ ٹڈی دل نے حملہ کیا اور فصلیں برباد ہوگئیں۔ پہلے جوئیں اور پھر مینڈک ان پر مسلط ہو گئے۔ نیل کا پانی خون میں تبدیل ہوگیا۔ تاہم جب بھی کوئی عذاب آتا وہ حضرت موسیٰؑ کے پاس آکر کہتے: آپ خدا سے دعا کریں کہ یہ عذاب ہم پر سے ٹل جائے، پھر ہم ایمان لے آئیں گے۔ لیکن جب عذاب ٹل جاتا تو وہ پھر اپنے کفر پہ جم جاتے تھے۔

مصر سے موسیٰؑ کی ہجرت

خدائے تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کے لیے جو مہلت مقرر کی تھی وہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی اور وہ لوگ اس مہلت سے غلط فائدہ اٹھا رہے تھے۔ وہ دشمنی اور سرکشی کے راستے پر چل رہے تھے اور اپنے پیغمبر کے

ساتھ لڑنے جھگڑنے میں مصروف تھے۔ خدا کے غضب اور عذاب کی نشانیاں انہیں غفلت سے بیدار نہ کر سکیں اور بالآخر وہ اس کے ابدی عذاب میں گرفتار ہو گئے۔

حضرت موسیٰؑ خدا کے حکم کے مطابق رات کے وقت بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے مقدس سرزمین (فلسطین) کی جانب روانہ ہو گئے۔ لیکن ابھی انہوں نے کچھ زیادہ مسافت طے نہیں کی تھی کہ فرعون کو ان کی روانگی کی خبر لگ گئی۔ چنانچہ اس نے ہر جگہ سے اپنے سپاہیوں کو جمع کیا اور حضرت موسیٰؑ کے تعاقب میں چل کھڑا ہوا۔

بنی اسرائیل بحیرۂ احمر کے ساحل پر پہنچ چکے تھے کہ ان کو فرعون کی فوج کے آثار نظر آنے لگے۔ فوج کو آتے دیکھ کر انہیں اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا اور حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے: کیا ہوا تمہارا وہ وعدہ؟ اب فرعون آ پہنچا ہے اور ہم مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ نے انھیں تسلی دی اور پھر خدا کے حکم کے مطابق اپنا عصا سمندر میں مارا جس سے سمندر کا پانی پھٹ گیا اور زمین نظر آنے لگی۔ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل سمندر میں داخل ہو گئے اور دوسرے کنارے پر پہنچ کر بخیریت باہر نکل گئے۔ دریں اثنا فرعون بھی سمندر کے ساحل پہ آ پہنچا اور اس نے دیکھا کہ سمندر میں راستا بنا ہوا ہے اور بنی اسرائیل اس کے دوسرے کنارے پر ہیں۔ وہ انھیں گرفتار کرنے کی دھن میں سمندر کے بیچوں بیچ اسی راستے پر ہو لیا۔

فرعون کے پیچھے پیچھے اس کے سپاہی بھی سمندر میں داخل ہو گئے۔ اسی اثنا میں سمندر کا پانی پھر سے مل گیا اور فرعون اپنے لشکر سمیت پانی کی اندھی لہروں میں پھنس گیا۔ جب فرعون نے اپنے آپ کو ہلاکت میں مبتلا

دیکھا اور عذاب الٰہی کا مشاہدہ کر لیا تو کہنے لگا:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ جس خدا کو بنی اسرائیل مانتے ہیں اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔"

لیکن افسوس کہ وقت گزر چکا تھا اور اب اس کے ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ کیونکہ عذاب الٰہی کے نازل ہو جانے کے بعد ایمان لانا بے معنی ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ احتمال بھی ہے کہ فرعون حقیقتاً ایمان نہیں لایا تھا، بلکہ وہ چاہتا تھا کہ یہ جملہ ادا کر کے اپنے آپ کو بچالے اور بعد میں کفر اور سرکشی اختیار کرے۔ جیسا کہ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا تھا کہ جب کبھی عذاب نازل ہوتا تو فرعونی لوگ حضرت موسیٰؑ سے کہتے: ہم ایمان لے آئے کہ ہمیں اس عذاب سے رہائی مل جائے لیکن جب عذاب ٹل جاتا تو وہ اپنے کفر پہ جم جاتے۔

بہرحال فرعون اور اس کے لشکر کی زندگی کی بساط لپیٹ دی گئی اور ان سرکش لوگوں نے سمندر کی گہرائیوں میں جانیں دیدیں۔ خدا نے باغی فرعون کا بے جان جسم اسی وقت سمندر کی لہروں کے ذریعے ساحل پر پھینک دیا۔ تاکہ بنی اسرائیل اسے دیکھیں اور عبرت حاصل کریں۔

بنی اسرائیل بتوں کے خواہشمند

بنی اسرائیل بڑی مسرت کے ساتھ فرعون کے بے جان جسم کے پاس سے گزرے تو انہوں نے دل و جان سے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے

انہیں فرعون کے شر سے رہائی بخشی اور اس سرکش انسان کو اس کی نافرمانی پر سخت سزا دی۔

جب وہ کچھ فاصلہ طے کر چکے تو ایسے لوگوں کے پاس پہنچے جو بتوں کی پرستش کرتے تھے، چونکہ بنی اسرائیلیوں نے اپنی زندگی مصر جیسے بت پرست ملک میں گزاری تھی اور وہ بتوں اور بت پرستی کے عادی ہو چکے تھے۔ اس لیے وہاں بت پرستی کا منظر دیکھ کر ان کے دلوں میں بھی بت پرستی کی خواہش جاگ اٹھی۔ تب انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ جس طرح ان لوگوں نے معبود بنا رکھے ہیں، اسی طرح تم بھی ہمارے لیے ایک معبود یعنی ایک بت کا تعین کر دو کہ جسے ہم پوجا کریں۔

بڑی حیرت کا مقام ہے کہ بنی اسرائیل خدائے بزرگ و برتر اور اس کی نشانیوں کو اتنی جلدی بھلا بیٹھے۔ کیا وہ فرعونیوں کے چنگل میں بدترین عذاب میں مبتلا نہ تھے اور کیا خدا نے انہیں اس عذاب سے نجات نہیں دی؟ کیا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ فرعونیوں کا کتنا عبرتناک انجام ہوا اور خدا نے ان پر کس طرح عذاب نازل کیا؟ یہ سب کچھ انہوں نے دیکھا تو ضرور لیکن بھول گئے اور پھر ایسی احمقانہ درخواست لیکر حضرت موسیٰؑ کے پاس آئے۔

حضرت موسیٰؑ نے انہیں لعنت ملامت کی اور کہا: تم کتنے نادان اور بے عقل لوگ ہو۔ کیا تم اس خدا سے روگردانی کرنا چاہتے ہو جس نے تم پر اتنے احسان کیے ہیں اور اس پروردگار کو بھول گئے ہو جس نے تمہیں ذلت اور بدبختی کے گڑھے سے نکال کر خوش بختی کی منزل تک پہنچایا ہے؟

یہی تو سب سے بڑی نادانی ہے کہ کوئی شخص توانا اور بزرگ خدا کو تو چھوڑ دے اور بے جان چیزوں کے سامنے سر جھکائے اور عبودیت کا اظہار کرے۔

وعدۂ الٰہی اور بنی اسرائیل کا انحراف

جس زمانے میں بنی اسرائیل مصر میں رہ رہے تھے اور فرعون کا ان پہ پورا پورا تسلط تھا۔ تب حضرت موسیٰؑ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ خدا جب فرعون کو ہلاک کر دے گا اور تمہیں سرداری اور بلند رتبہ عطا کرے گا تو میں خدا کی طرف سے ایک کتاب لاؤں گا جو تم لوگوں کی رہنمائی کرے گی۔ جب فرعون ڈوب مرا تو حضرت موسیٰؑ خدا سے اس کتاب کے طلبگار ہوئے۔ تب خدا کی طرف سے وحی آئی کہ تم اپنے پروردگار سے ملاقات کے لیے کوہ طور پہ آؤ۔ تیس راتیں وہاں گزارو اور پھر اپنے آسمانی قانون کی کتاب حاصل کرلو۔

حضرت موسیٰؑ نے اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور قوم سے رخصت ہو کر پروردگار سے ملاقات کے مقام پر پہنچے۔ وہاں بعض مصالح کی بنا پر خدا کی طرف سے مقررہ مدت میں دس راتیں بڑھا دی گئیں اور حضرت موسیٰؑ چالیس راتیں قوم کے درمیان سے غائب رہے۔

اس دوران میں سامری نے وقت کو غنیمت جانا۔ بنی اسرائیل سے سونا لے کر جمع کیا۔ اسے پگھلایا اور ایک بچھڑے کا مجسمہ تیار کیا۔ اس نے لوگوں کو اس طلائی بچھڑے کی پرستش کرنے کی دعوت دی اور کہا: یہ تمہارا اور موسیٰؑ کا خدا ہے آؤ اور اسے سجدہ کرو۔

ہارونؑ نے بنی اسرائیل کو بہت سمجھایا لیکن بے سود۔ انہوں نے بچھڑے کو اپنا خدا قرار دیا اور اس کے آگے سجدے میں گر گئے۔

جب حضرت موسیٰؑ کے لیے کوہ طور پر قیام کی مدت ختم ہوئی تو خدا نے انہیں توریت کی تختیاں عنایت کیں۔ نیز انہیں بنی اسرائیل کے انحراف اور بچھڑے کی پرستش کرنے کے بارے میں بھی اطلاع دی۔

جب حضرت موسیٰؑ کوہ طور سے لوٹ کر بنی اسرائیل کی طرف آتے تو انہوں نے دور ہی سے خاصا شور سنا۔ یہ ان لوگوں کی آوازیں تھیں جو بچھڑے کے اردگرد عبادت کر رہے تھے۔ جب حضرت موسیٰؑ ان کے پاس پہنچے تو بے حد غضبناک ہوئے۔ انہوں نے تختیاں زمین پر رکھیں اور اپنے بھائی ہارونؑ کو پکڑ لیا اور کہا: تم نے بنی اسرائیل کو کیوں گمراہ ہونے دیا، کیوں انہیں منع نہ کیا اور شریر لوگوں کے خلاف جنگ کیوں نہ کی۔ تاکہ فتنہ دب جاتا اور لوگ محفوظ رہتے۔

ہارونؑ نے انتہائی دکھ اور افسوس کے ساتھ کہا: بھائی جان! آپ مجھے نہ پکڑیں اور مجھ پر غضبناک نہ ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے کمزور خیال کیا اور میری باتوں کی پروا نہیں کی بلکہ قریب تھا کہ یہ مجھے قتل کر دیتے۔ آپ ایسا کر کے مجھ پر دشمنوں کی زبانیں نہ کھلوائیں۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے جنگ کی تو آپ کہیں گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی۔

آہستہ آہستہ حضرت موسیٰؑ کا غصہ دھیما پڑ گیا اور وہ مسئلے کے حل کے بارے میں غور کرنے لگے۔ سب سے پہلے انہوں نے فساد کی جڑ کا پتا چلایا اور پھر سامری کو مخاطب کر کے کہا: تم نے یہ حرکت کیوں کی اور بنی اسرائیل کو کیوں گمراہ کیا۔

اس نے جواب دیا: میں نے وہ چیز دیکھی جو دوسرے لوگ نہیں دیکھ پائے۔ جس دن فرعون غرق ہوا میں نے خدائے تعالیٰ کے فرشتے جبرئیلؑ کی سواری کے پاؤں تلے کی مٹی اٹھائی تھی۔ پھر وہی مٹی میں نے بچھڑے کے منہ میں ڈال دی جس سے اس میں بولنے کی قوت پیدا ہو گئی اور لوگ اسے سجدہ کرنے لگے۔

اب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

اے لوگو! کیا خدائے تعالیٰ نے تم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ اگر تم اپنے ایمان میں ثابت قدم رہو گے تو بھلائی اور خوش نصیبی سے بہرہ مند ہو گے؟ تم نے میرے ساتھ کئے گئے عہد و پیمان سے سرتابی کیوں کی۔ کیا تم چاہتے تھے کہ تم پر خدا کا عذاب نازل ہو جائے؟

انہوں نے جواب دیا: ہم نے اپنی مرضی سے آپ کی حکم عدولی نہیں کی۔ اگر سامری ہمیں گمراہ نہ کر دیتا تو ہم خدا کی راہ میں ثابت قدم رہتے لیکن اس نے ہمارے ہی سونے کے زیورات سے یہ بچھڑا تیار کیا اور ہمیں بھکا دیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کیے پر ندامت اور پشیمانی کا اظہار کیا۔ خدائے تعالیٰ سے معافی مانگتے ہوئے کہا:

"اگر خدا ہم پر رحم نہ کرے اور ہمیں نہ بخشے تو ہم نقصان اٹھانیوالوں میں سے ہو جائیں گے۔"

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا: تم نے بچھڑے کی پرستش کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ اب خدا کی بارگاہ میں جا کر اس سے مغفرت طلب کرو۔ تاہم سامری کہ جو اس عظیم فتنے کو وجود میں لایا تھا۔ خدا نے

اس کو ایسے عذاب میں گرفتار کیا کہ نہ وہ لوگوں سے مل سکتا تھا اور نہ ان کی محفلوں میں شریک ہو سکتا تھا کیونکہ اسے لوگوں سے مل کر کوفت ہوتی تھی' اس لیے وہ مجبور تھا کہ وحشی جانوروں کی طرح جنگلوں میں رہا کرے۔ اس کے علاوہ اس کے لیے آخرت میں بھی دردناک عذاب مہیا فرمایا۔

حضرت موسیٰؑ نے طلائی بچھڑے کو آگ میں ڈال دیا اور اس کی راکھ سمندر میں پھینک دی۔ یوں انہوں نے اس جرم اور گناہ کے آثار تک مٹا دیے۔

تیہ

پریشانی کے چالیس سال

جب حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے قوم جو نعمتیں خدا نے تم کو دی ہیں ان کو یاد کرو۔ اس لیے کہ اس نے تمہی لوگوں میں سے بہتیرے پیغمبر بنائے' تمہی کو بادشاہ بھی بنایا اور تم کو وہ دیا جو ساری خدائی میں کسی کو بھی نہ دیا۔ اے میری قوم اس مقدس سرزمین کو چلو جو خدا نے تمہارے لیے لکھی ہے اور دشمن کو پیٹھ نہ دکھاؤ کہ اس میں خود تم الٹا گھاٹا کھاؤ گے۔

(سورۂ مائدہ۔ آیت ۲۰-۲۱)

آہستہ آہستہ بنی اسرائیل مقدس سرزمین (فلسطین) کے قریب ہوتے گئے۔ یہی وہ ملک ہے جس کے بارے میں خدا نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اسے بنی اسرائیل کو عطا کردے گا۔ وہ اس سرزمین کی بادشاہت انہیں عطا کریگا اور جو لوگ اس پر پہلے حکومت کر رہے ہوں گے وہ انہیں وہاں سے نکال دے گا۔

چونکہ بنی اسرائیل نے مصر میں سالہا سال ذلت اور خواری میں بسر کیے تھے۔ اس لیے ان میں مردانگی اور شجاعت کی روح مردہ ہو چکی تھی۔ وہ بیحد خوفزدہ تھے اور جوں جوں فلسطین کی جانب بڑھ رہے تھے موت ان کو اپنی آنکھوں کے سامنے کھڑی نظر آتی تھی۔ اس لیے کہ وہ اپنے اندر بادشاہوں سے جنگ لڑنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی جرأت ہرگز نہ پاتے تھے۔

بعدۂ جب حضرت موسیٰؑ کے جاسوس فلسطین سے واپس آئے اور انہوں نے وہاں کے باشندوں اور سپاہیوں کی ہمت اور طاقت کا ذکر کیا تو بنی اسرائیل کا خوف اور اضطراب اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ تب حضرت موسیٰؑ نے انہیں فلسطین چلنے پر آمادہ کرنے کی بے حد کوشش کی' لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ انہوں نے جواب دیا کہ تم اور تمہارا خدا جاؤ اور ان لوگوں کے خلاف جنگ کرو۔ ہم تو یہاں بیٹھیں گے اور جب وہ لوگ اس سرزمین کو خالی کردیں گے تو ہم بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔

حضرت موسیٰؑ بے بس ہو گئے' انہوں نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں اس قوم کی شکایت کی اور عرض کیا: اے پروردگار! میں فقط اپنے آپ پر اور اپنے بھائی پر اختیار رکھتا ہوں۔ اب تو ہی ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمادے۔

تب خدا نے انہیں وحی بھیجی کہ فلسطین کی سرزمین ان لوگوں پر حرام ہے اور یہ چالیس سال تک بیابانوں میں بھٹکتے پھریں گے۔

شاید بنی اسرائیل کی سرگردانی کی مدت چالیس سال اس لیے رکھی گئی ہو کہ جن لوگوں نے ذلت اور خواری کے ماحول میں تربیت پائی ہے، وہ مر جائیں اور ان کی بجائے وہ نوجوان نسل میدان میں آئے کہ جس کی روح فرعونیوں کے ہاتھوں ذلت اٹھا کر کچلی نہ گئی ہو۔ تاکہ وہ آگے بڑھ کر اپنی بہادری اور مردانگی کے بل بوتے پر وعدے کی سرزمین پر قبضہ کرے۔

چنانچہ وہ چالیس سال اسی بیابان میں گزر گئے اور حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ نے وہیں رحلت کی۔ پھر جب وہ مدت گزر گئی تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے جانشین یوشع بن نون کی رہنمائی میں فلسطین پر چڑھائی کی اور اپنے زور بازو کے ساتھ اس سرزمین پر قابض ہو گئے۔

بنی اسرائیل کی گائے

بنی اسرائیل میں ایک بوڑھا اور دولتمند شخص تھا کہ جس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس لیے جب وہ فوت ہوا تو اس کا تمام ترکہ اس کے بیٹے کو منتقل ہو گیا۔ تب اس کے چچا زاد بھائی اس سے حسد کرنے لگے اور اپنی غریبی اور اس کی ثروت مندی پر دل ہی دل میں کڑھنے لگے۔ انہوں نے اس کی بے حساب دولت پر قبضہ جمانے کی ٹھانی۔ پھر ایک رات اسے کھانے پر مدعو کر لیا، جب وہ آیا تو انہوں نے اس کو مار ڈالا اور اس کی لاش ایک گنجان آبادی کے محلے میں پھینک دی۔

اگلے دن انہوں نے اپنے گریبان چاک کیے اور سروں پر خاک

ڈالی اور اس محلے کے چند آدمیوں کو اپنے چچازاد بھائی کے قتل میں گرفتار کرلیا۔ اب ان بے گناہ لوگوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ حضرت موسیٰؑ سے رجوع کریں۔ چنانچہ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ آپ حقیقت حال کو ظاہر فرمائیں اور فریقین کے درمیان فیصلہ کریں۔

حضرت موسیٰؑ نے اس معاملے کو سمجھنے کے لیے خدا سے دعا کی اور پھر ان لوگوں سے کہا: خدائے تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو اور اس کی زبان مقتول کے جسم پر رکھو۔ تب وہ زندہ ہو جائیگا اور اپنے قاتل کے بارے میں وہ خود ہی سب کچھ بتا دے گا۔

وہ بنی اسرائیل کہ جن کی فطرت میں مغالطہ آمیزی اور بہانہ جوئی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، یوں گویا ہوئے: کیا تم ہم سے مذاق کر رہے ہو؟

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا: میں اس چیز سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں خدا کے بندوں کا مذاق اڑاؤں اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔

اگر بنی اسرائیل بلا چون و چرا اسی دن ایک گائے ذبح کر دیتے، تو انھیں کوئی پریشانی نہ اٹھانی پڑتی، لیکن وہ گائے کی پہچان کرنے کرانے میں وقت کو ٹالتے رہے۔ اس لیے خدا نے بھی ان پر سخت شرطیں عائد کیں جو ان کو پوری کرنی پڑیں۔

انہوں نے کہا: اے موسیٰؑ! خدا سے پوچھو کہ ہمیں کس طرح کی گائے ذبح کرنی چاہیے۔

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا: خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے

نہ بوڑھی ہو نہ جوان بلکہ اس کی عمر بڑھاپے اور جوانی کے درمیان کی ہو۔

انہوں نے کہا: اے موسیٰؑ! خدا سے دریافت کرو کہ اس گائے کا رنگ کیسا ہو؟

حضرت موسیٰؑ نے خدا سے پوچھ کر جواب دیا: وہ کھلتا ہوا زرد رنگ رکھتی ہو جسے دیکھ کر انسان کو سرور حاصل ہوتا ہو۔

بنی اسرائیل پھر سے کہنے لگے: اے موسیٰؑ! خدا سے دعا کرو کہ وہ اس گائے کے بارے میں اور زیادہ وضاحت کرے کیونکہ ہم اس کے متعلق شبہ میں پڑ گئے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے: وہ ایسی گائے ہے جو زمین میں ہل چلانے اور کنوئیں سے پانی کھینچنے کے لیے نہیں پالی گئی ہے۔ وہ ہر حیوانی عیب سے پاک ہے اور اس کا رنگ پکا زرد ہے۔

انہوں نے کہا: ہاں اب آپ نے پوری پوری بات بتادی ہے۔ پھر وہ ایسی ہی گائے کی تلاش کرنے لگے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے تمام مویشیوں میں انہیں فقط ایک گائے ملی کہ جس میں مذکورہ بالا تمام خصوصیات موجود تھیں۔ انہوں نے وہ گائے بڑی بھاری قیمت ادا کر کے خریدی۔ پھر اس کو ذبح کرنے سے قاتل کی شناخت ہوئی اور اسے قرار واقعی سزا دی گئی۔

قارون

قارون حضرت موسیٰؑ کی قوم میں سے اِن کا قریبی رشتہ دار تھا۔ شروع شروع میں وہ ایک صالح اور پرہیزگار شخص تھا لیکن جب تیہ میں

بنی اسرائیل کے توقف اور سرگردانی کی مدت لمبی ہو گئی تو قارون نے قوم سے کنارہ کشی اختیار کی اور کیمیا گری کا کام شروع کر دیا۔ اس عمل سے اس نے بیشمار دولت جمع کر لی اور سونے کے کئی خزانے جمع کر لیے۔ یہاں تک کہ اس کے خزانوں کی کنجیاں بہت سے طاقتور مرد اٹھایا کرتے تھے۔

دولت کی فراوانی نے قارون کو سرکش اور متکبر بنا دیا اور اس کو بدبختی کے گڑھے تک پہنچا دیا۔ وہ دولت کی بنا پر اپنی بڑائی جتاتا اور مومنین کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

بہت سے کوتاہ نظر لوگ بھی جب قارون کی شان و شوکت دیکھتے تو اس پر رشک کرتے اور کہتے: اے کاش! ہمارے پاس بھی قارون کی طرح دولت اور ساز و سامان ہوتا، جیسا کہ وہ زندگی سے بھرپور لطف اٹھا رہا ہے۔ تاہم قوم کے عقلمند لوگ ان سے کہتے: اے لوگو! قارون کی ظاہری شان و شوکت کو حسرت کی نگاہ سے مت دیکھو، کیونکہ با ایمان لوگوں کو خدا کی جناب سے ان کی نیکیوں کا جو ثواب ملتا ہے وہ ان چیزوں سے بہت بہتر اور گرانبہا ہے۔

بنی اسرائیل کے کچھ روشن ضمیر لوگ جب قارون کی اکڑ فوں دیکھتے تو اسے نصیحت کرتے اور کہتے: اے قارون! تم دنیا کے اس سونے چاندی پر خوش مت ہو، کیونکہ خدا ایسے لوگوں کو دوست نہیں رکھتا۔ تم اپنی اس بے پناہ دولت اور بیشمار نعمتوں کے ساتھ جو خدا نے تمہیں بخشی ہیں اپنی آخرت کو آباد کرو اور یہ مال خدا کی راہ میں خرچ کرو۔ دنیا کی زندگی سے فائدہ اٹھاؤ اور جس طرح خدا نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی اس کے بندوں کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ اور ان

پر احسان کرو۔ شرارت کے راستے پر مت چلو اور فسادی مت بنو کیونکہ پروردگار مفسد لوگوں کو دشمن رکھتا ہے۔

قارون جواب دیتا ہے: میں ایک علم (کیمیا) جانتا ہوں، جس کے ذریعے سے میں نے یہ دولت حاصل کی ہے۔ گویا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کئی ایسی قومیں جو اس (قارون) سے بھی زیادہ طاقتور اور دولتمند تھیں خدا نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا۔ تو پھر اس قادر مطلق کے لیے خود اسے ہلاک کرنا بھی ایک سہل اور آسان بات ہے۔

بہرحال قارون کی دولتمندی اور اس کی سرکشی اس حد تک پہنچ گئی کہ ایک دن جب موسیٰؑ اس کے خیمے میں داخل ہوئے تو اس نے انہیں تمسخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور خدا کے پیغمبر کو حقیر سمجھا۔ حضرت موسیٰؑ نے اس سے بڑی مہربانی اور ملائمت کے ساتھ پوچھا: تم بنی اسرائیل کے اجتماع میں کیوں شریک نہیں ہوئے جو خدا کی بارگاہ میں توبہ و استغفار کے لیے تشکیل دیا گیا تھا؟ قارون نے اس سوال کا جواب تمسخر اور رذالت کے ساتھ دیا۔ حضرت موسیٰؑ غمگین اور افسردہ خاطر ہو کر اس کے خیمے سے باہر آگئے اور خیمے کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئے۔ قارون نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ وہ موسیٰؑ کے سر اور کپڑوں پر کچھ راکھ اور گندہ پانی ڈال دیں۔

قارون نے حضرت موسیٰؑ کی جو توہین کی تھی انہوں نے اس پر بارگاہِ الٰہی میں فریاد کی۔ تب خدائے تعالیٰ نے قارون کی سرکشی، بغاوت اور محترم چیزوں کی توہین کرنے پر اسے اور اس کے تمام خزانوں

کو زمین میں دھنسا دیا اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔

جو لوگ قارون کی زندگی پر رشک کیا کرتے تھے، جب انہوں نے اس کا یہ حال دیکھا تو خوش ہو کر کہنے لگے: بہت اچھا ہوا کہ ہم قارون کی مانند نہیں تھے۔ ورنہ ہم بھی عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتے۔

بلاشبہ نیک بختی اور جاودانی بہشت ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو دنیا میں سرکشی اور بغاوت سے باز رہتے ہیں اور روئے زمین پر فساد برپا نہیں کرتے۔

ہارونؑ اور موسیٰؑ کی وفات

تبلیغ کا دور ختم ہو گیا اور حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کی آسمانی ماموریت انجام کو پہنچی۔ تب خدا کے حکم سے وہ دونوں کوہِ "ہود" پر گئے۔ وہاں جا کر ہارونؑ کی وفات ہو گئی اور حضرت موسیٰؑ نے ان کے جسدِ خاکی کو زمین میں دفن کر دیا۔ جب وہ بنی اسرائیل کے پاس واپس آئے اور انہیں ہارونؑ کی وفات کی اطلاع دی تو ان لوگوں نے حضرت موسیٰؑ پر الزام لگایا کہ خود انہوں نے ہی ہارونؑ کو قتل کیا ہے۔ اس پر خدا نے بنی اسرائیل کی آنکھوں کے آگے سے پردے اٹھا دیے تاکہ وہ جان جائیں کہ ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ نے قتل نہیں کیا۔ چنانچہ انہوں نے دیکھا کہ ہارونؑ صحیح و سالم زمین و آسمان کے درمیان ایک تخت پر بیٹھے ہیں۔ اس سے انہیں پتا چل گیا کہ ان پر طبعی موت وارد ہوئی ہے۔

کچھ مدت گزرنے کے بعد حضرت موسیٰؑ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوہِ ہود کی چوٹی پر گئے اور وہاں سے فلسطین اور بیت المقدس پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اسی مقام پر ان کی روح قبض کر لی گئی اور انہیں وہیں دفن کر دیا گیا۔

یوشع بن نون کہ جو حضرت یوسفؑ کی اولاد میں سے تھے، اب بنی اسرائیل کی قیادت انہوں نے سنبھالی۔ پھر وہ انہی کی رہنمائی میں وعدے کی سرزمین یعنی فلسطین میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن بنی اسرائیل کو احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کرنے کی جو عادت پڑ گئی تھی اس کے تحت اس موقع پر بھی انہوں نے خدا کے حکم کے خلاف عمل کیا اور اس کے بھیجے ہوئے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت ایوب علیہ السلام

حضرت ایوبؑ، اسحاقؑ کے پوتے اور افرائیم بن یوسفؑ کے داماد تھے۔ خدائے تعالیٰ نے انہیں نبوت کے منصب پر فائز کیا اور اپنی لامحدود نعمتوں سے بہرہ مند فرمایا۔ چنانچہ انہیں بہت سی بھیڑ بکریاں، شاداب زمینیں اور جاہ و جلال کی نعمتوں سے نوازا گیا۔

حضرت ایوبؑ خدا کی نعمتوں کا شکر اس طرح ادا کیا کرتے کہ ہمیشہ یتیم اور حاجتمند لوگ ان کے دسترخوان پر موجود ہوتے اور وہ اپنے اعزا و اقربا سے محبت اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔

شیطان کہ جسے اس وقت تک آسمانوں میں جانے کی اجازت تھی اور وہاں اس کا داخلہ ممنوع نہ ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے کرتے حضرت ایوبؑ کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا ہے اور فرشتے بھی ان کو عزت و احترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ چونکہ شیطان ہر وقت

اس کوشش میں رہتا ہے کہ نیک بخت لوگوں کو بد نصیبی میں مبتلا کر دے اور ایمان دار لوگوں کو خدا کے راستے سے بھٹکا دے۔ لہٰذا اس نے حضرت ایوبؑ کا مرتبہ گھٹانے اور انہیں بد بختی کے پاتال میں گرا دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا: اے پروردگار! یہ تمام شکر گزاری جو ایوبؑ کی طرف سے دیکھنے میں آتی ہے وہ ان بے حساب نعمتوں کی وجہ سے ہے جو تو نے انھیں بخشی ہیں لیکن اگر تو یہ نعمتیں ان سے واپس لے لے اور انہیں مصیبتوں میں مبتلا کر دے تو اس کی سپاس گزاری کا خاتمہ ہو جائے گا اور پھر وہ ہرگز تیری کسی بھی نعمت کا شکر ادا نہیں کرے گا۔ پس اب تو مجھے اس کی بے حساب دولت پر اختیار دیدے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ درست ہے۔

خدا تو اپنے بندوں کے تمام بھیدوں سے واقف ہے اور ان کے ظاہر و باطن کو بخوبی جانتا ہے۔ لہٰذا اس نے حضرت ایوبؑ کی ثابت قدمی اور ایمان کی پختگی کو دوسروں پر ظاہر کرنے کے لیے شیطان کی یہ بات منظور کر لی اور فرمایا:

> ہاں میں ایوبؑ کا مال و دولت اور اولاد تیرے اختیار میں دیتا ہوں اور تجھے ان چیزوں پر مسلّط کرتا ہوں۔

تب شیطان زمین پر آیا اور اس نے حضرت ایوبؑ کا تمام مال و دولت تباہ و برباد کر دیا اور ان کے فرزندوں کو ہلاک کر دیا۔

جب حضرت ایوبؑ کو اپنے مال و دولت کی تباہی اور فرزندوں کی ہلاکت کی خبر ملی تو ان کی شکر گزاری میں اضافہ ہو گیا اور انہوں نے پہلے سے بھی کچھ بڑھ کر حمد و ثنا کی۔ شیطان نے کہا: خدایا! اب تو مجھے

حضرت ایوبؑ کی زرخیز زمینوں اور بے شمار مویشیوں پر بھی مسلط کردے۔ تاکہ ان کی بے صبری ظاہر ہوجائے۔ اس پر خدا نے حضرت ایوبؑ کی تمام زمینیں اور مال مویشی شیطان کے اختیار میں دے دیے اور وہ سب کچھ اس کے ہاتھوں نیست و نابود ہوگیا لیکن اس تباہی کی خبر سے حضرت ایوبؑ کے دل میں رتی بھر اضطراب اور پریشانی پیدا نہ ہوئی بلکہ انکی شکرگزاری میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔

جب شیطان نے اپنے آپ کو شکست خوردہ اور عاجز پایا تو اس نے اپنا آخری حربہ آزمانے کے لیے خدائے تعالیٰ سے درخواست کی کہ وہ حضرت ایوبؑ سے ان کی صحت و تندرستی چھین لے اور انھیں بیماری میں مبتلا کردے تاکہ وہ بیماری کی تکلیف میں بے صبری کا مظاہرہ کریں اور ناشکرا پن دکھائیں۔

چنانچہ حضرت ایوبؑ بیمار ہوگئے' تاہم اس مصیبت کو بھی انہوں نے دوسری مصیبتوں کی طرح برداشت کرلیا اور انکے پائے ثبات میں کوئی لرزش نہ آئی۔

حضرت ایوبؑ کے فرزند چھن گئے تھے اور ناداری اور بیماری نے انھیں گھیر رکھا تھا۔ وہ دنیا پرست اور ظاہر بین لوگ کہ جو اصلی صورتِ حال سے بے خبر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت ایوبؑ پر یہ تمام مصیبتیں ان کے گناہوں کی وجہ سے آئی ہیں اور وہ پروردگارِ عالم کے مقام قرب سے دور ہوگئے ہیں حتیٰ کہ اپنے اس خیال کے تحت انہوں نے حضرت ایوبؑ سے ملنا جلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

حضرت ایوبؑ ان حالات سے مجبور ہوکر شہر سے چلے گئے اور

بیابان کے ایک گوشے میں سکونت اختیار کرلی۔ وہ ایک انسان کہ جو آخر تک ان کا وفادار رہا وہ ان کی حبدار بیوی (رحمہ) تھیں جو تکلیفیں اٹھاکر اور لوگوں کے گھروں میں ملازمت کر کے ان کے لیے کھانے پینے کا سامان مہیا کرتی رہیں۔

کئی سال اسی طرح گزر گئے، یہاں تک کہ حضرت ایوبؑ کے صبر اور استقامت نے شیطان کو بے بس کر دیا۔ تب اس نے ایک آواز لگائی، اس کے تمام چیلے اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس کی پریشانی کا سبب پوچھنے لگے۔ شیطان نے کہا: اس خدا کے بندے نے مجھے ہرا دیا ہے اور مجھے خدا کے سامنے شرمندہ کر دیا ہے۔ اب میں نے تم لوگوں کو اس لیے بلایا ہے کہ اس معاملے میں میری رہنمائی اور مدد کرو۔

انہوں نے کہا: تم وہ حربے کیوں استعمال نہیں کرتے جو گزشتہ امتوں کو گمراہ کرنے کے لیے استعمال کرتے رہے ہو۔ اس نے کہا: میں نے حضرت ایوبؑ پر اپنے تمام مکر و فریب آزما لیے ہیں لیکن وہ سب بیکار ثابت ہوئے ہیں۔ انہوں نے پوچھا: تم نے ان کے باپ حضرت آدمؑ کو کس طرح بہشت سے نکلوایا تھا؟ اس نے جواب دیا: ان کی بیوی کے ذریعے۔ انہوں نے کہا: اب بھی وہی طریقہ استعمال کرو اور حضرت ایوبؑ کو ان کی بیوی کے ذریعے گمراہ کرنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ اس کی بیوی کے علاوہ اس کے پاس کسی اور کی آمد و رفت نہیں ہے۔

شیطان نے یہ تجویز پسند کی اور فوراً ہی ایک آدمی کی شکل میں رحمہ کے پاس پہنچا۔ پھر اس کے دل میں وسوسے پیدا کرنے کے لیے کہنے لگا: تمام نعمتیں اور مال و دولت تمہارے ہاتھ سے جاتا رہا اور تم مصیبتوں

میں مبتلا ہو گئے۔ تمہارا شوہر بھی مریض، کمزور اور بوڑھا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اب یہ تمہاری تکلیفیں اور مصیبتیں دُور ہو جائیں گی۔ حضرت ایوبؑ کی بیوی نے اس کی یہ باتیں سن کر ایک آہ بھری۔ شیطان نے کہا: تم یہ بھیڑ ــــــ ایوبؑ کے پاس لے جاؤ ــــــ اور کہو کہ وہ اسے ذبح کرے، لیکن ذبح کرتے وقت خدا کا نام زبان پر نہ لائے تاکہ وہ بیماری سے شفا پائے۔ رحمہ فوراً حضرت ایوبؑ کے پاس آکر کہنے لگیں: اے ایوبؑ! تمہارا خدا کب تک تمہیں عذاب میں مبتلا رکھے گا؟ کیا وہ تم پر رحم نہیں کھائے گا؟ تمہاری وہ تمام دولت اور فرزند کیا ہوئے؟ تمہارے چہرے کی خوبصورتی کہاں گئی؟ آؤ اور خدا کا نام لیے بغیر اس بھیڑ کو ذبح کرو اور آرام پاؤ۔ حضرت ایوبؑ نے کہا: کیا خدا کا وہ دشمن تمہارے پاس آیا اور اس نے تمہارے دل میں وسوسہ ڈالا ہے جسے تم نے قبول کر لیا ہے؟

وائے ہے تم پر! بھلا یہ تو بتاؤ کہ وہ تمام نعمتیں جو ہمیں میسّر تھیں ہمیں کس نے دی تھیں؟ رحمہ نے جواب دیا: خدا نے حضرت ایوبؑ نے پوچھا: ہم نے کتنے سال ناز و نعمت میں بسر کیے؟ ان کی بیوی نے جواب دیا: اسّی سال۔ حضرت ایوبؑ نے کہا: جب سے خدا نے ہمیں ان تکالیف میں مبتلا کیا ہے، اسے کتنی مدت گزری ہے؟ ان کی بیوی نے کہا: سات سال۔ حضرت ایوبؑ نے کہا: وائے ہو تم پر کہ تم نے سخت ناانصافی کی ہے۔ تم نے اس وقت تک صبر کیوں نہیں کیا کہ اس تکلیف کی مدت ہماری آسائش کی مدت کے برابر ہو جاتی؟ پھر تم مجھ سے کہہ رہی ہو کہ میں یہ بھیڑ خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کروں۔ خدا کی قسم! اگر اس نے مجھے شفا بخشی تو میں تمہارے اس گناہ کے بدلے

میں تمھیں سو تازیانے لگاؤں گا۔ اب تم میرے پاس سے چلی جاؤ کہ تمہارا کھانا اور پانی مجھ پر حرام ہے اور آئندہ میں تمہارے ہاتھ سے کچھ نہیں کھاؤں گا۔ جب حضرت ایوبؑ کی بیوی مجبوراً وہاں سے چلی گئی تو انھوں نے خود کو انتہائی تکلیف اور مصیبت میں پایا۔ اس حال میں انھوں نے اپنی پیشانی خاک پر رکھی اور کہا:

اے پروردگار! تنگی اور سختی نے مجھے گھیر لیا ہے، تو ارحم الراحمین ہے۔ اپنی رحمت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ میرے لیے کھول دے اور مجھے نجات عطا کر دے۔

خدا نے ان کی دعا قبول کی اور ان کو وحی بھیجی کہ تم اپنا پاؤں زمین پر مارو۔ جب انھوں نے اپنا پاؤں زمین پر مارا تو وہاں پانی کا ایک چشمہ ابل پڑا۔ انھوں نے چشمے کے پانی میں غسل کیا تو ان کی تمام بیماریاں دور ہو گئیں اور ان کی شکل و شباہت پہلے کی سی ہو گئی۔ خدا نے ان کے صبر اور شکر گزاری کے بدلے میں ان کی دولت اور اولاد بھی انھیں لوٹا دی۔

اسی اثنا میں ان کی بیوی انھیں دیکھنے شہر سے وہاں آئی۔ لیکن اسے اپنا کمزور اور بیمار شوہر کہیں نظر نہ آیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہاں اس نے ایک خوبصورت مرد کو دیکھا جو بہترین لباس میں موجود تھا لیکن وہ اسے پہچان نہ پائی۔ اس نے اس شخص سے اپنے شوہر کے بارے میں پوچھنا بھی چاہا لیکن حیا آڑے آ گئی۔ تب حضرت ایوبؑ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: اے عورت!

تو یہاں کیا کرنے آئی ہے؟ اس نے جواب دیا: میں اپنے کمزور اور بیمار شوہر کو تلاش کر رہی ہوں، جو اس بیابان میں پڑا رہتا تھا۔ نہ جانے اب وہ کہاں چلا گیا ہے اور اس پر کیا افتاد پڑی ہے۔

حضرت ایوبؑ نے کہا: اگر تم اسے دیکھو تو پہچان لوگی؟ انکی بیوی نے کہا: تندرستی اور خوشحالی کے زمانے میں وہ قریب قریب تمہارے جیسا ہی تھا۔ انہوں نے کہا: سنو! میں وہی ایوبؑ ہوں کہ جسے تم شیطان کی پیروی کرنے کو کہہ رہی تھیں۔ تاہم میں نے خدا کی اطاعت کی اور اسی سے گزارش کی کہ وہ سبھی پہلی نعمتیں مجھے لوٹا دے۔ اس وقت حضرت ایوبؑ پر وحی آئی کہ تم نے اپنی بیوی کی تادیب کے لیے اسے سو تازیانے لگانے کی قسم کھائی تھی۔ پس اب تم سو کھجیوں کا ایک گٹھا بنا کر آہستہ سے بیوی کے بدن پر مارو، تاکہ تمہاری قسم بھی پوری ہو جائے اور تمہاری خدمت گزار بیوی کو کوئی تکلیف بھی نہ پہنچے کیونکہ وہ پریشانی اور سختی کے زمانے میں تمہاری وفادار رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خدا نے حضرت ایوبؑ کے صبر کے بدلے میں تمام کھوئی ہوئی نعمتیں انھیں لوٹا دیں اور پھر ان میں اتنا ہی اضافہ بھی کر دیا تاکہ یہ واقعہ روشن ضمیر اور عقلمند لوگوں کے لیے یادگار رہے اور جب کبھی وہ مصائب اور مشکلات میں مبتلا ہوں تو صبر سے کام لیں اور خدا ہی سے نجات طلب کریں۔

حضرت داؤد علیہ السلام

بنی اسرائیل نے یوشع بن نون کی رہنمائی میں فلسطین کی سرزمین پر قدم رکھے اور وہاں سکونت اختیار کرلی۔ یوشع نے اپنی تمام عمر بنی اسرائیل کے درمیان گزاری اور ان کے دینی اور معاشرتی امور کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد قاضیوں نے بنی اسرائیل کے امور کی نگرانی کی۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی وفات سے لے کر ۳۵۶ سال کی مدت تک بنی اسرائیل کا کوئی بادشاہ نہ تھا اور ان کے امور کی باگ ڈور قاضیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس زمانے کے پیغمبر بھی قاضیوں ہی کی رہنمائی کرتے تھے اور وہ ان کے اور خدا کے درمیان واسطہ بنے رہتے تھے۔

اس دوران میں ہمسایہ قوموں مثلاً عمالقہ، مدیانیوں، فلسطینیوں اور دوسروں نے بنی اسرائیل پر حملے بھی کیے۔ ان لڑائیوں میں کبھی وہ قومیں اور کبھی بنی اسرائیل غالب ہوتے تھے۔

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد چوتھی صدی کے وسط میں بنی اسرائیل نے فلسطینیوں کے خلاف جنگ لڑی۔ اس جنگ میں وہ تابوت عہد (توریت اور تبرکات نبوت کا صندوق) بھی اپنے ساتھ لے گئے، تاکہ وہ ان کی فتح کا ذریعہ بنے۔ تاہم اس جنگ میں فلسطینی غالب رہے اور بنی اسرائیل کو شکست ہوگئی۔

تابوت عہد کھو دینے کے بعد بنی اسرائیل ذلت اور بدبختی میں مبتلا ہوگئے اور انھوں نے کئی سال بڑی بے کسی کی حالت میں بسر کیے۔ لیکن پھر اچانک ہی ہوش میں آگئے اور انھیں اپنی ذلت آمیز زندگی سے وحشت ہونے لگی۔ چنانچہ وہ اپنے وقت کے پیغمبر (سموئیلؑ) کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ معین کر دیں۔ تاکہ ہم اس کے ہم رکاب رہ کر اپنے دشمنوں سے جنگ کریں اور اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرلیں۔ سموئیلؑ کہ جو بنی اسرائیل کے عادات اور خیالات سے واقف تھے، وہ خوب جانتے تھے کہ بنی اسرائیل کمزور ارادے کے لوگ ہیں۔ آپ نے ان سے کہا: مجھے ڈر ہے کہ جب خدا تمھیں جنگ کرنے کا حکم دے گا تو تم جنگ میں سستی دکھاؤ گے، میدان سے بھاگ نکلو گے اور خدا کی اس نافرمانی کے نتیجے میں اس کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

انھوں نے جواب دیا ہم کیوں سستی دکھانے لگے، جب کہ دشمنوں نے ہمیں وطن، گھر اور اولاد سے جدا کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ جنگ لڑنے کی تمام صلاحیتیں ہم میں موجود ہیں۔ لہٰذا یہ محال ہے کہ ہم جنگ میں ڈھیل اور سستی کا مظاہرہ کریں۔

سموئیلؑ نے کہا: خدا نے طالوت کو تمہارا بادشاہ بنا دیا ہے تاکہ تم اس کی سرپرستی میں دشمنوں کے خلاف جنگ کرو۔ طالوت حضرت یعقوبؑ کے بیٹے بنیامین کی اولاد میں سے تھا۔ وہ ایک ایسا وجیہہ جوان تھا جس کا ثانی بنی اسرائیل میں نہیں مل سکتا تھا۔ لیکن وہ مالی لحاظ سے تہی دست اور نادار تھا۔

بنی اسرائیل نے طالوت کی ناداری کو ایک بہت بڑا عیب شمار کیا اور کہا: وہ ہمارا بادشاہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اس کے مقابلے میں ہم اس منصب کے زیادہ اہل ہیں۔ کیونکہ وہ ایک نادار آدمی ہے اور اس کے پاس چنداں مال و دولت نہیں ہے۔

سموئیلؑ نے کہا: لیکن خدا نے اسے چن لیا ہے اور تمہارا بادشاہ قرار دیا ہے۔ نیز اس کے علم و دانش اور جسمانی قوت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ وہ "تابوتِ عہد" تمہیں واپس دلا دے گا۔

جب فلسطینیوں نے بنی اسرائیل سے تابوت عہد چھین لیا تھا۔ اس کے بیس سال سات ماہ بعد طالوت کے ہاتھوں وہ بنی اسرائیل کو واپس مل گیا۔

یوں طالوت نے "تابوت عہد" واپس لا کر اپنا بادشاہی کے لائق ہونا ثابت کر دیا اور پھر بنی اسرائیل نے اس کی سرکردگی میں فلسطینیوں کی جانب کوچ کیا۔ اس دوران میں طالوت نے ان سے کہا: اے لوگو! خدا تمہاری آزمائش کر رہا ہے اور ہم جلد ہی ایک نہر کے پاس پہنچنے والے ہیں۔ پس جو لوگ اس نہر کا پانی پئیں گے وہ میرے ساتھی نہیں ہیں، بلکہ جو لوگ وہ پانی پینے سے باز رہیں گے وہ میرے سچے پیرو ہوں گے۔

تاہم اس بیابان میں پیاس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ جب وہ اس نہر کے پاس پہنچے تو ان میں سے اکثر لوگ صبر نہ کر سکے اور انہوں نے پانی پی لیا لیکن تھوڑے سے لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا اور نہر کا پانی نہ پیا۔ کیونکہ وہ خدا کی اطاعت کو نفسانی خواہش پر ترجیح دینے والے تھے۔

طالوت اور اس کے وہ چند ساتھی نہر عبور کر گئے لیکن انکی تعداد بہت کم تھی اس لیے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے: ہم جالوت اور اس کے سپاہیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ خود جالوت ایک بہادر اور طاقتور شخص ہے اور اس کی فوج بھی کیل کانٹے سے لیس ہے، کہاں ہم اور کہاں وہ کثیر فوج؟

تاہم کچھ دوسرے مومنین نے انہیں تسلی دی اور کہا: اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک چھوٹی فوج نے خدا کی مدد سے ایک بڑی فوج پر غلبہ پا کر فتح حاصل کی ہے۔ لہٰذا افراد کی کمی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ شکست کھائیں گے۔

داؤدؑ کے ذریعے بنی اسرائیل کی فتح

طالوت کی فوج میں داؤدؑ نام کا ایک نوعمر لڑکا بھی تھا لیکن وہ جنگ لڑنے کے لیے بنی اسرائیل کے ہمراہ نہیں آیا تھا کیونکہ اس کے تین بڑے بھائی اس فوج میں شامل تھے۔ چنانچہ اس کے باپ نے اسے محض اس لیے بھیج دیا تھا کہ جنگ ختم ہونے پہ وہ اپنے بھائیوں کی خیر خبر لے آئے گا۔

جنگ کے دنوں میں ایک بار نوعمر داؤدؑ نے کیا دیکھا کہ دشمن کی طرف سے جالوت میدان میں آیا اور اس نے اپنا مدمقابل طلب کیا۔ لیکن بنی اسرائیل کی طرف سے کسی شخص کو اس کے مقابلے پر جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ تب جالوت نے میدان جنگ میں نعرے لگائے اور بنی اسرائیل پر اپنی برتری جتانے لگا۔

اب داؤدؑ نے ایک آدمی سے پوچھا: اگر کوئی شخص جالوت کو قتل کردے تو اسے کیا ملے گا۔ اس نے کہا: بادشاہ اسے بہت بڑا انعام دے گا۔ اپنی بیٹی کو بادشاہ اس سے بیاہ دے گا۔ نیز اس کے خاندان کو حکومت میں مرتبہ و اقتدار حاصل ہو جائے گا۔

یہ سن کر داؤدؑ کے دل میں جالوت سے لڑنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اگرچہ اس سے پہلے انہوں نے یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا اور نہ انہیں جنگ کا کوئی تجربہ تھا۔ تاہم وہ فوراً ہی بادشاہ کے پاس پہنچے اور اس سے جنگ لڑنے کی اجازت چاہی۔ تب بادشاہ نے انہیں اس خطرناک مقابلے سے خبردار کیا لیکن داؤدؑ نے جواب میں کہا: لیکن میں خود کو جالوت سے جنگ لڑنے کے قابل سمجھتا ہوں۔ کیونکہ کچھ دن پہلے جب ایک شیر نے میرے باپ کی بھیڑوں پر حملہ کیا تو میں نے اسے مار ڈالا۔ نیز اس کے ساتھ ایک ریچھ بھی تھا اور میں نے اس کا بھی خاتمہ کردیا۔

یہ بہادرانہ گفتگو سن کر طالوت نے انہیں جنگ کا لباس پہنایا اور میدان میں بھیج دیا۔ لیکن داؤدؑ نے جنگ کا بھاری لباس پہنے ہوئے اپنے آپ کو بے آرام محسوس کیا۔ چنانچہ انہوں نے وہ لباس اتار دیا اور اپنے عام لباس میں ہی میدان جنگ میں اتر گئے۔ اس وقت ان کے

پاس فقط ایک چھوٹا سا عصا اور پانچ پتھر تھے جو انہوں نے بیابان سے اٹھائے تھے اور وہ ان کو بھیڑ بکریں چراتے وقت استعمال کرتے تھے۔ جب وہ جالوت کے سامنے پہنچے تو اپنی گوپھن میں ایک پتھر رکھا اور خدا کا نام لے کر جالوت پر پھینک دیا۔ وہ تڑاخ سے جالوت کی پیشانی پر جا لگا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ حضرت داؤدؑ نے اس کی تلوار اٹھائی، اس کا سر دھڑ سے جدا کیا اور لا کر طالوت کے سامنے پیش کر دیا۔ جالوت کی فوج اپنے بادشاہ کے مارے جانے کے بعد مقابلے کی تاب نہ لا سکی اور بھاگ نکلی۔ تب طالوت نے حضرت داؤدؑ کے کارنامے کو سراہا اور انہیں اپنی لڑکی کا رشتہ دینے کا اعلان بھی کیا۔

رفتہ رفتہ حضرت داؤدؑ نے طالوت کے دربار میں ایک اعلیٰ مقام پیدا کر لیا۔ حتیٰ کہ طالوت نے اپنی بیٹی میکال کا نکاح حضرت داؤدؑ سے کر دیا اور ان کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنا دیا۔ علاوہ ازیں طالوت کے بیٹے یوناثان اور حضرت داؤدؑ کے درمیان بھی بڑے گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔ نیز عام لوگوں کی نظر میں بھی آپ کی عزت و عظمت بڑھتی گئی۔

حضرت داؤدؑ کے ساتھ لوگوں کے دلی لگاؤ کی وجہ سے ان کے بارے میں طالوت کے خیالات کسی حد تک تبدیل ہو گئے اور اس کے دل میں بدگمانی پیدا ہو گئی۔ حتیٰ کہ اس نے ان کو قتل کر دینے کی ٹھان لی۔ اس پر یوناثان نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے باپ کے دل سے یہ غلط بات نکال دے لیکن اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

اس کے بعد طالوت نے حضرت داؤدؑ کو کئی ایک خطرناک جنگوں میں بھیجا کہ شاید وہ دشمنوں کے ہاتھوں مارے جائیں لیکن حضرت داؤدؑ

نے ان تمام جنگوں میں فتح پائی۔ آخر کار طالوت نے حضرت داؤدؑ کے قتل کا منصوبہ تیار کرلیا۔ تاہم حضرت داؤدؑ کو اس کی بدنیتی کا پتا چل گیا۔ چنانچہ وہ راتوں رات وہاں سے نکل گئے اور ایک پہاڑ کے غار میں جا ٹھہرے۔ جہاں ان کے بھائی اور خاندان کے دوسرے افراد بھی ان سے آملے۔ نیز بہت سے نادار اور مصیبت زدہ لوگوں نے بھی ان کے پاس پناہ لے لی۔ اب حضرت داؤدؑ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک ہمسایہ ملک میں پناہ گزین ہوگئے اور آئندہ رونما ہونیوالے واقعات کا انتظار کرنے لگے۔

طالوت کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور وہ دن رات حضرت داؤدؑ کو قتل کرنے کے وسیلے تلاش کرتا رہا۔ جب اسے پتا چلا کہ حضرت داؤدؑ فلسطینیوں کے پاس رہ رہے ہیں تو اس نے فلسطینیوں کے خلاف فوج کشی کر دی لیکن اس جنگ میں اس کو شکست ہوگئی۔ حتیٰ کہ اس کے سپاہی تتر بتر ہوگئے اور وہ اپنے بیٹوں سمیت فلسطینیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

اسی دوران میں اس وقت کے پیغمبر سموئیلؑ وفات پا گئے اور جیسا کہ انہوں نے حضرت داؤدؑ کو خبر دی تھی، طالوت کے مارے جانے کے بعد وہ سلطنت حضرت داؤدؑ کے ہاتھ آگئی۔

حضرت داؤدؑ نے اپنی حکومت کے دوران میں کئی ایک جنگیں لڑیں۔ ان تمام جنگوں میں فتح اور کامیابی حضرت داؤدؑ کے حصے میں ہی آئی اور انہوں نے کئی دوسرے ممالک کو بنی اسرائیل کی قلمرو میں شامل کیا۔

داؤدؑ کے معجزے

خدائے تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو نہ صرف سلطنت ہی عطا کی، بلکہ اس کے علاوہ اس نے انہیں بہت سی دوسری نعمتیں بھی بخشی تھیں کہ جو درحقیقت ان کی نبوت کی نشانیاں شمار ہوتی تھیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ان کا ذکر آیا ہے اور وہ نعمتیں یہ تھیں:

- پہاڑ ان کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے۔ یعنی جب حضرت داؤدؑ خدا کی تسبیح اور ذکر میں مشغول ہوتے تو پتھر کے ٹکڑے بھی وہی ذکر کرنے لگ جاتے اور ان کے تسبیح پڑھنے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔
- پہاڑوں کی طرح پرندے بھی ان کے ساتھ خدا کی تسبیح پڑھا کرتے تھے۔
- خدائے تعالیٰ ان کے ہاتھ میں لوہے کو موم کی طرح نرم کر دیتا تھا۔ چنانچہ وہ اسے آگ اور دیگر اوزاروں کے بغیر ہی جیسے چاہتے موڑتے اور جو چیز بھی چاہتے بنا لیتے تھے۔
- خدا نے انہیں لوہے کی زرہ بنانے کا علم سکھایا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی کڑیوں کو جوڑ کر لوہے کا ایسا کوٹ بناتے کہ جو آرام دہ ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کو دشمن کے ہتھیاروں کی کاٹ سے بھی بچاتا تھا۔ اس سے پہلے لوگ زرہ کی بجائے اپنے بدن پر لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے باندھ لیتے تھے جو انہیں بڑی تکلیف پہنچاتے تھے لیکن حضرت داؤدؑ کے ہاتھوں زرہ تیار ہو جانے کے بعد ان کی یہ مشکل حل ہو گئی۔
- خدائے تعالیٰ نے ان کے تخت حکومت کو مضبوط کیا اور انہیں

ہر جنگ میں دشمنوں پر فتح اور کامیابی عطا فرمائی۔

- خدائے تعالیٰ نے انھیں حکمت (نبوت) اور فصل خطاب (حق اور باطل میں تمیز) کرنے کی بصیرت عطا کی۔
- خدا نے انھیں زبور ایسی کتاب عطا کی جسے وہ خوش الحانی سے پڑھتے تھے اور لوگوں کے دلوں کو خدا کی طرف متوجہ کرتے تھے۔

داوُدؑ کے بارے میں دو داستانیں

پہلی داستان کہ جس میں حضرت سلیمانؑ بھی شریک ہیں وہ یہ ہے: ایک شخص کی بھیڑیں رات کے وقت کسی دوسرے شخص کے انگور کے باغ میں داخل ہوگئیں اور اس کے تمام خوشے کھا گئیں۔ باغ کے مالک نے حضرت داوُدؑ کے سامنے دعویٰ پیش کیا اور فیصلے کی درخواست کی۔ اسی اثنا میں خدائے تعالیٰ کی طرف سے حضرت داوُدؑ کو الہام ہوا کہ اپنے فرزندوں کو جمع کرو اور اس مقدمے کا فیصلہ ان سے کراوٴ۔ ان میں سے جو بھی صحیح جواب دے گا اسے تمہاری جانشینی نصیب ہوگی۔

حضرت داوُدؑ نے اپنے فرزندوں کو جمع کیا اور معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ تاہم گیارہ سالہ حضرت سلیمان کے علاوہ کوئی بھی جواب نہ دے سکا۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا: بھیڑیں باغ کے مالک کے سپرد کر دیجیے تاکہ وہ ان کے دودھ، پشم اور بچوں سے بہرہ مند ہو۔ حتیٰ کہ انگور کا یہ باغ اپنی اصلی حالت پر آجائے اور پھل دینے لگے۔ حضرت سلیمان کے اس فیصلے کی تائید خدا کی جانب سے بھی ہوئی اور یوں ان کی جانشینی کا معاملہ طے پا گیا۔

دوسری داستان یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ نے دن تقسیم کر دیے اور ہر دن کو ایک خاص کام کے لیے مخصوص کر دیا۔ چنانچہ ایک دن عبادت کے لیے، ایک دن لوگوں کے مقدمات کے فیصلے کرنے کے لیے، ایک دن وعظ و نصیحت کے لیے اور ایک دن آرام کے لیے مقرر کیا تھا۔

وہ دن جو حضرت داؤدؑ نے اپنے آرام کے لیے مقرر کیا تھا، اس دن دربان کسی کو ان کے مکان میں قدم نہیں رکھنے دیتے تھے۔ چنانچہ انہی خلوت کے دنوں میں سے ایک دن دو فرشتے انسان کی شکل میں مکان کی چھت پر سے اتر کر ان کے پاس آئے۔ حضرت داؤدؑ ان کی وضع قطع کو دیکھ کر گھبرا گئے، لیکن انہوں نے کہا: آپ ڈریں نہیں کہ ہم دونوں آپ کے پاس ایک مقدمہ لے کر آئے ہیں۔ پس آپ ہمارے درمیان فیصلہ کر دیں۔

ان میں سے ایک نے کہا: یہ میرا بھائی ہے اور اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں، لیکن میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے۔ یہ مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک بھیڑ بھی مجھے دیدو۔ حضرت داؤدؑ نے کہا: یہ اس کی زیادتی ہے کہ تم سے کہہ رہا ہے کہ وہ ایک بھیڑ بھی مجھے دیدو۔ ہاں تو بہت سے لوگ ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال انجام دیتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں۔

اس موقع پر حضرت داؤدؑ کو اچانک خیال آیا کہ انہوں نے فیصلہ دینے میں جلدی کی ہے کیونکہ مدعی سے ثبوت مانگنے اور مدعا علیہ سے پوچھ گچھ کیے بغیر ہی فیصلہ دیدیا ہے۔ پس وہ خدا کے حضور سجدے

میں گر گئے اور اپنی جلدبازی پر اس سے مغفرت کے طلبگار ہوئے۔

اس بحث کے خاتمے پر یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ سورۂ صٓ کی آیت ۲۱ کی توجیہہ، تشریح اور تفسیر کے ذیل میں جو کچھ اہل بیت اطہارؑ کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ جو ہم نے بیان کیا ہے۔ لیکن بعض سنی علماء نے تحریف شدہ توریت کو سامنے رکھتے ہوئے اس ضمن میں اوریاہ اور اس کی بیوی کی داستان نقل کی ہے۔ اس طرح انہوں نے خدا کے معصوم پیغمبر حضرت داؤدؑ سے ایسی ناروا باتیں منسوب کی ہیں جو وہ خود اپنے آپ سے منسوب کیے جانے پر قطعاً راضی نہیں ہیں۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جو اپنی جہالت کے باعث انبیائے کرامؑ پر ایسے بہتان باندھتے ہیں۔

ان داستانوں کے نتائج

حضرت داؤدؑ کی سیرت و کردار سے بہت سے نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ یہاں ہم ان میں سے بعض کی جانب اشارہ کرتے ہیں:

اول: یہ کہ خدائے تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو بنی اسرائیل میں سے منتخب کیا اور انکے ہاتھوں ایسے بڑے بڑے کام کرائے کہ جنکا کرنا بظاہر ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ ایک نوعمر لڑکے تھے اور بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے لیکن خدا نے جالوت کو ان کے ہاتھوں ہلاک کرایا۔ نوعمر حضرت داؤدؑ نے اسے اس وقت مار ڈالا جب کہ بڑے بڑے لاوِر بھی اس سے مقابلہ کرتے ہوئے کانپتے تھے۔ پھر یہ کہ اسے تلوار یا کسی اور جنگی ہتھیار سے نہیں بلکہ ایک چھوٹے سے پتھر کے ساتھ مارا

جو انھوں نے گوپھن میں رکھ کر پھینکا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ خدا جسے چاہے بہترین صلاحیتیں دیتا اور جسے چاہے منتخب کر لیتا ہے۔ علاوہ ازیں سرکش لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ خدا اتنا قدرت والا ہے کہ وہ انہیں معمولی چیزوں کے ساتھ کمزورترین افراد کے ہاتھوں بھی ہلاک کرا سکتا ہے۔

دوم: یہ کہ کمزور لوگوں کو اپنی کامیابی اور بلند مرتبے پر پہنچنے سے مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ انہیں خدا کی طرف توجہ رکھتے اور اس پر توکل کرتے ہوئے عمل پیرا ہونا اور اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

سوم: یہ کہ جالوت پر فتح پانے سے حضرت داوؑد میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ان میں خود پسندی اور تکبر پیدا نہیں ہوا بلکہ اس بڑی کامیابی نے ان کی فروتنی میں اضافہ کیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خدا کے شکرگزار بن گئے۔

چہارم: یہ کہ خدا کی اطاعت کرنے اور اس کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے جیسا کہ حضرت داؤدؑ کی اطاعت اور شکرگزاری پر خدائے تعالیٰ نے انہیں مزید نعمتیں عطا کیں مثلاً لوہے کو ان کے ہاتھوں میں موم کر دیا، زرہ بنانا سکھایا اور حضرت سلیمانؑ جیسا فرزند عطا کیا، جو ان کے علم و دانش اور تخت و تاج کا وارث بنا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

خدائے تعالیٰ کے ارادے سے حضرت داؤدؑ کی نبوت اور سلطنت حضرت سلیمانؑ کو منتقل ہوگئی حالانکہ وہ انکے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔

حضرت سلیمانؑ کی مملکت اپنے باپ سے بھی بڑی تھی کیونکہ خدا نے انہیں ہوا پر اختیار دیا تھا کہ وہ جہاں بھی جانا چاہیں وہ انکا تخت اٹھا کر وہیں لے جائیں جنات کو ان کے ماتحت کر دیا کہ وہ انکی خدمت کریں اور پرندوں کو ان کا مطیع بنادیا کہ وہ اپنے پروں سے ان کے سر پر سایہ کریں۔ پھر پروردگار عالم نے انھیں پرندوں کی بولیاں بھی سکھائیں اور غیر معمولی فہم و فراست عطا کی۔ ان تمام نعمتوں کی بدولت سلیمانؑ کی سلطنت ایک بے مثال سلطنت بن گئی اور اس میں تمام ظاہری قوتیں یکجا ہوگئیں۔

حضرت سلیمانؑ کے تخت کے بارے میں صحیح اور قطعی معلومات

حاصل نہیں ہیں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کی شکل کیسی تھی اور وہ کتنا بڑا تھا۔ یعنی آیا وہ ایک تخت ہی تھا کہ جس پر حضرت سلیمانؑ اور ان کے چند خاص مصاحبین بیٹھتے تھے یا وہ ایک قالین تھا کہ جس کی لمبائی چوڑائی کئی فرسنگ تھی اور اس پر آپ کے وزیر' اہلکار اور ہزاروں سپاہی بھی بیٹھا کرتے تھے۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ وہ ایک ایسا اڑن کھٹولا تھا جو ہوا کے زور سے حرکت کرتا تھا اور حضرت سلیمانؑ جس جگہ بھی جانا چاہتے تھے وہ انھیں وہاں لے جاتا تھا۔

خدا کے حکم سے جنات بھی حضرت سلیمانؑ کے حضور میں زرخرید غلاموں کی طرح خدمات بجالاتے تھے۔ وہ ان کے لیے عالیشان مکان اور بڑے بڑے حوض تعمیر کرتے تھے۔ نیز سمندروں کی تہ سے گرانبہا جواہرات نکال لاتے تھے جن کو حسب ضرورت کام میں لایا جاتا تھا۔

چیونٹیوں کی وادی

حضرت سلیمانؑ اپنے ایک اہم سفر میں جنوں' انسانوں اور پرندوں کا لشکر ہمراہ لیے ہوئے بڑی شان و شوکت کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ ان کا گزر چیونٹیوں کی وادی میں سے ہوا۔ تب ایک چیونٹی کہ جو ان کی سردار تھی' اس نے انھیں خطرے سے آگاہ کیا اور با آواز بلند کہا: اے چیونٹیو! اپنے بلوں اور بھٹوں میں داخل ہو جاؤ تاکہ حضرت سلیمانؑ اور ان کے لشکر والے تمھیں کچل نہ ڈالیں۔

تب ہوا نے اس چیونٹی کی آواز حضرت سلیمانؑ تک پہنچائی۔ حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا کہ اس چیونٹی کو ان کے سامنے حاضر کیا جائے۔

جب وہ آئی تو انھوں نے اس سے پوچھا، کیا تم یہ نہیں جانتی ہو کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور انبیاء کے کسی پر ظلم و ستم روا رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے جواب دیا: جی ہاں مجھے اس بات کا علم ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا: یہ جانتے ہوئے بھی تم نے ایسی باتیں کیوں کیں اور چیونٹیوں کو ہم سے کیوں ڈرایا؟ اس نے جواب دیا: میں نے محسوس کیا کہ اگر چیونٹیاں آپ کا عالیشان لشکر اور بے نظیر اقتدار دیکھیں گی تو جو نعمتیں خدا نے انہیں دی ہیں، وہ انھیں حقیر سمجھیں گی اور ناشکر گزاری کی مرتکب ہوں گی۔ اس لیے میں نے چاہا کہ اس خطرے سے ان کی حفاظت کروں۔

جب حضرت سلیمانؑ نے اس کا یہ عاقلانہ جواب سنا تو خاموش ہو گئے۔ اب چیونٹی نے ان سے پوچھا:

کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کا تخت ہوا کے دوش پر کیوں اڑتا ہے؟ نیز تمام قوتوں اور بالخصوص ہوا کی قوت کو آپ کے تخت کو اٹھانے پر کیوں مامور کیا گیا ہے؟ حضرت سلیمانؑ نے جواب دیا: میں نہیں جانتا۔ چیونٹی نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو جتا دیا جائے کہ یہ تخت اور یہ سلطنت ہرگز دائمی چیزیں نہیں ہیں اور ان کا انحصار ہوا پر ہے۔

سلیمانؑ اور بلقیس

سب پرندے خدا کے فرمان سے حضرت سلیمانؑ کے تابع تھے اور ضرورت کے وقت اپنے پروں سے ان کے سر پہ سایہ کرتے اور سورج کے سامنے ان کے لیے ایک سائبان بنا دیتے تھے۔

ایک دن حضرت سلیمانؑ نے محسوس کیا کہ سورج کی دھوپ ان کے

چہرے پر پڑ رہی ہے۔ جب انھوں نے اوپر نگاہ کی تو وہاں ہُدہُد نظر نہ آیا۔ اس کے یوں اچانک اور بے موقع غائب ہو جانے پر حضرت سلیمانؑ کو غصہ آیا اور انہوں نے کہا: اگر وہ اپنی غیر حاضری کے لیے کوئی معقول عذر پیش نہیں کرے گا تو ہم اسے سخت سزا دیں گے یا ذبح کر ڈالیں گے۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ ہُدہُد آموجود ہوا۔ تب اس نے اپنے غائب ہونے کی وجہ بیان کی اور کہا:

میں نے ایک ملک دیکھا تو مجھے پتا چلا کہ آپ کو اس کا علم نہیں ہے۔ چنانچہ میں ملک سبا کے بارے میں آپ کے لیے ایک تازہ خبر لایا ہوں۔ اس مملکت پر ایک عورت حکمرانی کرتی ہے کہ جسے مکمل اقتدار حاصل ہے اور بالخصوص اس کا تخت بہت بڑا اور قابل دید ہے لیکن جو چیز افسوسناک ہے وہ یہ ہے کہ اس سرزمین کے باشندے اور بادشاہ سبھی سورج کے آگے سجدہ کرتے ہیں۔ ان پہ جہالت اور نادانی اس حد تک مسلّط ہو چکی ہے کہ انہوں نے خدائے بزرگ و برتر کو بھلا دیا ہے اور بے جان موجودات کے سامنے سرتسلیم خم کرنے لگے ہیں۔

جب حضرت سلیمانؑ نے یہ خبر سنی تو فرمایا: ہم اس بارے میں تحقیقات کریں گے تاکہ ہمیں تمہارے سچ اور جھوٹ کا پتا چل جائے۔ اب تم ہمارا خط لے جا کر ان لوگوں تک پہنچاؤ اور پھر دیکھو کہ وہ کس ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔

ہُدہُد نے حضرت سلیمانؑ کا خط لیا اور سبا کے ملک کی جانب

پرواز کر گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے وہ خط ملکۂ سبا کے سامنے زمین پر ڈال دیا۔ ملکہ نے اپنے مصاحبین کی طرف دیکھا اور کہا: بلاشبہ ہمیں ایک بہت عظیم اور قابلِ احترام خط ملا ہے، جو حضرت سلیمانؑ کی طرف سے آیا ہے اور اس کا مضمون یہ ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ تم لوگ مجھ سے سرکشی نہ کرو۔ سب کے سب اسلام اختیار کرو اور مسلمان ہو کر میرے پاس آؤ۔"

اب تم بتاؤ کہ اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

وزیروں اور درباریوں نے جواب دیا: ہم اچھی خاصی طاقت کے مالک ہیں اور جنگ کے وقت دلاور اور جنگجو بھی ہیں۔ تاہم حکم دینا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ جو بھی حکم دیں گی ہم اسکی تعمیل کریں گے۔

ملکہ نے ان کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ دھاوا بولنے اور جنگ کرنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن اسے ان کا نظریہ پسند نہ آیا اور اس نے انھیں سمجھایا کہ جب تک کسی کام کو صلح صفائی سے انجام دینا ممکن ہو جنگ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ کیونکہ جب بادشاہ کسی ملک پر قبضہ کر لیتے ہیں تو اس کے حالات بدل کر رکھ دیتے ہیں اور وہاں کے معزز لوگوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں۔ اس لیے میں حضرت سلیمانؑ کو کچھ تحفے بھیج رہی ہوں۔ تاکہ ان کے طور طریقے کو سمجھ سکوں اور دیکھوں کہ پیغمبروں کا طرزِ عمل کیسا ہوتا ہے۔

چنانچہ ملکہ نے اپنی رائے کے مطابق بڑے قیمتی تحفے تیار کرائے اور اپنی قوم کے کچھ اہلِ علم لوگوں کے ہاتھ حضرت سلیمانؑ کی خدمت

میں بھیج دیے۔ چونکہ حضرت سلیمانؑ کو ملکۂ سبا کے اس طرزِ عمل کا علم ہو گیا تھا' اس لیے انہوں نے حکم دیا کہ ایک شاہی محل کو بہترین طرز پر سجایا جائے اور بلقیس کے نمائندوں کو اس محل میں ٹھہرایا جائے۔

جب وہ نمائندے حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عظیم عمارتیں اور عالیشان محل دیکھ کر حیران رہ گئے اور اپنے تحفے پیش کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کرنے لگے۔

حضرت سلیمانؑ نے انہیں بڑی خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا اور ان کے آنے کی وجہ پوچھی۔ نیز یہ بھی دریافت کیا کہ تم لوگوں نے ہمارے خط کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔

ملکہ کے نمائندوں نے اس کے بھیجے ہوئے تحفے حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں پیش کر دیے لیکن انہوں نے ان تحفوں پر سرسری نظر ڈالی اور کہا: یہ تحفے اپنی مالکہ کے پاس واپس لے جاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی نعمتیں عطا کی ہیں جتنی اور کسی کو نہیں دیں۔ اس صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں تمہارے ان معمولی تحفوں کی خاطر اپنی رسالت کی تبلیغ کا کام ترک کر دوں اور تمہارے تحفوں پر فریفتہ ہو جاؤں؟ نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔ میری نگاہ میں ان تحفوں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ لیکن تم ان تحفوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے ہو۔ ہاں! اب تم لوگ واپس چلے جاؤ اور میں قوم سبا کی طرف ایک فوج بھیج رہا ہوں کہ جس کا مقابلہ کرنے کی ان میں تاب نہ ہو گی۔ پھر میں انہیں اس ملک سے ذلت اور خواری کے ساتھ نکال کر دربدر کر دوں گا۔

بلقیس کے نمائندے واپس چلے گئے اور وطن واپس پہنچ کر انہوں

نے اپنی ملکہ کو سارا قصہ سنایا۔ بلقیس نے تھوڑی دیر کے لیے سوچا اور پھر کہنے لگی: مجھے حضرت سلیمانؑ کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ بہتر ہو گا کہ جتنی جلدی ہو سکے ہم ان کی دعوت قبول کرلیں اور ان پر ایمان لے آئیں۔ بالآخر یہی فیصلہ ہوا اور ملکہ اپنی قوم کے بزرگوں کو ساتھ لے کر حضرت سلیمانؑ کی طرف چل پڑی۔

اس سے پیشتر کہ ملکہ اور اس کے ساتھی حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں پہنچیں۔ آپ نے دربار میں بیٹھے ہوئے سربرآوردہ جنوں اور انسانوں کو مخاطب کیا اور فرمایا: تم میں سے کون ہے جو بلقیس کے یہاں پہنچنے سے پہلے اس کا تخت میرے پاس لا سکے؟

ایک جن نے کہا: میں اس بات کی قدرت رکھتا ہوں کہ آپ کے اپنی جگہ سے اٹھنے سے پیشتر وہ تخت لا کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لیکن درباریوں میں سے ایک اور شخص کہ جو علوم الٰہی سے واقف تھا۔ اس نے کہا: میں آپ کے آنکھ جھپکنے سے پہلے ہی وہ تخت آپ کے پاس لا سکتا ہوں۔

پھر جونہی حضرت سلیمانؑ نے نگاہ اٹھائی تو تخت اپنے سامنے پڑا پایا۔ تب آپ نے کہا: یہ خدائے تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جس سے ہم آزمائے گئے ہیں کہ آیا اس کا شکر بجا لاتے ہیں یا ناشکرے پن کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص خدا کی نعمتوں کا شکر بجا لائے تو وہ اپنی ہی ذات پر احسان کرتا ہے اور اگر کوئی کفران نعمت کرتا ہے تو پروردگار اس سے بے نیاز اور بلند ہے۔

اب حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا کہ تخت کی وضع بدل دی جائے

تاکہ پتا چل سکے کہ بلقیس اسے پہچان پاتی ہیں یا نہیں ...... اور جب ملکہ سبا اور اس کے ارکان حکومت حضرت سلیمانؑ کے پاس پہنچے تو آپ نے ملکہ سے پوچھا کیا تمہارا تخت ایسا ہی ہے؟ بلقیس نے تخت پر حیرت سے نظر ڈالی اور کہا: یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی ہے لیکن وہ حیران تھیں کہ اگر یہ تخت میرا ہی ہے تو یہاں کیسے آ گیا؟

ملکہ کی آمد سے پہلے حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا تھا کہ بلور کا ایک محل تیار کیا جائے اور اسے ملکہ سبا کے استقبال کے لیے سجایا جائے۔ چنانچہ آپ ملکہ کو بلور کے محل کی جانب لے گئے۔ چونکہ محل کا فرش بھی شیشے اور بلور کا بنا ہوا تھا، اس لیے بلقیس یہ سمجھیں کہ محل میں پانی کھڑا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا لباس پنڈلیوں تک اوپر کھینچ لیا تاکہ پانی میں سے گزر سکیں۔

حضرت سلیمانؑ نے فرمایا: یہاں پانی نہیں ہے بلکہ شیشہ اور بلور ہے۔ تب بلقیس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ کہنے لگیں:

اے پروردگار! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا کہ اب تک تیرے علاوہ کسی اور خدا کی پرستش کرتی رہی۔ لیکن اب میں (حضرت) سلیمان کے ہاتھ پر ایمان لے آئی ہوں اور اپنے دل کو تیری جانب متوجہ کر لیا ہے۔

سلیمانؑ کی وفات

حضرت سلیمانؑ نے ایک طویل مدت تک عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی۔ سبھی لوگ ان کے عادلانہ طرزِ عمل کی بدولت خوشی

اور آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ آپ کی عمر کا سورج غروب ہونے کے قریب آ گیا۔ چنانچہ ایک دن جب حضرت سلیمانؑ عصا پر ٹیک لگائے اپنے بلوریں محل میں اکیلے کھڑے تھے اور اپنے ملک کے خوشنما مناظر اور عالیشان عمارتوں کو دیکھنے میں مشغول تھے۔ اس وقت انھیں اپنے محل میں ایک اجنبی شخص آتا دکھائی دیا۔ آپ نے اس سے پوچھا: تم کون ہو اور میری اجازت کے بغیر اس محل میں کیوں داخل ہوئے ہو؟

اس نے جواب دیا: میں وہ شخص ہوں کہ جسے مکانوں اور حویلیوں میں داخل ہونے کے لیے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ میں ملک الموت ہوں اور آپ کی روح قبض کرنے آیا ہوں۔ جب حضرت سلیمانؑ نے اس کا نام سنا اور انہیں پتا چلا کہ وہ کس افسوسناک مقصد کے ساتھ آیا ہے تو لرز گئے اور کہنے لگے: کیا تم مجھے اتنی مہلت دے سکتے ہو کہ میں اپنے کام کی جانچ پڑتال کر لوں؟ فرشتے نے کہا: ایسا نہیں ہو سکتا اور پھر انھیں بیٹھنے تک کی مہلت دیے بغیر ان کی روح قبض کر لی۔

اس کے بعد حضرت سلیمانؑ کا بے جان جسم ایک طویل مدت تک عصا کے سہارے کھڑا رہا۔ ان کے لشکری جب محل کی بلوریں دیواروں میں سے دیکھتے تو وہ خیال کرتے کہ حضرت سلیمانؑ زندہ ہیں اور اندر سے انہیں دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ ان کے رعب داب کے باعث مدتوں کسی کو محل میں داخل ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ خدائے تعالیٰ نے دیمک کو بھیجا کہ جس نے ان کا عصا چاٹ لیا اور وہ زمین پر گر گئے۔

اس پر لوگوں کو معلوم ہوا کہ حضرت سلیمانؑ تو ایک بڑے عرصے سے فوت ہو چکے ہیں اور ہمیں اس کا پتا ہی نہیں چلا۔

حضرت یونس علیہ السلام

حضرت یونسؑ بن متی نے پروردگار کے حکم سے نبوت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا اور نینوا کے لوگوں کو سیدھا راستا دکھانے میں مشغول ہو گئے اور اس بت پرست قوم کو خدا کی طرف بلایا۔

چونکہ اس قوم کی روح میں بت پرستی راسخ ہو گئی تھی اس لیے انھوں نے حضرت یونسؑ کی بات ماننے سے انکار کیا اور کہا: تم کیسی باتیں کر رہے ہو اور یہ کیسا جھوٹ موٹ کا پیغام ہے جو تم ہمارے لیے لائے ہو؟ یہ وہی بت ہیں کہ ہمارے ماں باپ جن کی پرستش کیا کرتے اور ان کے سامنے جھکتے اور ان سے ڈرا کرتے تھے۔ ان کی پیروی کرتے ہوئے ہم بھی ان بتوں کی پرستش سے روگردانی نہیں کریں گے اور اپنے خداؤں کو نہیں چھوڑیں گے۔

حضرت یونسؑ نے انھیں اپنے آباؤ اجداد کی غلط راہ اور ان کی

اندھی تقلید کرنے پر ملامت کی اور کہا:

اے لوگو! ذرا اپنی عقل سے کام لو اور اپنے دل کی آنکھوں سے وہم کا پردہ ہٹا کر دیکھو کہ آیا یہ بت اس قابل ہیں کہ ان کی پرستش کی جائے؟ کیا یہ بے جان ڈھانچے تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ سنو! تمہارا یہ ناپسندیدہ طرزِ عمل خدا کے قہر اور غضب کا موجب بنے گا۔ پس تمہیں چاہیے کہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے سے پہلے ہی اپنی نجات کی فکر کرو۔

لیکن وہ لوگ اپنی ضد اور سرکشی پر قائم رہے اور کہنے لگے: اے یونسؑ! تم خواہ مخواہ کی زحمت نہ اٹھاؤ اور ہمیں اپنے خدا کی طرف ہرگز نہ بلاؤ۔ پھر تم کچھ بھی کرو، ہم نہ تو تمہارے خدا پر ایمان لانے والے ہیں اور نہ اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

حضرت یونسؑ اپنی قوم کی اس ہٹ دھرمی سے بے حد غمگین ہوئے اور ان کی احمقانہ باتوں پر بہت غصہ آیا اور اسی غصے کے عالم میں وہ اس قوم کو چھوڑ کر بیابان میں چلے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ میں نے اپنا فریضہ انجام دیدیا ہے اور اب اس قوم کو دعوت دینا بے سود ہے۔ اس طرح انہوں نے خدا کی جانب سے کوئی حکم ملنے سے پہلے ہی قوم سے قطع تعلق کر لیا۔

حضرت یونسؑ کے جانے کے بعد خدا کی طرف سے عذاب نازل ہونے کے آثار پیدا ہو گئے۔ ایک دم فضا میں ایسی تبدیلی آئی کہ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ اب قوم کو اپنے گناہ کا احساس ہوا اور

وہ لوگ اپنی غلطی کو سمجھ گئے۔ ان کے درمیان ایک عالم اور عاقل شخص تھا کہ جوان کا بڑا ہمدرد اور خیر خواہ تھا۔ چنانچہ اس شخص نے اسی وقت انہیں اپنے پاس بلایا اور کہا:

دیکھو! خدا کے بھیجے ہوئے عذاب کے آثار ظاہر ہو گئے ہیں۔ پس تمہیں چاہیے کہ عذاب نازل ہونے سے پہلے توبہ کرو اور خدائے تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔

تب اس قوم کے سب بوڑھے، جوان مرد اور عورتیں اس عالم کے ہمراہ شہر سے بیابان میں آئے۔ وہاں بچے اپنی ماؤں سے اور مرد اپنی بیویوں سے الگ ہوئے اور سب نے خدا کی بارگاہ میں گریہ وزاری شروع کر دی۔ پھر ان کے نالہ و فریاد کی آوازیں پورے بیابان میں گونجنے لگیں۔ ان کے اس عمل کے بدلے میں ان لوگوں کے لیے رحمت خداوندی کا دریچہ کھول دیا گیا اور اس قوم پہ آنے والا عذاب ٹل گیا۔

یونسؑ سمندر میں

حضرت یونسؑ غصے کے عالم میں اپنی قوم کو چھوڑ کر بیابان میں چلے گئے اور پھر کافی مسافت طے کرنے کے بعد سمندر کے کنارے جا پہنچے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک کشتی میں بیٹھے ہیں اور وہ چلنے کو تیار کھڑی ہے۔ حضرت یونسؑ نے ان لوگوں سے کہا: مجھے بھی کشتی میں بٹھا لیں۔ چونکہ ان کے چہرے سے بزرگی اور جلال کے آثار

ظاہر تھے اس لیے کشتی میں سوار مسافروں نے انہیں خوش آمدید کہا اور انہیں اپنے ساتھ بٹھالیا۔

اس کے بعد کشتی روانہ ہو گئی اور رفتہ رفتہ ساحل سے دور ہوتی چلی گئی۔ جب وہ سمندر کے بیچ میں پہنچی تو اس کو تیز و تند لہروں سے دوچار ہونا پڑا اور سب مسافروں کے ڈوب کر مر جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ لہٰذا ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ قرعہ ڈالا جائے اور جس کے نام کا قرعہ نکلے اسے سمندر میں پھینک دیا جائے، تاکہ یہ طوفان تھم جائے اور کشتی کے ڈوبنے کا خطرہ باقی نہ رہے۔

جب قرعہ ڈالا گیا تو وہ حضرت یونسؑ کے نام پر نکلا۔ تاہم مسافروں نے ان کا احترام کرتے ہوئے دوبارہ قرعہ ڈالا لیکن دوسری بار بھی قرعہ انہیں کے نام کا نکلا۔ پھر بھی مسافروں نے یہ نہ چاہا کہ وہ ایسے بزرگوار شخص کو سمندر میں پھینک دیں۔ چنانچہ انہوں نے تیسری بار قرعہ ڈالا لیکن نتیجہ پھر بھی وہی رہا۔ لہٰذا اب ان لوگوں کے لیے حضرت یونسؑ کو سمندر میں پھینک دینے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ رہا۔ تب حضرت یونسؑ کو بھی یہ احساس ہوا کہ شاید مجھ پر یہ وقت اس لیے آیا ہے کہ میں نے ترکِ اولیٰ کیا ہے اور خدا کے حکم کا انتظار کیے بغیر ہی اپنی قوم کو چھوڑ آیا ہوں۔ چنانچہ یہ خیال کرتے ہوئے کہ بہرحال اس کام میں بھی خدا کی کوئی حکمت ہے۔ انہوں نے بلا چون و چرا اپنے آپ کو سمندر میں گرا دیا اور بپھری ہوئی موجوں میں گم ہو گئے۔

اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ نے ایک بڑی مچھلی کو حکم دیا کہ وہ یونسؑ کو نگل لے لیکن وہ انہیں ہضم نہ کرے اور کوئی تکلیف نہ پہنچائے بلکہ

دل وجان سے ان کو اپنی پناہ میں رکھے تاکہ امرِ الٰہی پورا ہو جائے۔
حضرت یونسؑ کو اس مچھلی کے پیٹ میں رہتے ہوئے کئی دن گزر گئے۔ اس دوران میں وہ سمندر میں تیرتی ہوئی اس کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتی رہی۔ اس عجیب اور پریشان کن قید خانے میں حضرت یونسؑ بے حد گھبرا گئے۔ چنانچہ اس غم اور پریشانی کے عالم میں انہوں نے خدائے تعالیٰ سے پناہ طلب کی اور ان انتہا تاریکیوں میں خدا کے حضور دعا کی:

اے پروردگار! تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب سے پاک ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میں ہی قصوروار ہوں۔

خدا نے ان کی دعا قبول فرمائی اور مچھلی کو حکم دیا کہ وہ انہیں سمندر کے کنارے پر ڈال دے۔ تب مچھلی نے سمندر کے کنارے پر آکر انہیں اگل دیا۔ جبکہ وہ تھکن اور کمزوری کی حالت میں تھے۔ چونکہ ان کے بدن میں سورج کی دھوپ سہارنے کی طاقت نہ رہی تھی اس لیے خدا نے ان کے پاس کدو کا ایک پودا اگا دیا تاکہ وہ اس کے پتوں کے سائے میں آرام کریں اور اس کا پھل کھائیں، حتّٰی کہ ان کی کھوئی ہوئی قوت بحال ہو جائے۔

چند ہی دنوں میں حضرت یونسؑ پہلے کی طرح صحت مند اور توانا ہو گئے۔ پھر خدا نے انھیں وحی بھیجی کہ تم اپنی قوم کے پاس واپس جاؤ کیونکہ وہ لوگ ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے بتوں کی پرستش چھوڑ دی ہے۔ جب حضرت یونسؑ اپنی قوم کے پاس پہنچے تو وہ بڑے متعجب

ہوئے کہ ان لوگوں نے بت پرستی کیسے ترک کردی ہے اور اب خدا کے نام کا ورد کر رہے ہیں۔

تاہم حضرت یونسؑ کی قوم نے ان کا شاندار استقبال کیا اور وہ ایک نئے جوش سے ان کی ہدایت اور رہنمائی میں مشغول ہو گئے۔

اصحابِ رس

اصحابِ رس (سلیمانؑ بن داؤدؑ کے بعد) اپنے زمانے میں ایک بہت بڑے دریا کے کنارے آباد تھے جس کا نام "رس" تھا۔

وہ بڑا دریا کہ جس میں ہمیشہ پانی کی فراوانی رہتی تھی۔ ان لوگوں نے اس کے دونوں کناروں پر ایسی آبادیاں اور کھیتیاں بنا رکھی تھیں جو ہر لحاظ سے قابلِ تعریف تھیں۔ خوشگوار پانی، پھل بھرے درخت، اناج اور مویشی، عمدہ آب و ہوا اور دلکش مناظر۔ غرضیکہ انھیں خوشحال زندگی گزارنے کے تمام اسباب میسر تھے۔

اس دریا کے کنارے صنوبر کا ایک درخت تھا، جو موافق آب و ہوا کی بدولت غیر معمولی طور پر پھیل گیا تھا اور بلندی میں گویا آسمان سے باتیں کرنے لگا تھا۔ یہ دیکھ کر شیطان نے اس قوم کو ورغلایا اور انہیں اس درخت کی پرستش کرنے کی پٹی پڑھادی۔ چنانچہ وہ لوگ اس کے

قریب میں آگئے اور صنوبر کے درخت کی پرستش کرنے لگے۔ پھر وہ اس درخت کی شاخیں دوسری آبادیوں میں بھی لے گئے۔ وہاں ان کو لگایا، ان کی پرورش کی اور پھر انہیں کو پوجنے لگے۔

رفتہ رفتہ صنوبر کے درخت پر ان لوگوں کا اعتقاد اتنا قوی ہوگیا کہ وہ خدا کو یکسر بھلا بیٹھے۔ اب وہ صنوبر کے درخت کے لیے قربانیاں کرتے اور اسی کے آگے سجدے کرتے تھے۔

پھر اس قوم کی جہالت اور نادانی اس سے بھی آگے بڑھ گئی۔ تب انھوں نے اس بڑے دریا کا پانی اپنے اوپر حرام کرلیا اور اپنے لیے دوسرے چشموں کا پانی لانے لگے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ چونکہ ہمارے خدا کی زندگی اس دریا کے پانی سے وابستہ ہے لہٰذا اس کے علاوہ کسی اور کو یہ پانی استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی انسان یا حیوان وہ پانی پی لیتا تو وہ لوگ اسے بڑی بے رحمی سے قتل کردیتے۔

اصحاب رس سال کے سال ایک عید مناتے تھے۔ اس موقع پر وہ صنوبر کے درخت کے نیچے جمع ہوتے، بھیڑ بکریاں قربان کرتے اور پھر انہیں آگ میں جلا ڈالتے تھے۔ جب اس آگ کے شعلے لپکتے اور دھواں آسمان کی طرف بلند ہوتا تو وہ لوگ زمین پر گرجاتے اور درخت کے آگے گریہ زاری کرتے۔ اس پر شیطان مختلف طریقوں سے ان کا دل بہلاتا اور انہیں درخت کی پرستش کرکے زیادہ سے زیادہ خوشی حاصل کرنے میں لگائے رکھتا تھا۔

کئی سال اسی طرح گزر گئے اور وہ قوم اسی گمراہی اور ضلالت میں زندگی گزارتی رہی۔ حتیٰ کہ خدا نے ان لوگوں کی رہنمائی اور نجات

کے لیے ان میں سے آلِ یعقوبؑ کے ایک شخص کو نبوت کے منصب پر فائز کیا اور اسے اس قوم کی ہدایت پر مامور کیا۔ چنانچہ دوسرے پیغمبروں کی طرح اس پیغمبر نے بھی تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ انہوں نے لوگوں کو ہر ہر موقع پر اس درخت کی پرستش سے منع کیا اور خدائے واحد کی عبادت کرنے کی دعوت دی۔ تاہم وہ قوم اس کی تبلیغ سے ذرہ برابر بھی متاثر نہ ہوئی اور وہ لوگ درخت کی پرستش سے قطعاً باز نہ آئے۔ اسی دوران میں اس قوم کی عید کا دن آ پہنچا اور سبھی لوگوں میں عید منانے کے لیے جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ حتیٰ کہ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ وہ عید کی رسوم ادا کرنے میں ضرور شرکت کرے۔

تاہم جب اس محترم پیغمبر نے اس قوم کی ہٹ دھرمی دیکھی تو خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی: اے پروردگار! تو اس صنوبر کے درخت کو خشک کر دے تاکہ یہ لوگ اس بات کو سمجھ پائیں کہ یہ درخت پرستش کے قابل نہیں ہے۔

چنانچہ اس پیغمبر کی یہ دعا قبول ہوئی اور پھر اچانک ہی وہ درخت سوکھ گیا۔ اس کے سبز پتے زرد پڑ گئے اور زمین پر گر پڑے۔ تاہم بجائے اس کے کہ یہ حادثہ لوگوں کے دلوں کو دہلاتا اور وہ اس درخت کی عبادت ترک کر دیتے۔ ان پر اس کا الٹا اثر ہوا اور کچھ لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا: ہو نہ ہو اس پیغمبر نے یہ درخت جادو کے زور سے سکھا دیا ہے۔ بعض افراد نے کہا: یہ شخص جو پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، ہمارے خدا کو تحقیر اور تمسخر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ چونکہ ہماری قوم نے اسے کوئی سزا نہیں دی، اس لیے ہمارا خدا ناراض ہو گیا ہے اور اس نے یہ شکل

اختیار کرلی ہے۔ پس اب اس شخص کو انتہائی تکلیف دہ طریقے سے قتل کردینا چاہیے تاکہ ہمارا خدا دوبارہ ہرا بھرا ہوجائے۔

پھر انہی بیہودہ خیالات کے ماتحت ان لوگوں نے اپنے پیغمبر کو قتل کرنے کا قطعی فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ ایک گہرا کنواں کھودا گیا اور پیغمبر کو اس میں گرادینے کے بعد اس کے دہانے پر بہت بڑا پتھر رکھ دیا گیا۔

تب اس محترم پیغمبر کی آواز کچھ دیر تک تو کنوئیں کے اندر سے بھی سنائی دیتی رہی، لیکن پھر وہ آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی اور خدا کے نبی نے اسی اندھے کنوئیں میں ہی اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

لیکن اصحاب رس کے اس ظالمانہ اور بے رحمانہ فعل پر خدائے تعالیٰ کے غضب کا سمندر جوش میں آگیا اور ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ عذاب الٰہی کے آثار نظر آنے لگے۔ چنانچہ لال آندھی اس زور سے چلی کہ اس نے لوگوں کو اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹخ پٹخ دیا۔ پھر ایک سیاہ بادل نے ان پر سایہ ڈالا۔ اس میں سے خدا کے غضب کی ایسی آگ برسی کہ ظالم اور گمراہ لوگ جل کر راکھ ہوگئے اور دنیا والوں کے لیے سامان عبرت بن گئے۔

حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام

حضرت زکریاؑ کی عمر تقریباً نوے سال کی تھی۔ ان کے بال سفید تھے، بدن کی طاقت کمزور تھی اور کمر جھک گئی تھی لیکن اب تک ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ حضرت زکریاؑ ایک مردِ آزاد اور دنیا کی بندھنوں سے بے نیاز انسان تھے۔ تاہم وہ بے اولاد ہونے کی وجہ سے اداس اور غمگین نظر آتے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ میری زندگی کا آفتاب غروب ہونے والا ہے۔ میرا سلسلۂ حیات کوئی دم میں ختم ہونے والا ہے اور میں اب اس دنیا سے جانے والا ہوں۔ میرے چچازاد بھائی نالائق ہیں اور وہ لوگوں کی رہنمائی نہیں کر پائیں گے اور انہیں مذہبی امور کے انجام دینے پر آمادہ نہیں کرسکیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میری تمام کوششیں اکارت جائیں گی اور لوگ راہِ حق سے منحرف ہو جائیں گے۔

اگرچہ حضرت زکریاؑ اس بارے میں دن رات سوچتے رہتے تھے لیکن

وہ اپنے آپ کو خدائے تعالیٰ کے ارادے اور مشیت کے تابع سمجھتے تھے اور انہیں اطمینان تھا کہ اس کام میں کوئی ایسی حکمت پوشیدہ ہے کہ جس سے وہ بے خبر ہیں۔

ایک دن جب حضرت زکریاؑ بیت المقدس پہنچے تو سیدھے حضرت مریمؑ کے حجرے کی جانب گئے کیونکہ انھوں نے حضرت مریمؑ کی سرپرستی کی ذمہ داری قبول کر رکھی تھی اور وہی ان کی ضروریات پوری کیا کرتے تھے۔ جب انہوں نے حجرے میں قدم رکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت مریمؑ عبادت میں مشغول ہیں اور حجرے کے ایک کونے میں پھلوں سے بھرا ہوا ایک برتن رکھا ہے۔

تب حضرت زکریاؑ وہ پھل دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ پہلی بات تو یہ تھی کہ حضرت مریمؑ کے حجرے میں کسی کا آنا جانا نہیں تھا۔ اس حجرے کا تالا فقط حضرت زکریاؑ کھولتے تھے اور وہی بند کرتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ پھل تو موسم گرما کے تھے اور حضرت زکریاؑ انہیں موسم سرما میں دیکھ رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے حضرت مریمؑ سے پوچھا: یہ پھل کہاں سے آئے ہیں؟

حضرت مریمؑ نے جواب دیا: میرے لیے یہ پھل بارگاہ الٰہی سے صبح وشام آتے ہیں اور خدا جسے بھی چاہے بے حساب روزی دیتا ہے۔

حضرت مریمؑ کے یہ الفاظ سن کر اور خدا تعالیٰ کی نعمتیں اور عنایتیں دیکھ کر حضرت زکریاؑ کی کیفیت ہی بدل گئی اور وہ کسی گہری سوچ میں چلے گئے۔ وہ سوچ رہے تھے جو خدا اپنے بندوں پہ اتنا مہربان ہے کہ ان کے لیے بے حساب روزی بھیجتا ہے اور ان پہ بے حد احسان کرتا ہے۔ اس

سے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس بوڑھے کی تمام تر کمزوری اور ناتوانی کے باوجود اس پر نظرِ عنایت ڈالے اور اس بڑھاپے میں بھی اسے فرزند عطا کر دے۔ لہٰذا اس مشکل کے حل کرنے کے لیے اسی سے درخواست کرنی چاہیے۔

یہ خیالات حضرت زکریاؑ کے دماغ سے اسی طرح گزرے جیسے بجلی چمک جاتی ہے۔ انہوں نے اسی رات محراب عبادت میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کہا:

اے پروردگار! مجھے تنہا نہ چھوڑ اور ایک فرزند عنایت کر دے جو علم اور حکمت میں میرا جانشین اور وارث ہو۔

حضرت زکریاؑ کے مقام اور مرتبے کا تقاضا ہی یہ تھا کہ ان کی دعا قبول ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی وہ محراب عبادت میں ہی تھے کہ فرشتوں نے انہیں خبر دی کہ خدائے تعالیٰ آپ کو یحییٰ نام کا ایک بیٹا عنایت کرے گا۔

دن ایک ایک کر کے گزرتے گئے اور بالآخر حضرت زکریاؑ کی بیوی میں حمل کے آثار ظاہر ہو گئے۔ پھر خدا نے انہیں ایک خوش شکل۔ نیک سیرت بیٹا عطا فرمایا۔ وہ بیٹا کہ جسے لڑکپن میں ہی علم و حکمت عنایت کی گئی اور پھر وہ نبوت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہوا۔

یہ فرزند یحییٰ تھے جو لڑکپن میں ہی پروردگار کی عبادت کے شائق ہو گئے۔ یہاں تک کہ لگاتار عبادت اور گریہ کرنے سے ان کا بدن نحیف اور لاغر ہو گیا۔ حضرت یحییٰؑ علوم دینی سے پوری طرح واقف تھے اور اصول و فروع، نیز توریت کے احکام کا بھی علم رکھتے تھے۔ وہ لوگوں کو

دین کے مسائل سکھاتے اور ان کی علمی مشکلات کو حل کرتے تھے۔ وہ احکامِ دین کے اجرا اور لوگوں کی رہنمائی کے بارے میں بے حد سنجیدہ اور مستعد تھے۔ اگر وہ لوگوں کو گناہ کا ارتکاب کرتے دیکھتے تو اس پر بے حد ناراض اور غضب ناک ہو جاتے اور انہیں گناہوں سے باز رکھنے کی کوشش کرتے۔

ایک دن بعض لوگوں نے حضرت یحییٰؑ کو بتایا کہ فلسطین کا بادشاہ ہیرودوس اپنی خوبرو بھتیجی (یا ربیبہ) ہیرودیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ انہیں یہ سن کر سخت غصہ آیا اور انہوں نے کہا کہ یہ شادی احکامِ دین کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ توریت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

حضرت یحییٰؑ کی یہ رائے سارے شہر میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پھیل گئی اور تمام محفلوں میں اس کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ یہ خبر ہیرودیا کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔

ہیرودیا اپنے آپ کو ملک کی ہونے والی ملکہ سمجھتی تھی اور بادشاہ کی بیوی بننے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے یہ بات سنی تو دنیا اس کی نظروں میں تاریک ہو گئی اور وہ حضرت یحییٰؑ کی جانی دشمن بن گئی۔

ایک موقع پر جب بادشاہ نے ایک محفلِ عیش سجا رکھی تھی۔ یہی ہیرودیا پورے بناؤ سنگھار کے ساتھ اس محفل میں آئی اور وہاں اس نے دل لبھانے کے تمام حربے آزما ڈالے۔

بادشاہ جو پہلے ہی اس کا عاشقِ زار تھا وہ اس پر اور بھی فریفتہ ہو گیا اور اس سے کہنے لگا: بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟

ہیرودیا نے کہا: اگر تم واقعی مجھ سے پیار کرتے ہو تو میری خواہش یہ ہے کہ یحییٰؑ کو قتل کرا دو۔ ہوس پرست بادشاہ کہ جو دین کے احکام

اور ضمیر کی آواز کو بھلا بیٹھا تھا' اس نے حضرت یحییٰؑ کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بادشاہ کے کارندے حضرت یحییٰؑ کو پکڑ کر اس کے پاس لے آئے اور انہیں قتل کر دیا۔ لیکن جب حضرت یحییٰؑ کا خون زمین پر گرا تو وہ ابلنے لگا۔ اس پر مٹی ڈالی گئی لیکن وہ پھر بھی ابلتا رہا۔ چنانچہ وہ اس پر بار بار مٹی ڈالتے رہے حتیٰ کہ وہاں مٹی کا ایک بہت بڑا تودہ لگ گیا لیکن پھر بھی خون ابلتا ہی رہا۔

ایک مدت تک حضرت یحییٰ کا خون ابلتا ہی رہا حتیٰ کہ بخت نصر نے حملہ کیا اور بنی اسرائیل کے ستر ہزار افراد کو اسی تودے پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یوں حضرت یحییٰؑ کے خون کا انتقام لیا گیا اور پھر اس میں جوش آنا موقوف ہو گیا۔

اصحابِ سبت

حضرت موسیٰ بن عمران ؑ نے بنی اسرائیل کو یہ تعلیم دی تھی کہ وہ سات دنوں میں سے ایک دن خدا کی عبادت کے لیے مخصوص کردیں اور اس دن دنیاوی کاموں اور خرید و فروخت سے باز رہیں۔

جو دن اس مقصد کے لیے معین کیا گیا، وہ اگرچہ جمعے کا دن تھا لیکن بنی اسرائیل نے خواہش کی کہ اس کی بجائے ہفتے کا دن عبادت کے لیے مخصوص کردیا جائے۔ اس بنا پر ہفتے کا دن ہی ان کی عبادت اور تعطیل کا دن قرار پایا۔ چنانچہ اس روز بنی اسرائیل کا اجتماع منعقد ہوتا اور حضرت موسیٰ ؑ انہیں وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔

اسی طرح کئی سال گزر گئے اور بنی اسرائیل سبت (شنبہ یا ہفتہ) کے دن کا احترام کرتے ہوئے اسے خدائے تعالیٰ کی عبادت کے لیے مخصوص سمجھتے

تھے۔ چنانچہ اس دن وہ کسی دنیاوی کام کو ہاتھ نہ لگاتے اور خدا کی عبادت اور تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے تھے۔ پھر جب حضرت موسیٰؑ رحلت فرما گئے تو ان کے بعد، بنی اسرائیل کی زندگی میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں لیکن وہ ہفتے کے دن کو محترم ہی سمجھتے رہے۔ اس کے بعد داؤدؑ کی نبوت کا زمانہ آیا تو، بنی اسرائیل کا ایک گروہ جو سمندر کے کنارے واقع گاؤں "ایلہ" میں سکونت پذیر تھا، اس نے ہفتے کے دن کا احترام برقرار نہ رکھا اور وہ لوگ اس دن مچھلی کا شکار کرنے لگے۔ ان کے اس قصے کی تفصیل یہ ہے:

ہفتے کا دن کہ جس میں، بنی اسرائیل پر مچھلی کا شکار کرنا حرام تھا۔ اس دن سمندر کے کنارے بہت سی مچھلیاں دیکھنے میں آتی تھیں لیکن اور دنوں میں وہ ساحل سے دور رہتیں اور سمندر کی تہہ میں چلی جاتی تھیں۔ اس پر، بنی اسرائیل کے وہ افراد کہ جن پر دنیا کی ہوس غالب تھی۔ وہ باہم مل کر بیٹھے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے:

ہمیں کوئی ایسی تدبیر سوچنی چاہیے کہ جس سے ہم اس مشکل سے نجات پاسکیں۔ ہفتے کے دن سمندر کے کنارے مچھلیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اور ان کا شکار کرنا آسان ہوتا ہے لیکن دوسرے دنوں میں وہ سمندر کی تہہ میں چلی جاتی ہیں اور ہم بے حد محنت اور مشقت کے باوجود بھی ان کا شکار نہیں کر پاتے۔

چنانچہ ان لوگوں نے مچھلیاں پکڑنے کے لیے ایک ترکیب جوڑی اور اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ترکیب یہ تھی کہ سمندر کے ساتھ کھالیاں نکال کر مچھلیوں کو ان میں منتقل کر لیا جائے اور اگلے دن ان کا شکار کیے جائے۔

پھر انہوں نے اسی ترکیب پر عمل کیا اور سمندر میں کھالیاں کھود نکالیں۔ چنانچہ ہفتے کے دن مچھلیاں آزادی سے ان کھالیوں میں آجاتیں لیکن شام کو جب وہ واپس جانے لگتیں تو وہ لوگ کھالیوں پر بند باندھ کر انہیں قید کر لیتے اور دوسرے دن ان سب کو پکڑ لیتے۔

اس اثنا میں قوم کے صاحب علم اور دیندار لوگوں نے انھیں نصیحتیں کیں اور خدا کے حکم کی مخالفت کرنے سے ڈرایا، لیکن اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنیا پرست لوگوں نے اس سرزنش کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔

اسی طرح کافی مدت گزر گئی اور دیندار لوگ ان گنہگار لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہے چونکہ ان کی نصیحتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا، اس لیے ان میں سے کچھ اشخاص نے پند و نصیحت کا عمل ترک کر دیا اور چپ بیٹھ گئے۔ نیز وہ دوسرے نصیحت کرنے والوں سے بھی کہنے لگے: تم ایسے لوگوں کو نصیحتیں کیوں کرتے ہو، جنہیں خدا ہلاک کرنا یا دردناک عذاب میں مبتلا کر دینا چاہتا ہے۔

نصیحت کرنے والوں نے کہا:

ہم اس قوم کو اس لیے نصیحت کرتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمارا عذر قائم ہو جائے۔

بہر حال ان صاحبانِ علم کی باتیں موثر ثابت نہ ہوئیں اور وہ لوگ اپنے بنائے ہوئے طریقے سے مچھلیوں کا شکار کرنے میں مشغول رہے بلکہ وہ تو اپنی اس غلط حرکت پر خوش ہوتے اور اسے اپنی کامیابی خیال کرتے تھے۔

اسی طرح بہت دن گزر گئے اور ان گنہگار لوگوں پر علما کی سچی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا تو خدائے تعالیٰ کے حکم سے اس سرکش قوم کی صورتیں مسخ ہوگئیں اور وہ انسانوں سے حیوانوں میں تبدیل ہوگئے۔ پھر تین دن کے بعد ان پر ایک ایسا عذاب نازل ہوا جس میں وہ ہلاک ہوگئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

مریمؑ عمران کی بیٹی اور حضرت داؤدؑ کی نسل سے تھیں۔ ان کی والدہ بھی ایک نیک اور پارسا خاتون تھیں۔ ایک دن انہوں نے خدا سے دعا کی کہ وہ انہیں ایک فرزند عنایت فرمائے، جسے وہ بیت المقدس کی خدمت کے لیے دے دیں۔ ان کی دعا قبول ہوئی اور خدا نے انہیں مریمؑ ایسی بیٹی عطا فرمائی اور وہ اس کو بیت المقدس لے گئیں۔ وہاں جا کر انہوں نے خدا سے دعا مانگی کہ وہ مریمؑ اور اس کی اولاد کو شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔ تب ان کی یہ دعا بھی قبول ہو گئی۔

جب مریمؑ کو بیت المقدس لایا گیا تو وہاں کے منتظمین کے مابین ان کی پرورش کے بارے میں تکرار ہونے لگی۔ ان میں سے ہر ایک چاہتا تھا کہ وہی ان کی پرورش کرے۔ آخر کار جھگڑا ختم کرنے کے لیے قرعہ ڈالا گیا تو اس میں حضرت زکریاؑ کا نام آیا۔ چنانچہ انہوں نے مریمؑ کی پرورش

کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ جب مریمؑ سنِ تمیز کو پہنچیں تو حضرت زکریاؑ نے ان کے لیے بیت المقدس میں ایک حجرہ مخصوص کر دیا۔ جہاں وہ عبادت میں مشغول رہتیں۔ مریمؑ عصمت کے مرتبے پہ فائز تھیں اور خدا نے انھیں اس وقت کی عورتوں پر برتری عطا فرمائی۔ ایک دن جب مریمؑ محرابِ عبادت میں تھیں، جبرئیلؑ ایک جوان آدمی کی شکل میں ان کے سامنے آئے اور وہ گھبرا گئیں۔

جبرئیلؑ نے کہا: ڈرو مت! میں فرشتہ ہوں اور تمہیں بشارت دینے آیا ہوں کہ خدا تمہیں ایک بیٹا عنایت کرے گا۔ وہ دنیا اور آخرت میں محترم ہوگا اور گہوارے میں باتیں کرے گا۔

مریمؑ نے کہا: یہ کیونکر ممکن ہے جب کہ کسی مرد نے مجھے چھوا تک نہیں۔

جبرئیلؑ نے کہا: یہ بات خدا کی قدرت سے کچھ بعید نہیں، وہ ہر طرح سے پیدا کر سکتا ہے۔ کیونکہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ چیز عالمِ وجود میں آجاتی ہے۔

اسی وقت مریمؑ نے اپنے آپ کو حاملہ پایا۔ جس سے انھیں خوف اور پریشانی نے گھیر لیا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک کنواری لڑکی حاملہ ہو جائے اور بچے کو جنم دے؟ پھر جوں جوں وہ اپنے بارے میں سوچتیں اور بھی پریشان ہو جاتیں۔ اگرچہ وہ دنیا کی عورتوں کی سردار تھیں اور ان کا خدا پر ایمان کمال درجے پر پہنچا ہوا تھا۔ نیز وہ

یہ بھی جانتی تھیں کہ خدا ہر حالت میں ان کی مدد کرے گا لیکن وہ نادان اور ضدی یہودیوں کی زبان کے شر سے ڈرتی تھیں۔ وہ سوچتی تھیں کہ ان کے طعنوں کا کیا جواب دیں گی اور اپنی بے گناہی کا کیا ثبوت پیش کریں گی جس سے مخالفین کی زبان بند ہو جائے اور وہ ان کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔

اس سلسلے میں بہت کچھ کہا گیا اور بہت سی متعارض روایات نقل کی گئی ہیں۔ چنانچہ انبیاء کرامؑ کی تاریخ پر قلم اٹھانے والے کئی علماء نے بعض مصری مصنفین کی تقلید میں مریمؑ کے حمل کو عمومی مدت کا حمل قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ کئی مہینوں تک ذہنی پریشانی میں مبتلا رہیں۔ لیکن شیعہ بزرگوں کی روایات بتاتی ہیں کہ رات کو جبرائیلؑ نے مریمؑ کے گریبان میں جو پھونک ماری تو وہ حاملہ ہوئیں اور اسی صبح کو وضع حمل ہو گیا۔ لہٰذا ان کے حمل کی مدت نو مہینے کی بجائے کل نو گھنٹے تھی۔ بہرحال مریم معصومہؑ نے خدا کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنے معاملات اس کے سپرد کر دیے حتٰی کہ وضع حمل کا وقت آ پہنچا۔

جب دردِ زہ شروع ہوا تو وہ کھجور کے ایک خشک درخت کے پاس پہنچیں۔ انہوں نے اس بیابان میں کسی دایہ اور تیمار دار کے بغیر ہی یہ تکلیف برداشت کی اور اپنے خوبرو بچے کو جنم دیا۔ تب انتہائی رنج و غم کے عالم میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: اے کاش کہ میں یہ وقت آنے سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور میں بھولے بسرے لوگوں میں سے ہو جاتی۔

پھر اچانک ہی غمگین مریمؑ نے ایک بڑی خوش آئند آواز سنی کہ کوئی انہیں تسلی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا:

اے مریمؑ! غمگین مت ہو۔ خدا نے تمہارے پاؤں تلے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے۔ اس کا پانی استعمال کرو۔ نیز کھجور کے اس درخت کو ہلاؤ اور اس سے جو کھجوریں گریں وہ کھاؤ اور سکون حاصل کرو۔

اگرچہ ان الفاظ سے پریشان خاطر مریمؑ کو خاصی تسلی ہوئی۔ لیکن پھر بھی وہ لوگوں کے طعن و تشنیع کا تصور کر کے دل ہی دل میں ڈر رہی تھیں۔ تاہم اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے انہیں یہ بات بھی سمجھائی گئی:

جب کوئی شخص تمہیں الزام دے رہا ہو تو اس سے کہہ دو: میں رضائے خداوندی کے لیے روزے سے ہوں۔ اس لیے کسی سے بات چیت نہیں کر سکتی۔

اس کے بعد مریمؑ نے اپنے پیارے بیٹے کو سینے سے لگایا اور بیت المقدس آ گئیں۔ لیکن ابھی وہ وہاں پہنچی ہی تھیں کہ یہودیوں نے انھیں گھیر لیا۔ وہ انہیں ناروا کلمات کہنے اور طرح طرح کی تہمتیں لگا لگا کر پریشان کرنے لگے۔ چنانچہ یہودیوں نے انکو توہین آمیز لفظوں کے ساتھ مخاطب کیا اور کہا:

اے مریمؑ! تو نے یہ کیا گل کھلایا ہے۔ تیری ماں تو بدکار اور غیروں سے رغبت رکھنے والی نہیں اور تیرا باپ بھی ناجائز اور برے کاموں سے پرہیز رکھتا ہے۔ پھر تجھے کیا ہو گیا کہ تو نے ان کے طور طریقے چھوڑ دیے اور شوہر کے بغیر ہی ایک بچے کو جنم دیا ہے؟

اس پر پاک مریمؑ نے اپنے نوزائیدہ بچے کی جانب اشارہ کیا۔ جس سے مراد یہ تھی کہ جو پوچھنا ہے اسی سے پوچھو۔

وہ لوگ کہنے لگے : ہم اس بچے سے کیسے بات کریں کہ جو ابھی گہوارے میں ہے اور کچھ کہنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔

اس وقت خدا کی قدرت سے بچے نے بولنا شروع کیا۔ چنانچہ اس نے اپنی بزرگی اور بلند مرتبے کا ذکر کیا اور کہا :

> میں خدا کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھ پر مہربانی فرمائی اور مجھے اپنا پیغمبر قرار دیا ہے۔ اس نے مجھے بابرکت اور مبارک بنایا اور جب تک زندہ رہوں مجھے نماز پڑھنے، زکات دینے اور اپنی ماں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید کی ہے۔

جب ان الفاظ کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے مریمؑ کی پاکیزگی بھی ثابت کر دی۔ کیونکہ ایسا غیر معمولی طور پر پیدا ہونے والا بچہ بجائے خود ایک بہت بڑا معجزہ تھا۔ جو ایک پاک اور پارسا ماں کے علاوہ کسی دوسری عورت سے جنم نہیں لے سکتا تھا۔ نیز جس خدا نے اسے گہوارے ہی میں بات کرنے کی قوت عطا کی اس کے لیے اسے بغیر باپ کے پیدا کرنا بھی کوئی بڑی بات نہ تھی۔

تاہم اس واضح شہادت کے باوجود بھی یہودی اپنے خیال پر قائم رہے اور یہ روشن نشانی دیکھ کر بھی نازیبا باتیں کہنے سے باز نہ آئے اور اپنی جہالت اور ضد پر اڑے رہے لیکن کچھ ایسے نیک طینت لوگ بھی تھے کہ جنہیں یہ عظیم معجزہ دیکھ کر اس بات میں کوئی شک نہ رہا کہ

یہ نومولود خدا کی بڑی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور مریمؑ پاک منزہ اور ہر قسم کی لغزش سے بری ہیں۔ ایسے میں جب سرزمین مشرق کے منجموں کو مسیحؑ کی ولادت کی خبر لگی تو وہ ان کی زیارت کرنے بیت المقدس آئے اور ان کے لیے تحفے لائے۔

انہی دنوں یہودیوں کے بادشاہ ہیرودس کو حضرت عیسیٰؑ کے پیدا ہونے کی خبر پہنچی تو وہ ڈر گیا کہ مبادا اس کی سلطنت میں کوئی خلل واقع نہ ہو جائے۔ لہٰذا اس نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن مریمؑ نے جونہی خطرہ محسوس کیا، وہ حضرت عیسیٰؑ کو لے کر مصر چلی گئیں۔ وہاں وہ ان کی پرورش کرتی رہیں۔ حتّٰی کہ وہ تیس سال کے ہو گئے اور خدا نے ان پر انجیل اتاری۔ پھر وہ بیت المقدس تشریف لائے اور یہودیوں کو دین حق کی طرف بلایا۔ پھر تین سال تک انہیں وعظ و نصیحت کرتے اور انجیل کے احکام سناتے رہے۔ چونکہ وہ ایک اولوالعزم پیغمبر تھے، اس لیے انہوں نے خدائے تعالیٰ کے اذن سے بڑے بڑے معجزے دکھلائے۔ جن میں سے مردوں کو زندہ کرنا۔ نابیناؤں کو بینا کرنا اور کوڑھیوں کو شفا دینا زیادہ مشہور ہیں۔ یہ معجزے دیکھ کر چند یہودی آپ پر ایمان لے آئے لیکن اکثر آپ کے دشمن ہو گئے اور انہوں نے آپ کو قتل کر دینے کی ٹھانی۔

جو لوگ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لائے تھے، آپ نے ان میں سے بارہ اشخاص کا انتخاب کیا۔ جنہیں حواری کہا جاتا ہے۔ وہ ہر وقت آپ کے ساتھ رہتے اور آپ سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ آپ انہیں انجیل کی تبلیغ کرنے کے بارے میں تاکید فرماتے تھے۔

یہود کے دنیا پرست علماء کا خیال تھا کہ حق اور حقیقت کے

اس ستارے کے آگے ان کا جھوٹ ماند پڑ جائے گا۔ ان کی بالادستی ختم ہو جائے گی اور صدقہ و نذر کی رقمیں نہیں ملیں گی اور وہ تہی دست اور محتاج ہو جائیں گے۔ مطلب یہ کہ خدا کے پیغمبر اور آسمانی کتاب کی آمد سے ان کے لیے سادہ لوح لوگوں سے مال حاصل کرنا ممکن نہ رہے گا۔ لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ خدا کے روشن کیے ہوئے اس چراغ کو بجھا دیں اور پھر پورے سکون کے ساتھ دنیا کے مزے لوٹیں۔ پس انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے خلاف محاذ قائم کر لیا اور علانیہ ان کی تکذیب کرنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے آپ کے معجزوں کو جادو اور شعبدہ قرار دیا اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے اپنی گمراہی پر اڑ گئے۔ تاہم حضرت عیسیٰؑ اپنے مخالفین کے سامنے ایک آہنی دیوار کی طرح جمے رہے اور دین کے حقائق نشر کرنے میں مشغول رہے۔ انہوں نے اپنی مدد اور حفاظت کے لیے خدائے تعالیٰ کی ذات اقدس کو کافی سمجھا اور دشمنوں کی یورش سے ہرگز ہراساں نہ ہوئے بلکہ جہاں کہیں لوگوں کا اجتماع ہوتا آپ وہاں تشریف لے جاتے اور ان کو انجیل کے احکام بتاتے۔ آپ زائرین کے بیت المقدس میں آنے کے مواقع سے بھی پورا فائدہ اٹھاتے اور ان کے اجتماعات میں جا کر لوگوں کی رہنمائی فرماتے تھے۔ اس طرح بہت سے افراد ان کے یار و انصار کی صف میں شامل ہو گئے۔ اگرچہ یہ صورت حال دیکھ کر یہودیوں کے دلوں میں دشمنی کی آگ اور بھی بھڑکتی تھی لیکن وہ خدائے تعالیٰ کی رضا اور تائید کے مقابلے میں کچھ نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے خدا کے نور کو بجھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن خدا کا نور پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہے خواہ کافروں کو یہ چیز ناگوار ہی گزرے۔

آسمانی خوان

جیسا کہ انبیائے کرام کا طریقہ رہا ہے کہ وہ مشکلات پر صبر کرتے اور مخالفین کے انکار، ایذا رسانی اور تمسخر کے مقابلے میں ثابت قدم رہتے تھے۔ وہ اپنے فریضہ ہدایت کو انجام دینے سے دستبردار نہیں ہوتے تھے بلکہ پوری استقامت کے ساتھ رسالت کے کام کو تکمیل کے مرحلے تک پہنچاتے تھے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ بھی اپنے حواریوں[1] سمیت رسالت کی انجام دہی اور انجیل کی تبلیغ میں ہر طرح کی تکالیف اٹھاتے ہوئے شہروں اور قصبوں میں خالص توحید اور شریعت کے احکام کی اشاعت میں مشغول ہو گئے۔ وہ چند دن تک کسی ایک آبادی میں دین کی تبلیغ کرتے اور پھر کسی اور جگہ چلے جاتے۔ یوں آپ نے بےعلم لوگوں کو خدائے واحد پر ایمان لانے، نیز قیامت اور جنت و دوزخ پر اعتقاد کی دعوت دیتے۔ ان کے دلوں میں انسانی اخلاق کو راسخ کرتے اور اپنے وعظ و نصیحت کے ذریعے معاشرے سے گناہوں کا میل دُور کرتے تھے۔

چونکہ انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک نیک ساتھی کی مدد کرے، اس کے وجود کو غنیمت شمار کرے، سیکھنے کی باتیں اس سے سیکھے اور اپنے ذہن کو تقویت پہنچانے کے لیے اس سے مدد طلب کرے۔ خصوصاً جب کہ وہ ساتھی حضرت عیسیٰؑ کی مانند ایک جلیل القدر نبی ہو کہ جو پاکیزگی، بڑائی اور روحانی کمالات، اخلاق اور اوصافِ حمیدہ کے سرچشمہ تھے۔ شاید یہی وجہ تھی

---

[1] حضرت عیسیٰؑ کے اصحاب میں سے بارہ اشخاص کو حواری کہا جاتا ہے۔ انہیں یہ نام دیے جانے کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں لیکن یہاں انکے بیان کی گنجائش نہیں ہے۔

کہ حواریوں نے اپنے ایمان و یقین کو تقویت پہنچانے اور اپنی عقل و بصیرت کے نور کو بڑھانے کے لیے حضرت عیسیٰؑ سے خواہش کی کہ وہ خدائے واحد کی نشانیوں میں سے ایک نشانی دکھا کر انہیں علم الیقین سے عین الیقین کے مقام پر لائیں اور پروردگار عالم کی قدرت کے آثار دکھا کر ان کی دانش کو کمال کے درجے پر پہنچا دیں۔ تاہم انہوں نے یہ درخواست نامناسب لفظوں میں کی اور یوں بولے:

اے عیسیٰؑ ابن مریمؑ! کیا آپ کا خدا اتنی قدرت نہیں رکھتا کہ ہمارے لیے خوان بھیجے؟

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: اگر تم ایمان لے آئے ہو تو ایسی بات کہنے سے ڈرو۔

حواریوں نے جواب دیا: ہمارا اصل مطلب یہ ہے کہ ہم آسمانی غذا کھائیں اور وہ ہمارے دلوں کے اطمینان کا موجب بن جائے۔ ہم آپ کے وعدوں کی سچائی کو جان لیں اور ان پر گواہ رہیں۔ اس موقع پر حضرت عیسیٰؑ نے بارگاہ خداوندی میں دعا کی:

اے پروردگار! ہمارے لیے آسمان سے ایک خوان بھیج دے جو ہمارے لیے سرور اور مسرت کا موجب ہو جس سے ہمارے پہلے اور پچھلے سبھی خوش ہو جائیں۔ وہ تیری جانب سے ایک نشانی ہو اور تو بہترین روزی دینے والا ہے۔

خدائے تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی دعا قبول کی اور فرمایا:

میں تمہارے لیے ایک خوان بھیج رہا ہوں، لیکن جان لو کہ یہ خوان بھیجے جانے اور یہ نشانی دیکھنے کے بعد اگر تم میں

سے کوئی شخص کافر ہو جائے گا تو میں اسے ایسا عذاب دوں گا کہ اہلِ عالم میں سے کسی اور کو نہ دوں گا۔

چنانچہ خدائے تعالیٰ نے ان کے لیے آسمان سے خوان بھیجا اور پھر وہ سبھی اس عظیم نعمت سے بہرہ مند ہوئے۔ تب حضرت عیسیٰؑ نے حواریوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: یہ کھانا کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو تاکہ وہ تم پر اپنے فضل و احسان میں اضافہ کرے۔ پھر حواریوں نے اس خوان میں سے خوب کھایا اور اس کے بعد یہ داستان زبان زد خاص و عام ہو گئی۔ یہاں تک کہ بہت سے لوگ یہ عظیم معجزہ دیکھ کر حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لے آئے اور جو لوگ پہلے ایمان لا چکے تھے ان کے ایمان کو اور بھی تقویت حاصل ہوئی۔

اگرچہ حضرت عیسیٰؑ نے یہودیوں کو حق کی دعوت دینے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ آپ نے انہیں راہ راست اختیار کرنے اور بری عادات چھوڑ دینے کی ہدایت میں انتہائی محنت اور مشقت سے کام کیا لیکن ان کی ضد اور دشمنی سے آپ کی دعوت حق اور دن رات کی کوشش کا ان مغرور دنیا پرست اور لالچی لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں نے اپنا متعصبانہ رویہ ترک نہ کیا۔ ہاں تو ان کی اس روگردانی اور دشمنی کا اصل سبب پیشوائی اور سرداری کی بے پناہ خواہش ہی تھی۔ کیونکہ وہ محسوس کر رہے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کے باعث ان کی قیادت اور سیادت خطرے میں ہے۔ ان کی سرداری کا دور ختم ہونیوالا ہے اور اب وہ کسی اور کے ہاتھ میں جانے والی ہے۔

چنانچہ یہودی خدا کے پیغمبر اور پاکیزگی کے پیکر حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت سے باز نہ آئے۔ حتیٰ کہ ان پر شورش پھیلانے اور ملک کا امن و امان درہم برہم

کرنے کا الزام دھرا اور ان کو فتنہ و فساد کی جڑ قرار دیا۔ یہودی یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی ایسی گھناؤنی سازشوں سے دین حق کی پیشرفت کو روک لیں گے لیکن یہ ان کی بھول تھی۔ تاہم حضرت عیسیٰؑ اپنے خدا پہ بھروسہ کرتے تھے اور انہیں اطمینان تھا کہ خدا ان کا بہترین محافظ اور مددگار ہے کیونکہ اس نے ان سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ انھیں دشمنوں کے مکر و فریب سے اپنی امان میں رکھے گا۔

یہودیوں نے ایک اور طریقے سے دین حق کا راستہ روکا۔ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کو جادو ٹونے کا نام دیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ شخص حضرت موسیٰؑ کے دین سے پھر گیا ہے۔ اس نے ان کی شریعت کو ترک کر دیا ہے اور شنبہ کے دن کا احترام نہیں کرتا۔

پھر انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں باہم مشورہ کیا اور بالآخر اس جلیل القدر پیغمبر کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنا یہ مقصد حاصل کرنے کی خاطر انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی تلاش شروع کر دی۔ کیونکہ جس شخص کے ٹھکانے کا علم نہ ہو اس تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنے کئی جاسوسوں کو ادھر اُدھر دوڑایا۔ اس اثنا میں انھیں شمعون الصفار نامی ایک حواری مل گئے۔ انہوں نے ان سے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ لیکن وہ ان سے کوئی معلومات حاصل نہ کر سکے۔ پھر انہیں ایک اور حواری یہودا نظر آیا کہ جو دنیا پرست اور دھوکا باز تھا۔ جب یہودیوں نے اس سے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنے محسن اور استاد کے دشمنوں کو ان کا ٹھکانا بتا دیا۔

چنانچہ حضرت عیسیٰؑ ایک غار میں اپنے پروردگار سے راز و نیاز میں مشغول تھے کہ یہودیوں نے انھیں پکڑ لیا اور سولی پر لٹکانے کے لیے لے گئے۔

وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے اور ان کی پریشانیاں ختم ہو گئی ہیں، تاہم یہ ان کی بھول تھی۔ خدا کی قدرت کمزور انسان کی تدبیر سے کہیں بڑھ کر ہے۔ کیونکہ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ کام انجام پا جاتا ہے اور اس میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آسکتی۔ پھر عیسیٰؑ تو خدا کی ایک بہت بڑی نشانی تھے اور ان کی ولادت غیر معمولی طور پر ہوئی تھی۔ لہٰذا یہ لازم تھا کہ ان کی زندگی بھی عام لوگوں سے مختلف ہوتی۔ چنانچہ اس خطرناک موقع پر جب کہ دشمنوں نے انھیں گھیر رکھا تھا اور ان کا خون بہانے کے درپے تھے۔ حق تعالیٰ کا دست قدرت ان کو رہائی دلانے کے لیے آگے بڑھا اور انھیں سولی چڑھنے سے پہلے ہی آسمان کی طرف اٹھا لیا، جہاں وہ زندہ و سلامت موجود ہیں۔ جب پیغمبر اسلامؐ کی بشارت کے مطابق آنحضرتؐ کے بارہویں جانشین (امام مہدیؑ) دنیا کو عدل و انصاف سے معمور کرنے کے لیے ظہور فرمائیں گے تو حضرت عیسیٰؑ بھی آسمان سے اتریں گے اور ان کی اقتدا میں نماز ادا کریں گے۔

اس بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک انتقام لینے والا ہاتھ موجود ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جلد یا بدیر مجرموں کو ان کے کیے کی سزا ملے۔ چنانچہ جس غدار شخص نے چند ٹکوں کی خاطر حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کرایا تھا، اس کی شکل ان سے ملتی تھی، اس لیے حضرت عیسیٰؑ کی جگہ اس کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔ گویا جو کنواں اس نے خدا کے پیغمبرؑ کے لیے کھودا تھا، اس میں وہ خود ہی جا گرا۔

عیسیٰؑ کے دین کی اشاعت

عیسائی اپنے سال کا آغاز حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے دن سے کرتے ہیں۔ آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے وقت ان کی عمر ۳۳ سال تھی۔ جیسا کہ آپ اپنے حواریوں کو وصیت کر گئے تھے، وہ آپ کے دین کو دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلانے لگے۔ ان میں سے بعض تو بیت المقدس میں رہے اور بعض نے روم، وسط ایشیا، ہندوستان اور دوسرے ممالک میں تبلیغ شروع کر دی اور ان کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے اوصیاء نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ اس وقت یورپ کے بیشتر ممالک اور افریقہ و ایشیا کے کچھ حصے رومی بادشاہوں کے زیر تسلط تھے۔ چنانچہ وہ جس کسی کو حضرت عیسیٰؑ کا پیرو پاتے اسے تکلیف پہنچاتے تھے۔ تاہم حضرت عیسیٰؑ کے پیروؤں نے ان تمام تکالیف کے باوجود اپنے دین کو ترک نہ کیا، بلکہ خفیہ طور پر دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتے رہے۔ پھر تین سو سال تک یہی صورت رہی۔ حتیٰ کہ ۳۱۳ء میں قیصر روم قسطنطین اعظم نے عیسائیوں کی کثرت اور دین عیسیٰؑ کی ترقی کو دیکھتے ہوئے یہ مسلک اختیار کر لیا اور اس کی نشر و اشاعت میں لگ گیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ مسیحؑ کا دین پھیلنے لگا اور اس کا عام رواج ہو گیا۔ شہنشاہ روم کے بعد دوسرے بادشاہوں نے بھی اس دین میں دلچسپی لی جس سے اسے تقویت حاصل ہوتی رہی۔

اصحابِ کہف

روم کی سرزمین پر ایک رعیت پرور اور انصاف پسند بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس نے بڑی مدت تک مملکت کی باگ ڈور سنبھالے رکھی۔ اس کے عہد میں ملک مضبوط اور لوگ بڑے خوشحال تھے۔

جب اس کی عمر کا پیمانہ لبریز ہوا اور اس نے دنیا سے رحلت کی تو قوم میں اختلافات ابھر آئے جو ان کی بدنصیبی کا موجب بن گئے۔ چنانچہ ہمسایہ ملک کے بادشاہ دقیوس نے ان پر حملہ کیا اور تخت و تاج پر قابض ہو گیا۔

دقیوس نے روم میں اپنے لیے بڑا شاندار محل تعمیر کرایا اور دربار کی سج دھج بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پھر اس قوم میں سے چھ دانا اور قابل اشخاص کو اپنا وزیر بنایا اور لوگوں کو حکم دیا کہ میری پرستش کیا کرو۔

تب بے عقل اور نادان لوگوں نے اس کی بندگی کا طوق اپنے گلے

میں ڈال لیا اور اس کی عبادت کرنے لگے۔ وہ اس کے آگے سجدہ کرتے اور اسے اپنا برتر خدا کہتے تھے۔

کچھ مدت کے بعد ان لوگوں کے قومی تہوار کا دن آیا تو بادشاہ، اس کے درباری اور عام لوگ اس میں شریک ہوئے۔ عین اس وقت جب وہ مسرتوں میں ڈوبے ہوئے رنگ رلیاں منا رہے تھے، ایک قاصد آیا اور اس نے بادشاہ کے ہاتھ میں ایک خط لا تھمایا۔

جونہی بادشاہ نے وہ خط پڑھا، اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور اس کے چہرے پر تردّد کے آثار نمودار ہو گئے۔ کیونکہ اس کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ ملک فارس (ایران) کا لشکر سرحد پار کر کے روم میں داخل ہو گیا ہے اور مسلسل پیش قدمی کر رہا ہے۔

بادشاہ کے اس اضطراب کو دیکھ کر ان چھ وزراء میں سے ایک کے دل پر بڑا عجیب اثر ہوا۔ تب اس نے اپنے ساتھیوں پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی اور انہوں نے بھی اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا جواب دیا۔ اس طرح انھوں نے ایک دوسرے سے بڑی اہم باتیں کہہ ڈالیں اور پھر یہی نظریں ایک بہت بڑے تاریخی حادثے کا پیش خیمہ بن گئیں۔

جب تہوار کی رسوم اختتام کو پہنچیں اور سب لوگ اپنے گھروں کو لوٹے تو وزراء بھی جو اپنے گھروں میں دوستانہ محفلیں گرم کرتے تھے، وہاں سے گھروں کو آ گئے۔ پھر جب وہ آپس میں ملے تو ان میں انہیں نگاہوں کے سلسلے میں گفتگو ہونے لگی۔ ان میں سے ایک نے کہا: پیارے ساتھیو! تم نے دیکھا ہوگا کہ آج بادشاہ کی کتنی بری حالت ہوئی ہے۔ جبکہ وہ کہتا ہے کہ میں لوگوں کا خدا ہوں اور وہ میرے بندے ہیں۔ اگر وہ

واقعی خدا ہوتا تو ایک ناگوار خبر سے اس قدر پریشان نہ ہوتا۔ اس کی اس بیکسی اور ناتوانی نے مجھے شک وشبہ میں ڈال دیا ہے اور میرے ذہن میں ایک عجیب کشمکش پیدا کر دی ہے۔

ساتھیو! میں سوچتا ہوں کہ یہ عالی شان آسمان کس نے بنایا ہے؟ وہ کونسا طاقتور ہاتھ ہے جو چمکتے ہوئے سورج اور چاند کو اپنے اپنے راستے پر چلا رہا ہے!

میں دُور کیوں جاؤں اور آسمان کی باتیں کیوں کروں؟ میں اپنے ہی متعلق کیوں نہ سوچوں کہ کون مجھے میری ماں کے رحم سے اس دنیا میں لایا ہے۔ مجھے روزی کس نے دی اور کس نے قوت بخشی ہے؟

میرے خیال میں یہ سارے کام ایک خدا نے انجام دیے ہیں لیکن وہ عظیم خدا قطعاً دقیوس نہیں ہے بلکہ وہ اس سے کہیں بلند ہے کہ ہمارا ذہن اس کا ادراک کر سکے۔

ساتھیو! ہماری یہ زندگی جو ذلت اور خواری سے داغدار ہے کہ ہم دقیوس کے بندے ہیں، کوئی دائمی چیز نہیں ہے۔ پس آؤ کہ ہم اس دنیا کی عارضی لذتوں کو خیرباد کہیں، دنیاوی حکومت کو ٹھکرا دیں اور بارگاہِ الٰہی میں پیش ہو کر اپنے گزشتہ گناہوں کی معافی مانگیں۔

اس عقلمند شخص نے یہ باتیں اتنے جوش سے کہیں کہ اس کے ساتھی متاثر ہو گئے۔ ان سب نے فیصلہ کیا کہ اس بت پرست ملک اور پریشان کن ماحول سے بھاگ نکلیں۔ پھر بیابان میں کسی دور ترین مقام پہ پاکیزہ اور سادہ زندگی گزاریں اور اپنی عمر خدائے واحد کی عبادت میں صرف کریں۔

دوسرے دن وہ چھیوں کے چھ جگری دوست خفیہ طور پہ شہر سے

نکلے اور بیابان کی جانب روانہ ہو گئے۔ جب وہ شہر سے چند فرسنگ دُور پہنچے تو انہوں نے ایک گڈریے کو دیکھا جو بھیڑیں چرا رہا تھا۔ انہوں نے اس سے پانی مانگا تو گڈریے نے کہا: میں آپ لوگوں کے چہروں پہ بزرگی اور جلال کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ آپ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟

انہوں نے جواب دیا: ہم بادشاہ کے وزیر ہیں۔ ہم حکومت اور وزارت ترک کر کے جا رہے ہیں۔ تاکہ ایک گوشے میں خدائے واحد کی عبادت میں مشغول ہو جائیں کیونکہ دقیوس کی پرستش نے ہمارے ضمیر کو کچل ڈالا اور ہمیں روحانی عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔

گڈریے نے کہا: میں بھی آپ کا ہم عقیدہ ہوں اور اگر آپ لوگ اجازت دیں تو اس سفر میں میں بھی آپ کے ساتھ رہوں اور خدا کی عبادت میں آپ کے ساتھ شرکت کروں۔ وہ لوگ اس بات کو مان گئے تو گڈریے نے سب بھیڑیں ان کے مالک کو واپس کر دیں۔ تب وہ ان کے ساتھ ہو لیا اور اس کا کتا بھی ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: اگر کتا ہمارے ساتھ آیا تو یہ وقت بے وقت بھونکے گا جس سے لوگوں کو ہمارے رہنے کی جگہ کا پتا چل جائے گا۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اسے مار بھگائیں اور پھر اطمینان سے اپنا سفر جاری رکھیں۔ تب انہوں نے کتے کو دھتکارا لیکن وہ نہیں گیا۔ پھر انہوں نے اسے ڈرایا لیکن وہ نہیں ڈرا۔ انہوں نے اس کی طرف پتھر پھینکے لیکن وہ واپس جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ اب ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہا کہ اسے بھی ساتھ لیتے چلیں۔

وہ گڈریا اپنے نئے ساتھیوں کو لے چلا اور انہیں ایک پہاڑ کی

دوسری جانب واقع ــــ سرسبز و شاداب وادی میں پہنچادیا۔ وہاں پھل دار درخت اگے ہوئے تھے۔ شفاف پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے مزیدار پھل کھائے۔ دل بھر پانی پیا اور پھر پہاڑ کے ایک غار (کہف) میں داخل ہو گئے۔

پہاڑ کے شگاف سے غار میں سورج کی روشنی آرہی تھی۔ لہٰذا انھوں نے طے کیا کہ پہلے کچھ دیر آرام کریں تاکہ سفر کی تھکن دور ہو جائے۔ پھر عبادت میں مشغول ہو جائیں گے۔

لمبی نیند

یہ فیصلہ کرنے کے ساتھ ہی وہ با ایمان اشخاص ایک دوسرے کے پہلو میں لیٹ کر گہری نیند سو گئے اور گڈریے کا کتا بھی غار کے دروازے کے پاس اپنے بازوؤں پر سر رکھ کر سو گیا۔ خوشگوار ہوا انھیں تھپکتی رہی اور کبھی کبھی سورج بھی پہاڑ کے شگاف سے غار کے اندر جھانک لیتا تھا لیکن وہ ان سب باتوں سے بے خبر محو خواب تھے۔

چنانچہ وہ مسلسل تین سو سال تک سوتے رہے اور اس مدت میں ایک مرتبہ بھی بیدار نہ ہوئے لیکن اتنا عرصہ گزرنے کے بعد وہ منشائے ایزدی کے مطابق جاگ اٹھے۔ تب وہ ادھر ادھر دیکھ کر ایک دوسرے سے کہنے لگے: ہم کتنی دیر تک سوئے ہیں؟ کسی نے کہا ایک دن، کوئی کہنے لگا کہ ہم آدھا دن سوئے ہیں۔ لیکن جو چیز ان کے لیے سخت حیرت کا باعث بنی وہ یہ تھی کہ درخت خشک ہو کر نابود ہو چکے تھے اور خود انھیں بھوک لگ رہی تھی۔

وہ درختوں اور پانی کے چشموں کی نابودی پر جتنا بھی غور کرتے کچھ سمجھ نہ پاتے۔ کیونکہ انہیں پتا نہیں چل رہا تھا کہ آخر یہ سب چیزیں ایک دن میں کیسے ختم ہوگئیں۔ بہرحال بھوک سے نجات کے لیے وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ہم میں سے ایک شخص کو چاہیے کہ شہر جائے اور جو تھوڑی بہت رقم ہمارے پاس ہے اس کا کھانا خرید لائے۔ تاہم یہ کام بڑی خاموشی سے انجام پانا چاہیے اور کسی کو ہمارے حال کی خبر نہیں ہونی چاہیے ورنہ لوگ ہمیں مار ڈالیں گے یا بت پرستی اختیار کرنے پر مجبور کریںگے۔

پھر ان میں سے ایک کارآزمودہ اور ہشیار آدمی اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے گڈریے کے کپڑے لے کر خود پہنے اور شہر کی طرف چل دیا۔ جب وہ شہر کے دروازے پر پہنچا تو وہ اسے کچھ اجنبی سا لگا اور جب شہر میں داخل ہوا تو اسے ہر چیز پہلے سے مختلف نظر آئی۔ گلی کوچے اور عمارتیں بدل چکی تھیں اور دکانوں کی شکل بھی اور سے اور ہو چکی تھی۔ لوگوں کے لباس میں بڑا فرق پڑ گیا تھا اور شہر کی دوسری چیزوں میں بھی نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ یہ صورتِ حال اس کے لیے موجب حیرت بن گئی اور اس نے دل ہی دل میں کہا: اے خدا! میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ کیا میں راستہ بھول کر کسی دوسرے شہر میں آگیا ہوں؟ ہر چیز کیوں بدل گئی ہے اور میں یہاں کے لوگوں کو کیوں نہیں پہچان پاتا؟

بہرحال وہ ایک نانبائی کی دکان پر پہنچا۔ وہاں سے چند روٹیاں لیں اور اس کو کچھ درہم دیے۔ نانبائی نے درہم لے کر ان پر نگاہ ڈالی تو کہنے لگا: اے جوان! کیا تمہیں کوئی دفینہ مل گیا ہے؟

اس نے جواب دیا: نہیں۔ یہ تو ان کھجوروں کے دام ہیں جو میں نے پرسوں بیچی تھیں اور پھر میں اس شہر سے چلا گیا تھا۔

تاہم اس جواب سے نانبائی کی تسلی نہ ہوئی، وہ اسے بادشاہ کے پاس لے گیا اور کہنے لگا: جہاں پناہ! اس نوجوان کو کہیں سے دفینہ مل گیا ہے اور یہ درہم اس بات کا ثبوت ہیں۔

بادشاہ نے کہا: اے جوان! ڈرومت اور سچ سچ بتادو، ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ ہمارے پیغمبر عیسیٰ ابن مریمؑ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اگر کسی کو دفینہ ملے تو اس سے خمس وصول کریں۔ تم بھی اس مال کا پانچواں حصہ ہمارے حوالے کردو اور اطمینان کے ساتھ چلے جاؤ۔

جوان نے کہا: بادشاہ سلامت! آپ میری گزارش سنیں کہ میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں۔ دو دن قبل میں اور میرے کچھ ساتھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے لیے پہاڑ کے ایک غار میں گئے تھے۔ ہماری روانگی کے وقت یہاں دقیوس بادشاہ کی حکومت تھی جو لوگوں کو اپنی عبادت کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ ہم چونکہ اس کے خدا ہونے پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے، اس لیے ہم نے شہر سے بھاگ کر ایک غار میں پناہ لی اور اب بھی میرے ساتھی اس غار میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔

بادشاہ نے کہا: ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں تاکہ تمہارے ساتھیوں کو نزدیک سے دیکھیں اور تمہارا سچ، جھوٹ ہم پر واضح ہو جائے۔ جو بات تم کہہ رہے ہو وہ بڑی عجیب ہے۔ کیونکہ دقیوس کی بادشاہت کو تین سو سال گزر چکے ہیں۔ چنانچہ وہ بادشاہ اپنے کچھ درباریوں کو ساتھ لے کر غار کی جانب چل پڑا۔ شہر کے جن لوگوں کو اس بات کا تھوڑا بہت علم

تھا وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔

جب وہ پہاڑ کے دامن میں پہنچے تو اس نوجوان نے کہا: اگر آپ لوگ میرے ساتھیوں کے پاس اچانک پہنچیں گے تو وہ گھبرا جائیں گے اور ممکن ہے یہ چیز ان کے لیے خطرناک ثابت ہو۔ آپ یہیں ٹھہریں تاکہ میں جا کر انھیں آپ کی آمد سے مطلع کروں اور پھر آپ آئیں۔

تب وہ جوان پہاڑ سے نیچے اترا اور غار میں داخل ہو کر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: میرے عزیز ساتھیو! تمھاری نیند جیسا کہ تم خیال کرتے تھے ایک دن یا آدھے دن کی نہیں تھی۔ بلکہ کئی صدیوں تک اس غار میں سوتے رہے ہو۔ میں شہر گیا تو میں نے دیکھا کہ وہاں ہر چیز بدل چکی ہے۔ ظالم دقیوس کو مرے ہوئے تین سو سال گزر چکے ہیں اور اس کی سلطنت کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ اس دوران میں خدا کی طرف سے عیسیٰ ابن مریمؑ نام کے ایک پیغمبر مبعوث ہو چکے ہیں اور اب لوگ ان کے پیرو کار ہیں۔

اس طرح مجھے شہر جا کر عجیب صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا۔ جو درہم میں نے وہاں دیے وہ لوگ ان سے واقف نہ تھے۔ اس لیے وہ سمجھے کہ مجھے کہیں سے کوئی دفینہ مل گیا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ مجھے بادشاہ کے پاس لے گئے۔ ہوتے ہوتے معاملہ میری سمجھ میں آ گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ خدا کی منشا کے مطابق ہم کئی سو سال تک اس غار میں سوتے رہے ہیں۔ اس وقت بادشاہ، اس کے درباری اور شہر کے کچھ لوگ باہر انتظار کر رہے ہیں تاکہ تم اجازت دو اور وہ تمھارے پاس آئیں۔

تاہم اس کے ساتھیوں کو یقین نہ آیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ انہیں

پکڑوانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ آؤ خدائے تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں پہلی حالت پر لوٹا دے۔ پس انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور کہا:

اے پروردگار! ہمیں اس پریشانی سے نجات دے اور
ہمیں پہلی حالت میں بدل دے۔

تب ان کی یہ دعا قبول ہو گئی اور خدائے تعالیٰ نے ان پر دوبارہ نیند مسلط کر دی۔ ادھر بادشاہ اور اس کے ہمراہی بڑی دیر تک انتظار کرتے رہے، لیکن وہ جوان واپس نہ آیا۔ بالآخر وہ خود ہی غار میں داخل ہو گئے۔ مگر خدا کی مرضی کے تحت اصحابِ کہف ان کی نظروں سے پوشیدہ رہے۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر اس نیک دل بادشاہ نے اس غار کے پاس خدائے تعالیٰ کی عبادت کے لیے ایک مسجد تعمیر کرا دی۔ یہ واقعہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی جو لوگوں کو دکھائی گئی تاکہ وہ اس کی قدرت پر غور کریں۔

اصحابِ اخدود

جب قبیلہ حمیر کے آخری حکمران 'ذو نواس نے تخت شاہی پر متمکن ہوکر لوگوں کے امور کی باگ ڈور سنبھالی تو اس نے یہودی مذہب اختیار کیا۔ اور اسے ملک کا سرکاری مذہب قرار دیدیا۔ حالانکہ عیسیٰ ابن مریمؑ کی آمد سے یہودیت کا دور ختم ہو چکا تھا اور اس پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا گیا تھا۔

تاہم ذو نواس نے مسیحؑ کے دین کی شدید مخالفت شروع کر دی اور اسے مٹانے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے۔ وہ یہودیوں کا احترام کرتا اور عیسائیوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کرا دیتا تھا۔ چنانچہ اس نے دین یہود کو ساری دنیا کے انسانوں کا واحد مذہب قرار دینے اور دوسرے ادیان کو مٹا دینے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ وہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے کسی بھی اقدام سے گریز نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ جب شہر یا ملک میں دین یہود کے علاوہ کوئی اور دین رائج ہوتا وہ اس پر لشکر کشی کر دیتا۔ پھر وہاں کے

لوگوں کو اپنا دین ترک کر کے یہودیت کو اپنانے پر مجبور کرتا۔

ایک دن اسے خبر ملی کہ نجران کے لوگوں نے مسیحؑ کا دین اختیار کر لیا ہے اور معدودے چند اشخاص کے علاوہ سبھی افراد یہودیت کو ترک کر چکے ہیں۔

اس خبر سے ذونواس اس قدر خشمگیں اور غضبناک ہوا کہ اس پر دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو گئی۔ پھر وہ فوراً ہی نجرانیوں کے خلاف جنگ لڑنے پر آمادہ ہو گیا اور ایک بہت بڑا لشکر لے کر اہل نجران پر چڑھ دوڑا کیونکہ وہ ان کے عیسائی ہو جانے کے باعث سخت بے چین تھا اور ان بیکس لوگوں کے بارے میں اس کے ارادے بڑے خطرناک تھے۔

آہستہ آہستہ ذونواس کا لشکر نجران کے نزدیک آپہنچا اور وہاں پڑاؤ ڈال دیا۔ تب اس نے اپنے نمائندے نجران بھیجے اور وہاں کے سربرآوردہ اشخاص کو اپنے پاس بلوایا۔ جب وہ لوگ آ گئے تو اس نے انہیں یوں مخاطب کیا:

> مجھے خبر ملی ہے کہ نجران کے لوگ دوس نامی ایک عیسائی کے بہکاوے میں آ کر یہودیت کو ترک کر کے عیسائی ہو گئے ہیں۔ اب میں یہ عظیم لشکر لے کر آیا ہوں تاکہ اس علاقے سے عیسائیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں اور دین یہود کو دوبارہ نافذ کر دوں۔ میں نے تم لوگوں کو اس لیے بلوایا ہے کہ تم نجران کے بزرگ اور عقلمند اشخاص ہو۔ اولاً میں تمہیں یہ پیشکش کرتا ہوں کہ تم اپنے پہلے دین یہودیت کی طرف لوٹ آؤ اور اپنے اس انحراف سے توبہ کر لو۔

اگر تم یہ پیشکش قبول نہیں کرتے ہو تو پھر یہ جان لو کہ میں تم لوگوں کو کڑی سزا دوں گا اور جو لوگ یہودیت سے منحرف ہو گئے ہیں، ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

اب تم جاؤ اور آپس میں مل بیٹھ کر مشورہ کرو اور میرے بتاتے ہوئے دو راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو۔

تب نجران کے بزرگوں نے پورے اعتمادِ نفس کے ساتھ اور نہایت واضح الفاظ میں کہ جن سے ان کی قوت ایمانی کا پتا چلتا تھا، اس سرکش اور ظالم شخص کے جواب میں یوں کہا:

ہمیں کسی مشورے اور تبادلۂ خیال کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے دین حق کو اپنا لیا ہے اور اس کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ ہم دین کی خاطر کسی سزا سے نہیں ڈرتے اور حق و حقیقت کی راہ میں سرفروشی کو اپنے لیے بہترین اعزاز سمجھتے ہیں۔

ذو نواس کو اس جواب کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ یہ سنتے ہی اس نے حکم دیا کہ زمین میں گڑھے (اخدود) کھودے جائیں۔ جب گڑھے کھد گئے تو ان میں بہت زیادہ آگ روشن کر دی گئی۔ پھر وہ خود اور اس کے سپاہی تماشا دیکھنے کے لیے ان گڑھوں کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ بعد ازاں اس نے حکم دیا کہ مومنین کو اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ اس کے سپاہی نجران میں گھس گئے۔ وہاں وہ جس شخص کے بارے میں سنتے کہ

اس نے مسیحؑ کا دین قبول کر لیا ہے اسے پکڑ کر لے آتے اور آگ میں جھونک دیتے۔ اس طرح انہوں نے کچھ لوگوں کو زندہ جلا دیا اور کچھ کو تہ تیغ کر دیا۔ علاوہ ازیں کئی ایک کے ہاتھ، پاؤں کاٹ دیے اور نجران میں مسیحؑ پر ایمان لانے والوں کا خاتمہ کر دیا۔

اس سانحہ میں ذونواس نے بیس ہزار آدمیوں کو قتل کیا اور نجران میں دین یہود کو دوبارہ رائج کر دیا۔

جب نجران کے ایک عیسائی نے ذونواس کا ظلم و ستم اور عیسائیوں کا قتل عام دیکھا تو وہ فوراً ہی گھوڑے پر سوار ہوا اور روم روانہ ہو گیا۔ وہ دن رات چلتا اور پہاڑوں اور بیابانوں میں سے گزرتا ہوا بالآخر قیصر روم کے دربار میں جا پہنچا۔ تب اس نے قیصر کو نجران کے دلخراش حادثے کی پوری تفصیل سنائی اور ذونواس کی سرکوبی کے لیے اس سے مدد مانگی۔

چونکہ قیصر روم عیسائی تھا اس لیے نجران کے حادثے کی خبر سن کر اسے بڑا دکھ ہوا اور اس آدمی سے کہنے لگا:

تمہارا ملک ہم سے بہت دور ہے، اس لیے وہاں فوج کشی کرنا بڑا مشکل ہے۔ تاہم میں حبشہ کے شاہ نجاشی کو خط لکھ کر ذونواس کی سرکوبی کا کام اس کے سپرد کرتا ہوں۔ چونکہ نجاشی بھی عیسائی ہے اور اس کی سلطنت ذونواس کے دارالحکومت کے قریب ہے، لہٰذا اس کے لیے ذونواس سے جنگ کرنا بہت آسان ہے۔

چنانچہ قیصر نے نجاشی کے نام ایک خط لکھ دیا اور اس سے کہا کہ وہ ذونواس کی سرکوبی کر کے عیسائیت کا فرض ادا کرے۔

اس شخص نے قیصر کا خط لیا اور حبشہ روانہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ نجاشی کے دربار میں جا پہنچا اور وہ خط اس کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کو ذونواس اور اس کے سپاہیوں کے مظالم کی داستان بھی سنا دی۔

تب نجاشی یمن کے بادشاہ ذونواس کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو گیا اور اپنی فوج لے کر حبشہ سے چل پڑا۔ جب وہ یمن کے علاقے میں پہنچا تو ذونواس بھی اپنی فوج کے ساتھ اس کے مقابلے پر آ گیا۔ دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی اور بالآخر نجاشی نے فتح پائی۔ ذونواس اور بہت سے یہودی مارے گئے اور یمن بھی نجاشی کے زیرِ تسلط آ گیا۔

ذونواس کے قتل ہو جانے کے بعد یہودیت دم توڑ گئی اور دینِ مسیحؑ پھر سے مکمل طور پر رائج ہو گیا اور اس نے سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل کر لی۔

اصحابِ فیل

حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے بڑی سرگرمی سے عیسائیت کی تبلیغ کا آغاز کیا۔ اس کی یہ انتہائی کوشش تھی کہ مسیحؑ کے دین کو بحال کرے اور اس کی کھوئی ہوئی قوت واپس لے آئے۔

جب اس نے یہ دیکھا کہ ملک ملک کے لوگ حج کے لیے مکہ جاتے ہیں تو اس نے کوئی ایسا کام کرنے کی ٹھانی جس سے وہ کعبہ اور مکہ سے لوگوں کی توجہ ہٹا دے۔ نیز قریش اور اہل مکہ کو اس اعزاز سے محروم کر کے لوگوں کو اپنے ملک کی جانب مائل کرے۔

اس مقصد کے حصول کی خاطر اس نے یمن کے ایک شہر صنعاء میں ایک بڑا پرشکوہ گرجا تعمیر کرایا۔ جب عمارت مکمل ہو گئی تو اس کی بہترین آرائش کی گئی۔ اس کے لیے ایسے گرانبہا قالین اور پردے فراہم کیے گئے کہ جن کو دیکھ کر ہر شخص حیرت زدہ رہ جاتا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ ایسے شاندار گرجے کے ہوتے ہوئے اب کوئی بھی شخص مکہ نہیں جائے گا۔ بلکہ سبھی لوگ حتیٰ کہ خود قریش اور اہل مکہ بھی اسی گرجے کا رخ کریں گے۔ لیکن اس کے خیال کے برعکس نہ صرف یہ کہ اہل مکہ نے اس گرجے کی طرف کوئی توجہ نہ دی بلکہ یمن اور حبشہ کے لوگوں نے بھی مکہ کو فراموش نہیں کیا اور مراسم حج ادا کرنے کے لیے وہیں جاتے رہے۔ تاہم یہ معاملہ نجاشی کے بس سے باہر تھا۔ کیونکہ نیزے کی انی کے بل پہ لوگوں کے دلوں کو قابو میں لانا اور ان پر کوئی عقیدہ مسلط کرنا ایک امر محال ہے۔

اتفاقاً ایک تجارتی قافلہ مکہ سے صنعاء آیا۔ وہ سبھی عرب تاجر تھے اور کاروبار کے لیے وہاں آئے تھے۔ ان میں سے چند اشخاص اس گرجے کے ایک کمرے میں ٹھہرے۔ چونکہ ان دنوں سخت سردی پڑ رہی تھی اس لیے وہ آگ جلا کر تاپتے رہے۔ لیکن وہاں سے جاتے وقت وہ اسے بجھانا بھول گئے اور رفتہ رفتہ وہ آگ سارے گرجے تک پھیل گئی، جس سے وہ جل بجھ گیا۔ جب گرجے میں آگ لگنے اور اس کے جل جانے کے اس واقعہ سے نجاشی کو مطلع کیا گیا تو وہ بے حد غضبناک ہوا۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگا کہ ہو نہ ہو ان عربوں نے دشمنی کی بنا پر ہمارے گرجے کو آگ لگا دی ہے۔ چنانچہ اس نے قسم کھائی کہ وہ بھی ان کے کعبہ کو ڈھا دے گا اور اس کا نشان تک مٹا کر دم لے گا۔

اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے اپنے سپہ سالار (ابرہہ) کو طلب کیا اور اسے گھوڑوں، ہاتھیوں کے مسلح سواروں اور پیدل فوجیوں کے ساتھ مکہ روانہ کر دیا۔

چنانچہ ابرہہ نے ایک تباہ کن سیلاب کی مانند عظیم لشکر کے ساتھ

مکہ کی جانب کوچ کیا۔ وہ راستے میں لوٹ مار کرتا رہا اور جہاں کہیں بھیڑیں، گائیں یا اونٹ نظر آئے، انھیں اپنے قبضے میں لے لیا۔ پھر حجاز کے بیابان میں اسے ایک شتربان ملا جس کے پاس دو سو اونٹ تھے۔ یہ اونٹ عبدالمطلب کے تھے اور وہ شتربان بھی انھیں کے ملازموں میں سے تھا۔ ابرہہ نے ان اونٹوں پر بھی قبضہ کر لیا اور آگے بڑھ کر مکہ شہر کے باہر پڑاؤ ڈال دیا۔

ابرہہ اپنے خیمے میں تخت پر بیٹھا تھا اور اس کی فوج کے افسر اس کے حضور کھڑے تھے۔ اسی اثناء میں اس کا دربان اندر آیا اور کہنے لگا: مکہ کے رئیس اور قریش کے سردار عبدالمطلب خیمے کے باہر موجود ہیں اور اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ ابرہہ نے کہا: اجازت ہے، ان کو لے آؤ۔ اس کے ساتھ ہی عبدالمطلب خیمے کے اندر آگئے۔ ان کے چہرے پر بزرگی اور عظمت کی نشانیاں نمایاں تھیں۔

ابرہہ نے انھیں دیکھا تو بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھا اور چند قدم آگے آکر ان کا استقبال کیا۔ انھیں تخت پر اپنے پہلو میں جگہ دی اور ان کا پورا پورا احترام کیا اور اپنے مترجم سے کہا: عبدالمطلب سے دریافت کرو کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں؟

آپ نے جواب دیا: مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کے سپاہیوں نے میرے اونٹ پکڑ لیے ہیں۔ میں آپ سے درخواست کرنے آیا ہوں کہ آپ میرے اونٹ مجھے واپس دلا دیں۔

ابرہہ نے کہا: کتنی عجیب بات ہے! میں کعبہ ڈھانے اور اس شخص کی بزرگی کی بنیاد کو مسمار کرنے آیا ہوں اور اسے اپنے اونٹوں

کی فکر ہے۔ خدا کی قسم! اگر یہ شخص مجھ سے کہتا کہ میں یہیں سے لوٹ جاؤں اور کعبہ کو نہ ڈھاؤں تو میں اس کا احترام کرتے ہوئے واپس چلا جاتا۔

عبدالمطلب نے فرمایا: میں ان اونٹوں کا مالک ہوں اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے۔ مجھے اپنے اونٹوں کی حفاظت کرنی چاہیے اور جو اس گھر کا مالک ہے' وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ ابرہہ نے حکم دیا کہ عبدالمطلب کے اونٹ واپس کر دیے جائیں۔

اس کے بعد وہ کعبہ کو ڈھا دینے کے ارادے سے مکہ کی جانب بڑھا۔ لیکن ابھی اس نے شہر میں قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ ابابیل نام کے چھوٹے چھوٹے پرندے مکہ کے آسمان پر نمودار ہو گئے اور رفتہ رفتہ ابرہہ کی فوج کے سر پر پہنچ گئے۔ وہ پرندے بمبار ہوائی جہازوں کی مانند سجیل نامی سنگریزے اٹھائے ہوئے تھے اور سپاہیوں کے سروں کا نشانہ لے کر ان پر گرا رہے تھے۔ چنانچہ ان کا پھینکا ہوا ہر سنگریزہ ابرہہ کی فوج کے ایک نہ ایک سپاہی کی ہلاکت کا موجب بن گیا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک آدمی کو چھوڑ کر ابرہہ کی ساری فوج ہلاک ہو گئی۔ وہ آدمی وہاں سے بھاگ کر حبشہ پہنچا اور وہاں نجاشی کے سامنے حاضر ہوا۔ تب اس نے بادشاہ کو فوج کے مارے جانے کا سارا واقعہ تفصیل سے بتایا۔

نجاشی نے حیرت سے پوچھا: جن پرندوں نے ہماری فوج کو ہلاک کیا ہے' ان کی شکل کیسی تھی؟

عین اسی وقت ایک ابابیل فضا میں نمودار ہوئی۔ اس آدمی نے کہا: بادشاہ سلامت! یہ پرندہ انہیں خطرناک پرندوں میں سے ایک

ہے جنہوں نے ہماری فوج کو ہلاک کیا ہے۔
جونہی اس آدمی نے اپنی بات ختم کی، اس ابابیل نے ایک سنگریزہ اس کے سر پر پھینک دیا اور وہ بے جان ہو کر نجاشی کے سامنے گر پڑا۔
یہ واقعہ اس سال پیش آیا جس میں محمد رسول اللہ ﷺ کی ولادت ہوئی تھی۔

بعثت

حضرت عیسیٰؑ کے بعد کئی صدیاں بیت گئیں اور ان میں خدا کی طرف سے کوئی اور پیغمبر مبعوث نہیں ہوا تھا۔ کچھ لوگ عیسائیت کے تابع اور کچھ یہودیت کی پیروی کرتے تھے۔ لیکن بیشتر لوگ سرے سے خدائے واحد کی ذات ہی کے منکر تھے۔

وہ ایک تاریک اور بھیانک دور تھا۔ بت پرستی عام تھی اور بالخصوص حجاز اور مکہ کے لوگ دوسری ہر چیز کے مقابلے میں بت پرستی کی طرف زیادہ مائل تھے۔ انسانوں میں سے انسانیت کی روح رخصت ہو چکی تھی اور وحشت اور بربریت نے ان کے سروں پر سایہ ڈال رکھا تھا۔ قتل اور خونریزی ایک معمولی چیز سمجھی جاتی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں سے گناہ کا احساس مٹ گیا تھا اور ہدایت کا چراغ بجھ چکا تھا۔

اندریں صورت جزیرۃ العرب بدبختی کے سمندر میں غوطے کھا رہا

تھا۔ دختر کشی نے معاشرے کے نظام کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ مزید براں شراب نوشی۔ بدکاری۔ جوا بازی۔ سود خوری۔ چوری اور دوسری برائیاں کم و بیش عام ہو چکی تھیں۔ دین۔ روحانیت اور اخلاقی فضائل کے بازار کی رونق ماند پڑ چکی تھی اور کوئی ان کا خریدار نہ رہا تھا۔

اس تاریک اور پریشان کن دور میں جبکہ دنیا فتنہ و فساد سے پُر تھی۔ اچانک ایک عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔ پروردگار عالم نے دنیا تے بشریت کے لیے اسلام کے عالی مقام پیغمبر، خاتم الانبیاء حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مبعوث فرمایا اور بنی نوع انسان کی ہدایت کا فریضہ ان کے سپرد کیا۔

رسول اکرمؐ کی بعثت کے ساتھ ہی لوگوں کی زندگی کے افق میں سعادت کا نور چمکا اور ان کے لیے نیک بختی کا دریچہ کھل گیا۔

حضرت موسیٰ بن عمرانؑ کا دین انسانیت کا ابتدائی اور عیسیٰ بن مریمؑ کا دین گویا وسطی مکتب تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے کے لیے مبعوث ہوا اور انہوں نے بنی نوع انسان کو منزل کمال کی راہ دکھائی لیکن خاتم الانبیاءؐ کا دین وہ دارالعلوم تھا جو فقط ایک نسل کے لیے نہیں آیا بلکہ خدائے تعالیٰ نے انہیں قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے بھیجا۔ کیونکہ وہ سب پیغمبروں میں آخری پیغمبر تھے جو رسالت پر مبعوث ہوتے۔

لیکن اس نورانی چراغ سے فائدہ اٹھانے اور اس کی روشنی میں اپنی خوش بختی کو یقینی بنانے کی بجائے مکہ کے بت پرستوں نے علم مخالفت

بلند کر دیا اور خدا کے اس نور کو گل کر دینے کی تگ و دو کرنے لگے۔ وہ آنحضرتؐ کی دعوت کے جواب میں کبھی تمسخر اڑاتے، کبھی ناروا تہمتیں لگاتے اور کبھی بزدلانہ طریقوں سے آزار پہنچاتے تھے۔ اسی دوران میں رسول اکرمؐ دین حق کی تبلیغ کے لیے طائف تشریف لے گئے۔ وہاں کے لوگوں نے نہ صرف یہ کہ آپکی دعوت قبول نہ کی، بلکہ کچھ لوگوں کو راستے میں بھیج دیا۔ پھر جب آنحضرتؐ مکہ واپس جانے کے لیے وہاں سے گزرے تو ان لوگوں نے آپ پر پتھر پھینکے، یہاں تک کہ حضورؐ کے پاؤں سے خون جاری ہو گیا۔

کفارِ قریش نے رسول اکرمؐ کو قتل کرنے کے بڑے منصوبے بنائے اور اس کے لیے بہت کوششیں کیں۔ لیکن خدائے تعالیٰ نے کچھ مردانِ حق کے ہاتھوں ان کے منصوبوں کو ناکام بنا دیا۔ اس سلسلے میں رسول اکرمؐ کے محترم چچا ابو طالب کی جاں نثاری واقعی تعریف کے قابل ہے۔ جو لوگ اسلام کی تاریخ سے پوری طرح واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ابو طالب اور ان کے فرزند امیر المومنین علیؑ کا اسلام کی پیشرفت میں بہت بڑا حصہ ہے۔

وہ پہلا شخص جو خاتم الانبیاءؐ پر ایمان لایا اور جس نے ارادت کا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دیا وہ امام علی المرتضیٰؑ تھے۔ جنہوں نے اکثر مواقع پر رسول اکرمؐ کے دفاع کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر قرآن شریف کی آیات زندہ گواہ ہیں۔

لیلۃ المبیت وہ رات ہے جس میں رسول اکرمؐ کے تقریباً ساٹھ جانی دشمنوں نے ارادۂ قتل سے ان کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ آنحضرتؐ نے اس رات امام علی المرتضیٰؑ کو اپنے بستر میں سلایا اور خود خدا کی رہنمائی

میں مکہ سے نکل گئے۔ اگرچہ وہ رات بڑی خطرناک تھی، لیکن حیدرِ کرارؑ پختہ ایمان کے ساتھ رسول اکرمؐ پر جان فدا کرنے کے لیے ان کے بستر میں سو گئے۔

یہ ان سیکڑوں مواقع میں سے ایک موقع تھا جب علی المرتضیٰؑ نے اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کے دفاع کی خاطر جاں نثاری اور سرفروشی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے علاوہ دیگر مواقع کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بڑی کتابوں سے رجوع فرمائیں۔

چنانچہ بدر، احد، احزاب، خیبر اور بہت سے دوسرے معرکے مسلمانوں کے عظیم پیشوا امام علیؑ کی فداکاری اور سرفروشی پر گواہ ہیں۔

ایک اور پہلو کہ جس کا اس بحث کے آخر میں ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک عظیم اور جاں نثار خاتون کی خدمات ہیں۔

رسول اکرمؐ کی باوفا زوجہ ام المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰؑ وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے آنحضرتؐ کی دعوت قبول کی اور ان پر ایمان لائیں۔ انہوں نے اسلام کی بھرپور خدمت کی اور اس کے لیے جان اور مال کی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ چنانچہ اسلام کی تبلیغ و ترقی میں ان محترم بی بی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

بی بی خدیجہؑ اپنی ان مساعی جمیلہ اور عظیم ترین خدمات کی بدولت دنیا کی تمام عورتوں کے لیے افتخار کا موجب بنیں اور انہوں نے دنیا اور آخرت میں بلند ترین مقامات حاصل کیے۔

معراج

وہ خدا پاک و پاکیزہ ہے جس نے اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی۔ جس کے چوگرد ہم نے ہر طرح کی برکت مہیا کر رکھی ہے تاکہ ہم اس کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔

(سورۂ بنی اسرائیل - آیت ۱)

جب رات ختم ہونے کو آئی اور صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تو رسول اکرمؐ نے ابوطالبؑ کی بیٹی ام ہانی سے وضو کے لیے پانی طلب کیا۔ پھر آپ نے وضو کیا اور اول وقت میں نماز صبح ادا فرمائی۔ نماز کے بعد آپ نے ام ہانی کو اپنے پاس بلایا، تاکہ انھیں اس عظیم واقعہ کے بارے میں بتائیں جو اسی رات رونما ہوا تھا۔ یہ ایک بڑا عجیب اور قابل توجہ معاملہ تھا، جسے خدائے تعالیٰ نے اپنے پیارے نبیؐ کے لیے مخصوص فرمایا اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا، جو اس نے اپنے برگزیدہ رسولؐ کو عطا کیا۔

ام ہانی جو رسول اکرمؐ پر سچے دل سے ایمان رکھتی تھیں، جب وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے فرمایا:

اے ام ہانی! جیسا کہ تم نے دیکھا، میں نے رات کو عشاء کی نماز یہاں پڑھی تھی۔ اس کے بعد خدا مجھے بیت المقدس لے گیا چنانچہ میں نے مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھی اور اب

جیسا کہ تم دیکھ رہی ہو صبح کی نماز یہاں پڑھی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اب میں قریش کے مجمع میں جاؤں اور خدائے تعالیٰ نے مجھ پر جو یہ عنایت فرمائی ہے، انھیں اس کی اطلاع دوں اور انھیں اس کی بے انتہا قدرت سے آگاہ کروں۔

ام ہانی ایک باایمان خاتون تھیں اور رسول اکرمؐ کی نبوت پر اعتقاد رکھتی تھیں۔ لہٰذا انھیں آنحضرتؐ کی راستگوئی کے بارے میں رتی بھر شک وشبہ نہ تھا۔ چنانچہ اس خبر کی صحت بھی ان کے لیے سورج کی طرح واضح اور روشن تھی۔ تاہم وہ قریش کو اچھی طرح جانتی تھیں اور انھیں علم تھا کہ وہ رسول اکرمؐ سے سخت دشمنی رکھتے ہیں، کس طرح ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور انھیں تکلیفیں پہنچاتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ رسول اکرمؐ کے اس ارادے سے خوش نظر نہ آئیں۔ کیونکہ وہ ڈرتی تھیں کہ قریش یہ سب کچھ سن کر ان کا مذاق اڑائیں گے اور شاید زیادتی پر بھی اتر آئیں۔

ام ہانی تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر انھوں نے سر اٹھایا اور کہنے لگیں:

> اے محترم رسولؐ! اور اے میرے عزیز چچا زاد بھائی! میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ آپ اس مشرک قوم کے پاس نہ جائیں اور یہ واقعہ انھیں نہ سنائیں۔ وہ آپ کے دشمن ہیں اور آپ کو تکلیف پہنچانے کے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ آپ اس خبر کو پوشیدہ ہی رہنے دیں۔ تاکہ آپ کے دشمنوں کو زیادتی کرنے کا ایک اور موقع نہ ملنے پائے۔

یہ باتیں اگرچہ سچے دل کے ساتھ خیر خواہی کرتے ہوئے کہی گئیں لیکن رسول اکرمؐ کے لیے قابلِ قبول نہ تھیں اور ان کی لغت میں لفظ 'خوف' کے کوئی معنی نہ تھے۔

چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد رسول اکرمؐ گھر سے نکل کر مسجد الحرام کی جانب روانہ ہوگئے۔ وہاں قریش کے کچھ افراد جمع تھے اور جب ابوجہل کی نظر آنحضرتؐ پر پڑی تو اس نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا: کیا خدا کی طرف سے تمہارے لیے کوئی تازہ چیز نہیں آئی؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: کیوں نہیں! گزشتہ رات خدائے تعالیٰ مجھے بیت المقدس لے گیا تھا۔

ابوجہل نے کہا: اچھا تو تم پچھلی رات بیت المقدس گئے اور اب صبح کے وقت یہاں موجود ہو؟

آپ نے فرمایا: ہاں! خدائے تعالیٰ مجھے راتوں رات بیت المقدس لے گیا۔ وہاں میں نے گزشتہ پیغمبروں سے ملاقات بھی کی۔ جن میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰ بن مریمؑ شامل تھے۔ میں نے وہاں نماز کی امامت کی اور وہ میری اقتدا میں تھے۔

مطعم بن عدی نے کہا: کیا تم نے دو ماہ کی مسافت ایک رات میں طے کی؟ میں یقین سے کہتا ہوں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ قریش نے کہا: تمہارے پاس اس دعوے کی سچائی کے بارے میں کیا ثبوت ہے؟

آپ نے فرمایا: گزشتہ رات فلاں وادی میں میری ملاقات فلاں قافلے کے لوگوں سے ہوئی۔ ان کا اونٹ گم ہو گیا تھا اور وہ اسے تلاش کر رہے تھے۔ ان کے سامان میں پانی کا ایک برتن تھا جسے انہوں

نے ڈھانک رکھا تھا۔ میں نے اس برتن میں سے پانی پیا اور پھر اسے ڈھانک دیا۔

قریش نے کہا: یہ تو ہوا ایک ثبوت، اب بتاؤ اس کا دوسرا ثبوت کیا ہے؟

آپ نے فرمایا: میری ملاقات فلاں قافلے سے بھی ہوئی۔ ان کا ایک اونٹ بھاگ نکلا اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ چنانچہ اس قافلے کے یہاں پہنچنے پر تم اس بارے میں ان لوگوں سے دریافت کر سکتے ہو، تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں واقعی سچ کہہ رہا ہوں۔

انہوں نے کہا: ہاں! یہ بھی ایک ثبوت ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تم نے ہمارا وہ تجارتی قافلہ کہاں دیکھا؟

آپ نے فرمایا: میں نے تمہارا قافلہ تنعیم کی وادی میں اس حالت میں دیکھا ہے کہ اس قافلے کے آگے آگے ایک سیاہ اور سفید رنگ کا اونٹ چل رہا تھا اور وہ قافلہ سورج نکلتے ہی یہاں پہنچ جائے گا۔

قریش نے یہ جملہ سن کر کہا: چلو اچھا ہوا کہ محمدؐ نے اپنے اور ہمارے درمیان خود ہی فیصلہ کر دیا۔ ابھی چند لمحے گزرنے پر سورج نکل آئے گا اور اس کا سچ جھوٹ کھل جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ بیابان کی جانب چل دیے اور شہر سے باہر جا کر سورج نکلنے اور قافلے کے پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔

انہیں وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ان میں سے ایک نے بہ آواز بلند کہا: لو سورج نکل آیا ..... اور دوسرے نے کہا: وہ دیکھو کہ جیسے محمدؐ نے خبر دی تھی، ہمارا قافلہ بھی اسی حالت میں دور سے آتا دکھائی دے رہا ہے۔

لیکن یہ واضح نشانی دیکھ کر بھی قریش نے اپنی ضد ترک نہ کی، دشمنی سے باز نہ آئے اور اپنے کفر اور سرکشی پر قائم رہے۔

ہجرت

جب کفار تم سے فریب کر رہے تھے، تاکہ تم کو قید کرلیں یا مار ڈالیں یا گھر سے نکال باہر کریں۔ وہ تو یہ تدبیر کر رہے تھے اور خدا بھی تدبیر کر رہا تھا اور وہ تو سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔

(سورۂ انفال۔ آیت ۳۰)

قریش کے بت پرستوں نے واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود رسول اکرمؐ کی تبلیغات کے مقابلے میں ضد اختیار کی اور دین حق کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ ایمان لے آئے تو ان کی سرداری ختم ہو جائیگی اور معاشرے میں ان کا عمل دخل ختم ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی انھیں اس بات کا یقین بھی نہیں آتا تھا کہ رسول اکرمؐ کوئی کارنامہ کرسکیں گے اور کامیابی حاصل کرلیں گے۔ لہٰذا شروع شروع میں ان کی مخالفت محض تمسخر اڑانے اور بعض اوقات آنحضرتؐ پر پتھر پھینکنے تک ہی محدود تھی۔

لیکن انھوں نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ رسول اکرمؐ کی تبلیغ لوگوں کے دلوں پر اثر کر رہی ہے اور کئی ایک اشخاص ان پر ایمان لے آئے ہیں۔ اس بات سے وہ بھی چونک گئے اور ان کی خصومت میں بھی شدت آگئی۔ تب وہ پورے ارادے سے آنحضرتؐ اور ان کے پیرووں کو اذیتیں دینے کے درپے ہو گئے۔ تاہم ان کی سخت گیری اور ایذا رسانی کے مقابلے میں

مسلمانوں نے حیرت انگیز صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ لیکن جب قریش کو یہ خبر لگی کہ مدینہ کے لوگ رسول اکرمؐ کی بیعت کر کے مسلمان ہو گئے ہیں اور بالخصوص جب انہوں نے یہ سنا کہ بعض مسلمانوں نے مدینہ جا کر اس شہر کو اپنی جائے پناہ بنالیا ہے تو ان کی سختی اور ایذا رسانی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔

اوس اور خزرج مدینہ کے دو بڑے قبیلے تھے۔ ان قبیلوں کے اسلام قبول کرنے پر قریش اس قدر مضطرب ہوئے کہ وہ فوراً ہی دارالندوہ (ٹاؤن ہال) میں جمع ہو گئے تاکہ رسول اکرمؐ کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کریں۔ چنانچہ نضر بن حارث۔ ابوجہل۔ عتبہ۔ شیبہ۔ ابوالبختری بن ہشام۔ امیہ بن خلف وغیرہ کہ جو قریش کے سردار اور سربرآوردہ افراد تھے، وہ وہاں مل بیٹھ کر آپس میں مشورہ کرنے لگے۔

ان میں سے ایک شخص نے گفتگو کا آغاز کیا اور کہا: جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ محمدؐ کا معاملہ ہمارے لیے بڑی مشکل کا باعث بن گیا ہے۔ کیونکہ ان کا اثر و نفوذ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور مکہ کے کئی افراد ان کے پیرو بن گئے ہیں۔ حتٰی کہ اب مدینہ بھی ان کی تبلیغات کے زیر اثر ہے۔ اندریں حالات ممکن ہے کہ ان کا دین دوسرے مقامات تک بھی پھیل جائے۔ آپ لوگ یہ بھی یاد رکھیں کہ ہم نے ان کو بہت تکلیفیں دیں اور ان کے پیروؤں پر بھی بے حد سختیاں کیں لیکن انہوں نے اپنا دین ترک نہیں کیا اور وہ اپنے عقیدے پر ثابت قدم رہے ہیں۔

تاہم جس چیز نے ہمیں سب سے زیادہ پریشان کر رکھا ہے وہ مدینہ کے لوگوں کا اسلام قبول کرنا اور مکہ کے مسلمانوں کا وہاں ہجرت کرنا ہے۔ اس وقت اہل مدینہ محمدؐ کے بہترین مددگار اور ساتھی ہیں۔ بلاشبہ محمدؐ بھی

عنقریب مدینہ چلے جائیں گے۔ جس سے ہماری مشکلات اور بھی بڑھ جائیں گی اور ہم ان کے ہاتھ سے محفوظ نہیں رہیں گے۔ کیونکہ چند ہی دنوں میں وہ اپنے مسلح لشکر کے ساتھ ہم پر حملہ کردیں گے۔ یوں وہ ہماری سرداری ختم کر کے ہماری زندگی کو اجیرن بنا دیں گے۔ اب آپ لوگ جو اس محفل میں موجود ہیں، میری ان باتوں کو سامنے رکھ کر اپنی تجویزیں پیش کریں اور مناسب فیصلے پر متفق ہو جائیں۔

ابوالبختری نے کہا: محمدؐ کو آہنی زنجیروں میں جکڑ کر قید کردینا چاہیے، تاکہ وہ قید خانے کے ایک گوشے میں جکڑے جکڑے ہی مرجائیں لیکن دوسروں نے کہا کہ یہ رائے درست نہیں ہے۔ کیونکہ بنی ہاشم کے لوگ اور محمدؐ کے جاں نثار ساتھی انھیں کسی نہ کسی طرح چھڑالے جائیں گے اور ہمارا مقصد فوت ہو جائے گا۔

ربیعہ بن عمرو نے کہا: ہمیں چاہیے کہ انہیں مکے سے نکال دیں اور اس ذہنی کوفت سے نجات پالیں لیکن دوسروں نے کہا کہ یہ تجویز بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ محمدؐ جہاں بھی جائیں گے اپنی فصیح زبان اور دلنشیں باتوں سے لوگوں کو اپنا ہم نوا بنالیں گے۔

ابوجہل نے کہا: میرا خیال تو یہ ہے کہ ہم ہر قبیلے سے ایک ایک جوان لے کر ایک دستہ تشکیل دیں، جو تلواریں لے کر رات کے وقت محمدؐ پر ٹوٹ پڑیں اور سبھی ایک ساتھ ان پر وار کریں تاکہ ان کا خون سب قبیلوں میں تقسیم ہو جائے۔ تب کوئی بھی شخص ان تمام قبیلوں سے لڑنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ یہ رائے سب نے پسند کی اور اس پر عمل کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

اسی وقت جبرئیلؑ رسول اکرمؐ کے پاس آئے۔ انہیں قریش کے فیصلے سے آگاہ کیا اور کہا: اسی رات جبکہ قریش آپ کے گھر کا محاصرہ کر رہے ہیں، علیؑ کو اپنے بستر میں سلاکر آپ کو راتوں رات مکہ سے نکل جانا چاہیے۔

تب رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کو بلایا اور انہیں خدا کے اس حکم سے مطلع کیا۔ انہوں نے یہ تجویز خندہ پیشانی سے قبول کر لی اور آنحضرتؐ کو بچانے کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہو گئے۔

جب رات ہو گئی تو کفار قریش نے رسول اکرمؐ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور آپ کو قتل کر دینے کے فیصلے پر عمل کرنے کے لیے صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ اس دوران میں خدائے تعالیٰ نے ان پر نیند مسلط کر دی آنحضرتؐ اپنے رب پر بھروسہ کر کے ان کے بیچ میں سے نکل گئے اور وہ آپ کو دیکھ نہ سکے۔

جب صبح ہوئی اور روشنی پھیل گئی تو کفار کو پتا چلا کہ رسول اکرمؐ کی جگہ پر امام علیؑ سوئے ہوتے ہیں اور وہ رات سے صبح تک انہیں کی نگرانی کرتے رہے ہیں۔ اس پر کفار قریش نے رسول اکرمؐ کو بہت تلاش کیا اور غارِ ثور تک بھی پہنچے کہ جس میں آنحضرتؐ پوشیدہ تھے۔ لیکن وہ آپ کو وہاں دیکھ نہ پائے اور ناامید ہو کر واپس آ گئے۔

رسول اکرمؐ نے تین دن اسی غار میں بسر کیے۔ پھر خدائے تعالیٰ کے حکم سے مدینہ روانہ ہو گئے۔

اہل مدینہ جو ایک عرصے سے رسول اکرمؐ کی تشریف آوری کے منتظر تھے، وہ آپ کے استقبال کے لیے نکل آئے لیکن آپ نے شہر سے باہر قیام فرمایا اور کہا کہ جب تک میرے چچا زاد بھائی علیؑ مجھ سے نہ آملیں

میں مدینہ میں داخل نہیں ہوں گا۔

رسول اکرمؐ کی ہجرت کے بعد امام علیؑ نے آنحضرتؐ کے ارشاد کے مطابق لوگوں کی امانتیں واپس کیں اور پھر اپنی والدہ فاطمہ بنت اسد اور رسول اکرمؐ کی صاحبزادی فاطمہ زہراؑ اور کچھ دوسرے لوگوں کو ساتھ لے کر مدینہ روانہ ہو گئے۔

جب امام علیؑ مدینہ پہنچے تو رسول اکرمؐ آپ کی آمد پہ بیحد خوش ہوئے اور پھر ان کو ہمراہ لے کر مدینہ شہر میں داخل ہوئے۔ بعد میں آنحضرتؐ کی ہجرت کے دن سے ہی مسلمانوں کی تقویم کا آغاز ہوا تھا۔

مدینہ میں آمد

رسول اکرمؐ کی مدینہ شہر میں آمد کی رسوم بڑی شان و شوکت اور احترام کے ساتھ ادا کی گئیں اور وہاں کے لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

آنحضرتؐ کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ کو یثرب کہا جاتا تھا۔ لیکن آپ کی آمد کی بدولت اسے "مدینۃ الرسولؐ" یعنی "پیغمبرؐ کا شہر" کہا جانے لگا۔

رسول اکرمؐ نے مدینہ آکر جو پہلا اقدام کیا وہ ایک مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں تھا جو درحقیقت آپ کی تمام سرگرمیوں کا محور اور مرکز شمار ہوتی تھی۔

ہجرت کے پہلے سال میں آنحضرتؐ کی توجہ مسلمانوں میں اتحاد اور یگانگت پیدا کرنے۔ دو بڑے قبیلوں اوس اور خزرج کے باہمی اختلافات

ختم کرنے اور قریبی ہمسایوں کے ساتھ معاہدے کرنے پر مرکوز رہی۔ چنانچہ مدینہ کے نواح میں رہنے والے یہودیوں کے ساتھ پیمان امن باندھا گیا۔ جس میں طے پایا کہ طرفین کسی صورت میں بھی ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچائیں گے اور مل جل کر امن وسکون کے ساتھ رہیں گے۔ اس سال میں ایک اور اہم کام یہ کیا گیا کہ جو اشخاص آپس میں فطری اور ذہنی ہم آہنگی رکھتے تھے وہ ایک دوسرے کے بھائی بنا دیے گئے اور آنحضرتؐ نے خدا کے حکم سے مہاجرین اور انصار پہ مشتمل اپنے ساتھیوں میں اس طرح بھائی چارہ قائم کیا کہ ایک ایک مہاجر کو ایک ایک انصاری کا بھائی قرار دیدیا اور جب امام علیؑ کی باری آئی تو فرمایا: علیؑ میرا بھائی ہے۔

ایسے میں ہجرت کا دوسرا سال شروع ہوگیا۔ اس وقت تک مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا' وہ اسی کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے تھے۔ چنانچہ اس سال کے شروع میں یہ حکم نازل ہوا کہ مسلمان کعبہ کی طرف منہ کرکے نماز ادا کریں۔

تاہم قبلہ کی یہ تبدیلی یہودیوں کے لیے ایک بڑا نقصان اور مہلک ضرب ثابت ہوئی۔ کیونکہ مدینہ کے نواح میں رہنے والے یہودی بیت المقدس کے قبلہ ہونے کو اپنے دین اور اپنی قوم کے لیے موجب فخر سمجھتے تھے۔ وہ یہ امید رکھتے تھے کہ وحدت قبلہ کی بنا پر مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر متحد قوت بنالیں گے اور جزیرہ نمائے عرب میں عیسائیت کا خاتمہ کرکے یہودیت کو عربوں کا عوامی مذہب بنا دیں گے لیکن تحویل قبلہ کے اس واقعہ سے اچانک ان کی امیدوں پہ پانی پھر گیا اور انہیں پتا چل گیا کہ اسلام میں اتنی طاقت ہے کہ ہمارے لیے اس سے غلط فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔

لیکن قبلہ کی تبدیلی کا مسئلہ جہاں یہودیوں کے لیے گراں اور مایوس کن تھا، وہاں مسلمانوں کے لیے بے حد سود مند ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان مکہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور ان کے ذہنوں میں عبادت کے پہلو کے علاوہ کچھ اور خیالات بھی ابھر آئے۔

چونکہ مسلمانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ دن میں کم از کم پانچ دفعہ مکہ کی جانب منہ کر کے کھڑے ہوں۔ تب وہ سوچیں اور یاد کریں کہ وہی مکہ جو مسلمانوں کا کعبہ ہے، اسے فضیلت، تقویٰ اور اخلاص کا مرکز ہونا چاہیے۔ لیکن وہ شرک، بت پرستی اور بداعمالیوں کا گڑھ بنا ہوا ہے اور خدا کا گھر بت خانے میں تبدیل ہو گیا ہے۔

چنانچہ جب مسلمان اس نکتے پر غور کرتے تو انہیں خیال آتا کہ جس طرح بھی ہو سکے اس عظیم گھر کو بتوں اور بت پرستوں کے وجود سے پاک کر دینا چاہیے۔ تاکہ وہاں صحیح معنوں میں خدائے واحد کی پرستش ہوا کرے۔ تحویل قبلہ سے ایک نتیجہ بھی برآمد ہوا، وہ ہر لحاظ سے مسلمانوں کی یک جہتی اور اتحاد تھا کیونکہ خدائے تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ مومن ہر بات میں ایک دوسرے کے ساتھ متفق اور متحد ہو کر رہیں۔ جیسا کہ وہ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

> تم خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔ ہاں خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو خدا نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور اس کی مہربانی سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ (سورہ آل عمران - آیت ۱۰۳)

لہٰذا اگر یہ طے کر لیا جاتا کہ مسلمان نماز میں مختلف سمتوں کو منہ کر کے کھڑے ہوں تو اس اختلاف کے نتیجے میں ان کے عقیدے، طرزِ عمل اور دوسری چیزوں میں بھی اختلاف ابھر آتا لیکن تحویلِ قبلہ کے اس عمل کے ساتھ خدائے تعالیٰ نے ضروری قرار دیا کہ نماز کی حالت میں تمام مسلمانوں کا منہ ایک ہی طرف ہو۔ تاکہ ان میں معنوی اتحاد کے ساتھ ساتھ صوری اتحاد بھی قائم ہو جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے قوانین وضع کرنے والی اس ذات کو نیک اور اچھے کاموں میں مسلمانوں کا اتفاق اور اتحاد کس قدر پسند ہے۔

جنگِ بدر

قریش کا تجارتی قافلہ ابو سفیان کی سرکردگی میں شام سے مکہ کی جانب رواں تھا۔معمول کے مطابق اس قافلے کو بدر نامی ایک کنوئیں کے پاس سے گزرنا تھا۔تاہم ادھر سے گزرنے میں اس قافلے کے سربراہ کو ایک طرح کی تشویش لاحق ہوگئی تھی۔چنانچہ ابو سفیان بڑی دیر سے سر جھکائے بیٹھا تھا اور وہ خاصا خوف زدہ معلوم ہوتا تھا۔اسے ڈر تھا کہ مبادا مسلمانوں کو اس قافلے کے وہاں سے گزرنے کی خبر مل جائے اور وہ اس پر حملہ کردیں۔

چنانچہ چاہِ بدر کے نزدیک ابو سفیان کا یہ خدشہ اور بھی قوی ہوگیا کیونکہ اس کو مسلمانوں کی اس علاقے میں موجودگی کے کچھ آثار نظر آگئے۔تب اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر ایک آدمی کے ساتھ یہ طے کیا کہ وہ دس اشرفیاں اور ایک اونٹ معاوضے میں لے لے اور تین دن میں مکہ جاکر وہاں کے رؤسا کو ہمارے قافلے اور اس کے راستے کے حالات سے باخبر کرے۔

اس کے علاوہ اس نے حکم دیا کہ قافلہ پیچھے کو ہٹ جائے اور بحیرۂ احمر کے ساحل کے پاس سے گزرتا ہوا جدہ پہنچے۔

اُدھر تین دن بعد شہر مکہ کے لوگوں نے ایک آواز سنی اور اس نے انہیں دہشت زدہ کر دیا' جب آواز دینے والا کہہ رہا تھا:

اے مکہ کے لوگو! اے قریش کے سردارو! تمہارے مال تجارت پر محمدؐ اور ان کے پیرو حملہ کرنے والے ہیں۔ اب تم لوگ جتنی جلد پہنچ سکتے ہو وہاں پہنچو۔ ان کی سرکوبی کرو اور اپنے قافلے کو بچاؤ۔

یہ آواز سن کر قریش نے جنگ کی تیاری کی اور تقریباً نوسو پچاس جنگجوؤں پر مشتمل ایک لشکر محاذ کی جانب روانہ ہو گیا۔

قریش کے سربرآوردہ اشخاص اور مکہ کے روسا مثلاً عتبہ۔ شیبہ۔ ولید بن عتبہ۔ ابوجہل۔ ابوالبختری۔ نوفل بن خویلد۔ امیہ بن خلف وغیرہ کہ جو قوم کے سردار تھے' وہ اس لشکر میں شامل تھے۔

ابھی وہ لوگ مکہ سے کچھ دور ہی گئے تھے کہ ابوسفیان کا ایک قاصد ان کے پاس پہنچا اور اس نے بتایا کہ قافلہ بچ کر نکل آیا ہے اور اب مکہ پہنچا ہی چاہتا ہے۔

یہ خبر ملنے کے بعد اس لشکر کے مدینہ کی طرف جانے کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی لیکن ابوجہل کہ جس کو جنگ کا بڑا ارمان تھا' اس نے کہا: اب یہ ایک امر محال ہے کہ ہم مکہ واپس چلے جائیں۔ پس ہمیں چاہیے کہ چاہِ بدر کے کنارے تک جائیں۔ وہاں عیش و نوش کی محفل گرم کریں اور کچھ وقت خوشی میں گزاریں۔ اس طرح محمدؐ اور ان کے ساتھیوں پر واضح

کردیں کہ ان کا مقابلہ کتنی عظیم طاقت سے ہے۔ یوں ان کو معلوم ہو جائے گا کہ انکی فوجی نقل وحرکت آگ سے کھیلنے کے مترادف ہے اور اس کا نتیجہ ان کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

ابوجہل کے اصرار کی بنا پر مجبوراً دوسرے اشخاص کو بھی محاذ جنگ پر جانا پڑا جو اس تجویز کے حق میں نہ تھے۔

ادھر رسول اکرمؐ بھی تین سو تیرہ مسلمانوں کو ساتھ لے کر اس مقام پر آگئے اور دونوں فوجوں نے چاہِ بدر کے پاس ایک دوسرے کے آمنے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔

اگرچہ اسلامی فوج ضروری جنگی سازوسامان سے خالی تھی لیکن رسول اکرمؐ کے وعدوں سے جن کا سرچشمہ وحی الٰہی تھا' مسلمان اتنے پرجوش ہوگئے تھے کہ ان کے دلوں میں رتی بھر خوف نہ تھا، اس کی بجائے انہیں اس بات کا پورا یقین تھا کہ وہ اپنے دشمن پر غالب آجائیں گے۔

اس جنگ کی کمان رسول اکرمؐ نے بنفس نفیس سنبھالی اور حکم دیا کہ تین پرچم لہرائے جائیں۔ ان میں سے ایک پرچم مہاجرین کا تھا جو مصعب بن عمیر کو سونپا گیا۔ دوسرا پرچم قبیلہ خزرج کے سردار حباب بن منذر کو دیا گیا اور تیسرا پرچم قبیلہ اوس کے رئیس سعد بن معاذ کو دیا گیا۔

قریش نے مسلمانوں کی تعداد اور سازوسامان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے عمیر بن وہب کو بھیجا جو ان معاملات کا ماہر تھا۔ عمیر ایک گھوڑے پر سوار ہو کر ان ٹیلوں پہ پہنچا جو مسلمانوں کی فوج کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے۔ تب اس نے ہر طرف بڑے غور سے نگاہ دوڑائی اور واپس آکر اپنی تحقیقات کا نتیجہ قریش کے سرداروں کے

سامنے ان الفاظ میں پیش کیا:

ہر ممکن جستجو کرنے کے بعد اتنا معلوم ہوا ہے کہ محمدؐ کے ساتھیوں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے اور ان کے پاس جنگی ساز و سامان بھی نہیں ہے۔ لیکن ان کی ظاہری کیفیت ایسی ہے کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ میں نے ان کے چہروں کو پڑھا ہے اور ان کی حرکات و سکنات کو دیکھا ہے۔ اگرچہ وہ خاموش رہنے والے لوگ ہیں لیکن لڑنے مرنے پر پوری طرح آمادہ ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اونٹوں نے گویا موت کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ میں نے ان کی یہ حالت دیکھی ہے کہ جب تک وہ مارے نہ جائیں، میدان سے نہیں ہٹیں گے اور اس وقت تک مارے نہیں جائیں گے جب تک ہم میں سے اتنے ہی آدمیوں کو قتل نہ کر دیں۔ اب آپ لوگوں کو اس بات پر اچھی طرح غور کر لینا چاہیے کیونکہ اس قوم کے ساتھ جنگ لڑنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

یہ سن کر عتبہ اور ربیعہ نے جنگ کا ارادہ ترک کر دیا لیکن ابوجہل اور کچھ دوسرے نادان اشخاص بہر نوع جنگ کے خواہشمند تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس جنگ میں وہ اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے اور مسلمانوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہنے دیں گے۔

اس موقع پر رسولِ اکرمؐ کا ایک قاصد قریش کے سرداروں کے پاس پہنچا اور انہیں آپ کا یہ پیغام پہنچایا:

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا تم سے جنگ لڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تم لوگ میرے رشتہ دار اور میرے قبیلے کے افراد ہو۔ اس لیے تم سے بھی یہی توقع ہے کہ تم میری دشمنی کی راہ میں قدم آگے نہیں بڑھاؤ گے، بلکہ مجھے

اور عربوں کو آزاد چھوڑ دو گے۔ اگر مجھے کامیابی ہوئی تو یہ چیز تمہارے لیے موجب فخر ہو گی اور اگر میں مارا گیا تو کوئی تکلیف اٹھائے بغیر تمہاری مراد پوری ہو جائے گی۔

یہ پیغام سن کر عتبہ نے کہا: اے قریش کے سردارو! میری بات سنو اور محمدؐ کے حق کی رعایت کرو۔ کیونکہ وہ ہمارے قبیلے کے شریف ترین افراد میں سے ہے۔ پس تم لوگ اس کے پیغام کو رد نہ کرو اور یہ بھی جان لو کہ جو شخص ضد کرتا ہے' وہ بعد میں پشیمان ہوتا ہے۔

اس پر ابو جہل برافروختہ ہو گیا اور کہنے لگا: اے عتبہ! تم نے یہ کیسی الجھن پیدا کر دی ہے؟ کیا تمہارے دل پر موت کا خوف مسلط ہو گیا ہے اور تم یہاں سے بھاگ نکلنے کا بہانہ تلاش کر رہے ہو؟

تب عتبہ غصے کے مارے کانپتا ہوا اپنے اونٹ سے اتر آیا اور ابو جہل کو بھی اس کے گھوڑے سے نیچے کھینچ لیا اور کہا: کیا تم مجھے ڈرپوک اور بزدل کہتے ہو؟ آؤ ہم دونوں ایک دوسرے سے جنگ کریں تاکہ لوگوں کو پتا چل جائے کہ ڈرپوک کون ہے اور بہادر کون ہے۔ تاہم قریش کے سرداروں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔

اسی اثنا میں دونوں فوجوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی اور طرفین میں سے عتبہ بن ربیعہ، اس کا بھائی شیبہ اور اس کا بیٹا ولید سب سے پہلے میدان جنگ میں آئے اور مسلمانوں میں سے عبداللہ بن رواحہ اور حارث کے بیٹوں عوف اور معوذ نے اپنے گھوڑے بڑھائے۔ اس وقت قبیلہ قریش کا ایک ممتاز شخص عتبہ ان سے کہنے لگا: ہم تمہیں اپنے ساتھ جنگ لڑنے کے قابل نہیں سمجھتے اور اپنے چچازاد بھائیوں کے علاوہ کسی کو اپنا

حریف اور ہم پلہ نہیں گردانتے۔

تب تینوں افراد کہ جن کا تعلق انصار سے تھا، میدان سے واپس چلے گئے اور ان کی جگہ علی ابن ابی طالبؑ، حمزہ بن عبدالمطلبؓ اور عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلبؓ میدان میں آئے اور انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ اس پر عتبہ نے کہا: ہاں! یہ تینوں اشخاص ہمارے ہم رتبہ ہیں اور ہم سے جنگ کرنے کے قابل ہیں۔

پھر امام علیؑ کا مقابلہ ولید سے ہوا اور انہوں نے پہلے ہی حملے میں اس کا بازو کاٹ دیا۔ اس نے اپنا کٹا ہوا بازو آپ کی طرف کھینچ مارا اور خود اپنے باپ کی جانب بھاگا۔ تاہم آپ نے اسے راستے میں ہی جا لیا اور ایک اور ضرب سے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ اپنے چچا حمزہؓ کی مدد کو پہنچے اور تلوار کی ایک ضرب کے ساتھ شیبہ کا کام تمام کر دیا۔

عبیدہ بن حارث کا سامنا عتبہ بن ربیعہ سے ہوا اور بالآخر دونوں زمین پر گر گئے۔ تب امام علیؑ عتبہ کے سر پہ جا پہنچے جو ابھی زندہ تھا اور اسے قتل کر دیا۔ پھر آپ حمزہؓ کے ساتھ مل کر زخمی عبیدہ کو رسول اکرمؐ کے پاس اٹھا لائے جو بعد میں زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے۔

چونکہ عتبہ، شیبہ اور ولید قریش کے قوی ترین افراد میں سے تھے، اس لیے ان کے قتل ہو جانے سے اہل مکہ کی کمر ٹوٹ گئی اور انہوں نے مکمل طور پر حوصلہ ہار دیا۔ جبکہ مسلمان پورے جوش سے لڑتے ہوئے کشتوں کے پشتے لگا رہے تھے۔ امام علیؑ اپنی خاص ہوشمندی اور مہارت کے ساتھ ہر طرف اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے دشمنوں کو ہلاک کر رہے تھے،

حتیٰ کہ ان کے ہاتھوں قتل ہونیوالوں کی تعداد چھتیس سے بھی بڑھ گئی۔

اس جنگ میں عتبہ، شیبہ اور ولید کے علاوہ ابوجہل اور قریش کے کئی اور افراد قتل ہوئے اور ان کے ستر آدمی قیدی بنا لیے گئے۔ یوں جنگ بدر کا خاتمہ مسلمانوں کے حق میں ہوا اور شرک و بت پرستی سے اسلام کی پہلی جنگ کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

اس طرح جنگ بدر نے اسلام کی تاریخ پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں نے اپنے مخالفین سے جنگ لڑی۔ جس میں وہ اپنی ایمانی قوت اور سرفروشی کی بدولت تعداد اور اسلحہ کے لحاظ سے تین گنا طاقتور دشمن پر غالب آئے اور یوں اسے عبرتناک شکست دی۔

جنگِ اُحد

جنگ بدر کے بعد مکہ کے بت پرستوں نے محسوس کیا کہ ان کی عزت کے دامن پر ایک ایسا شرمناک داغ لگ گیا ہے' جسے مسلمانوں سے انتقام لینے کے علاوہ کسی پانی سے دھونا ممکن نہیں اور جب تک وہ اپنے مقتولین کے خون کا بدلہ نہ لے لیں ان کے دل کو تسکین نہ ہوگی۔ لہٰذا ابوسفیان کہ جس نے کچھ عرصہ پہلے مکہ کی ریاست وقیادت سنبھالی تھی' اس نے یہ اعلان کیا کہ قریش کے کسی خاندان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے مقتولین کی عزاداری کرے اور ان کے لیے آنسو بہائے۔ کیونکہ رونے دھونے سے انسان کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور اس کا جذبۂ انتقام کمزور پڑ جاتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ یہ غصہ لوگوں کے دلوں میں بھڑکتا رہے' اس کا لاوا پھر کسی مناسب وقت پر پھٹ پڑے اور دشمنوں کو جلا کر راکھ کر دے۔

جنگ بدر کے حادثہ کو رونما ہوئے ابھی تقریباً ایک ہی سال ہوا

تھا کہ ابوسفیان جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے کچھ خطیبوں اور شاعروں کو مختلف قبائل کے پاس بھیجا۔ تاکہ وہ جنگ بدر کے واقعات سنا سنا کر لوگوں کو اکسائیں اور انھیں مشترک دشمن سے انتقام لینے پہ آمادہ کریں۔

قریش کا وہ مالِ تجارت کہ جس کی حفاظت کے لیے جنگ بدر لڑی گئی اور جس کے کئی حصہ دار اپنی جانیں گنوا بیٹھے تھے۔ وہ ابھی تک ابوسفیان ہی کے قبضے میں تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ یہ کثیر دولت مسلمانوں سے انتقام لینے پر خرچ کی جائے گی۔

اس طرح قریش کی ہمہ پہلو اور پیہم کوششوں کے نتیجے میں پانچ ہزار مسلح افراد پر مشتمل ایک بڑی طاقتور فوج تیار ہو گئی۔ جس میں تین ہزار دو سو گھڑ سوار اور شتر سوار اور آٹھ سو پیدل سپاہی شامل تھے۔ جن کے لیے جنگی ساز و سامان اور خوراک کا وافر انتظام کیا گیا تھا۔

جب اس فوج کی روانگی کی خبر مدینے پہنچی تو مسلمانوں میں زبردست ہیجان پیدا ہو گیا۔ کیونکہ ان کو ایک ایسا معرکہ پیش آ گیا کہ جس کے سامنے اس سے پہلی جنگوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

تب رسول اکرمؐ نے اس بارے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ بعض اصحاب کا خیال تھا کہ مدینہ کی فصیل اور اس کے برجوں کو مستحکم کر کے شہر کے اندر رہا جائے اور جب دشمن کی فوج پہنچ جائے تو شہر کے دروازوں پر ہی اس کا مقابلہ کیا جائے لیکن ایک اور گروہ کا خیال تھا کہ یہ کمزور لوگوں کا کام ہے اس کی بجائے ہمیں چاہیے کہ آگے بڑھ کر دشمن کو روکیں۔

چنانچہ رسول اکرمؐ کو دوسرے گروہ کی تجویز پسند آئی اور جنگ کی

تیاری کا حکم دے دیا۔ جب آپ کا لشکر مدینے سے روانہ ہوا تو اس کی تعداد ایک ہزار سے کچھ اوپر تھی لیکن ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ اچانک عبداللہ بن ابی[1] اپنے ساتھیوں سمیت اسلامی فوج سے کٹ کر مدینہ واپس چلا گیا۔ اس کے لیے اس نے یہ بہانہ بنایا کہ رسول اکرمؐ نے میری یہ تجویز منظور نہیں کی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ تاہم رسول اکرمؐ بقیہ سات سو یا تین سو تیرہ مسلمانوں کو لے کر آگے بڑھتے رہے۔ حتیٰ کہ کوہِ احد کے دامن میں پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر آپ نے فوج کی صفیں اس طرح منظم کیں کہ کوہِ احد ان کی پشت پر، کوہِ عینین بائیں جانب اور مدینہ ان کے سامنے تھا۔

کوہِ عینین میں ایک درہ تھا کہ جس سے فائدہ اٹھانا دشمن کے لیے ممکن تھا اور وہ اسلامی فوج پر اچانک حملہ کر سکتا تھا۔ اس ممکنہ خطرے کا سدّباب کرنے کے لیے رسول اکرمؐ نے عبداللہ بن جبیر کو پچاس تجربہ کار تیراندازوں کے ساتھ درے پر مقرر فرما کر یہ ہدایت کی کہ مسلمانوں کو خواہ فتح ہو یا شکست، آپ لوگ اپنی جگہ نہ چھوڑیں اور درے کو خالی نہ کریں۔

بعد ازاں رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کے سامنے ایک خطبہ دیا جس کا خلاصہ یہ ہے:

---

[1] عبداللہ بن ابی کو رئیس المنافقین کہا جاتا ہے۔ رسول اکرمؐ کی مدینہ کو ہجرت سے پہلے اسے بادشاہ بنانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں، لیکن آنحضرتؐ کی آمد کے نتیجے میں اس کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اور مجبوراً اسے بھی اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا پڑا لیکن درحقیقت وہ اسلام اور رسول اکرمؐ کا دشمن تھا۔

اے لوگو! میں تم سے وہ بات کہتا ہوں جو خدائے تعالیٰ
نے مجھے بتائی ہے اور اس چیز کی وصیت کرتا ہوں جس
کی وصیت اس نے آسمانی کتاب میں خود مجھے کی ہے۔

چنانچہ اس نے مجھے تاکید کی ہے کہ میں اس کے احکام پر کاربند رہوں۔ جو کچھ اس نے حرام قرار دیا ہے اس سے دوری اختیار کروں اور ہمیشہ پرہیزگار اور پاک دامن رہوں۔

آج تم اس مقام پر کھڑے ہو جو خدا کی طرف سے بدلے اور اجر کا مقام ہے اور تمہارا کردار آنے والوں کے لیے ایک نمونہ ثابت ہوگا۔ بنابریں تمہیں چاہیے کہ اپنے آپ کو صبر، ہمت اور جان نثاری کے لیے تیار کرو۔

دشمنوں سے جنگ لڑنا اور ان کے ہاتھوں زخم کھانا ایک مشکل کام ہے۔ اس لیے جنگوں میں فتح اور کامیابی کا فخر حاصل کرنے کے لیے عظیم قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب تم جہاد کے میدان میں قدم رکھو۔ مردانہ وار آگے بڑھو اور خدا سے دعا کرو کہ وہ تمہیں شرف اور افتخار نصیب کرے۔ پس میں تمہاری کامیابی کا خواہاں ہوں اور تمہارے درمیان پھوٹ پڑ جانے سے ڈرتا ہوں۔

روح الامین نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ کوئی جاندار اس وقت تک نہیں مرتا، جب تک وہ اس دنیا میں اپنی پوری روزی حاصل نہ کرلے۔ کیونکہ جو روزی اس کے مقدر میں لکھی ہو، اس میں کمی نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے کچھ دیر سے ملے لیکن یہ محال ہے کہ وہ اس سے محروم ہو جائے۔ لہٰذا روزی طلب کرنے میں

حرص نہ کرو، اپنے آپ کو حرام میں آلودہ نہ کرو اور خدا کے گنہگار نہ بنو۔ کیونکہ جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھا ہے وہ تمہیں ملے گا۔ مگر تمہاری حرص۔ جلدبازی اور لاپرواہی کا نتیجہ سوائے گناہ اور آلودگی کے کچھ نہ نکلے گا۔

اے مسلمانو! بادشاہوں کے حرم ہوتے ہیں جو قوم کے لیے مورد احترام ہوتے ہیں۔ اسی طرح خدائے تعالیٰ کا حرم بھی اس کے محرمات میں سے ہے۔ اس نے قرآن مجید میں محرمات کو اپنی حدود کا نام دیا ہے اور وہ اس کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ کوئی اس کی حدود میں دخل اندازی کرے۔

اے مسلمانو! دوسرے مومنین سے ایک مومن کی نسبت وہی ہوتی ہے جو بدن کے ساتھ سر کی ہوتی ہے۔ پس اگر مومن تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو دوسروں کو چاہیے کہ وہ بھی اس کی تکلیف پر رنجیدہ و ملول ہوں۔

والسلام علیکم

ادھر قریش کی فوج نے بھی اپنی صفیں مرتب کیں۔ ان کا پرچم عبدالدار کے گھرانے کے ایک شخص کے ہاتھ میں تھا۔ خالد بن ولید میمنہ میں اور عکرمہ بن ابوجہل میسرہ میں تھا۔ عمرو بن العاص اور صفوان بن امیہ سواروں کے کمانڈر تھے اور تیراندازوں کی کمان عبداللہ بن ربیعہ کے ہاتھ میں تھی۔ بڑا بت "ہبل" کہ جسے قریش مکہ سے اپنے ساتھ لائے تھے، وہ فوجوں کے آگے رکھا گیا تھا۔

ابوسفیان کی بیوی ہند اور مکہ کی کچھ اور عورتیں جو سپاہیوں کو جوش دلانے کے لیے محاذ پر آئی تھیں، وہ فوج کے آخری حصے میں بیٹھی ہیجان انگیز گیت گا رہی تھیں۔

قریش کی فوج میں سے جو پہلا شخص میدان میں آیا، وہ ان کا

پرچمدار طلحہ بن ابی طلحہ تھا۔ اس نے اپنا مد مقابل طلب کیا تو امام علیؑ اس کے مقابلے پر گئے اور اس کا خاتمہ کر دیا۔ تب رسول اکرمؐ نے تکبیر کہی اور آپ کے ساتھ سارے مسلمانوں نے بھی نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

پھر بنی عبدالدار کا دوسرا، تیسرا اور چوتھا شخص یکے بعد دیگرے میدان میں آئے اور امام علیؑ کے ہاتھوں قتل ہوتے رہے۔ یہ دیکھ کر قریش مکہ کے دلوں پر بے حد خوف و ہراس چھا گیا، لیکن ٹھیک اسی وقت مسلمانوں نے شدید حملہ کیا اور دشمن کی صفیں الٹا کر رکھ دیں۔ پھر تو ان میں سے اکثر لوگ بھاگ نکلے اور کفار کے لشکر کا شیرازہ بکھر گیا جبکہ اسلام کے سپاہی پورے جوش و خروش سے لڑ رہے تھے اور اپنے دین کا کما حقہ دفاع کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے قریش کے بڑے بت "ہبل" کو بھی سر کے بل گرا دیا اور دشمن کی کمر توڑ دی۔ یوں رفتہ رفتہ میدان جنگ مکہ کے سپاہیوں سے خالی ہو گیا اور مسلمان مال غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے۔

ایک خطرناک غلطی

ادھر فوج کے جس دستے کو رسول اکرمؐ نے کوہ عینین کے درّے پر تعینات کیا تھا۔ اس کے سپاہی دور سے جنگ کا نقشہ دیکھ رہے تھے۔ جب انھوں نے اپنی فوج کو مال غنیمت جمع کرتے اور دشمن کا سامان سمیٹتے دیکھا تو نگاہوں کو خیرہ کر دینے والے مادی مسئلے نے انہیں اس بات پر اکسایا کہ وہ بھی مال غنیمت جمع کرنے میں شریک ہو جائیں۔ ان کے سالار عبداللہ بن جبیر نے انہیں اس کام سے باز رکھنے کی بڑی کوشش کی، لیکن اس کی فہمائش کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس درے کا دفاع کمزور ہو گیا

اور وہاں فقط اس دستے کا سردار اور صرف چند اشخاص ہی باقی رہ گئے۔ اس اثنا میں اہل مکہ کا ایک فوجی دستہ درے پر پہنچ گیا اور وہاں موجود چند مسلمانوں کو قتل کر کے اسلامی لشکر پر پشت سے حملہ کر دیا۔ تب کفر کا پرچم دوبارہ لہرانے لگا اور جو کافر بھاگ نکلے تھے، وہ لوٹ لوٹ کر اس پرچم تلے جمع ہو گئے اور انہوں نے مسلمانوں کی ٹوٹی ہوئی صفوں کا محاصرہ کر لیا۔

اتنے میں مشرکین میں سے ایک نے بآواز بلند کہا: "محمدؐ مارے گئے"۔ اس وحشتناک خبر اور غیر متوقع حملے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ میدان سے فرار ہو گئے۔ تب رسول اکرمؐ دشمنوں کے نرغے میں گھر گئے اور امام علیؑ ایک متحرک سپر کی مانند آنحضرتؐ کے گرد گھومتے ہوئے دشمنوں کو مار مار کر بھگا رہے تھے۔ اس دوران میں امام علیؑ کے بدن پر نوے زخم آئے اور بہت سا خون بہہ گیا لیکن وہ مغلوب نہ ہوئے اور برابر جہاد اور دفاع میں مصروف رہے۔ جب جبریلؑ نے امام علیؑ کی یہ جاں نثاری اور سرفروشی دیکھی تو یہ آواز بلند کی:

لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

"علیؑ کے علاوہ کوئی جوانمرد نہیں اور ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں"۔

دوستوں اور دشمنوں کی شہادت کے مطابق تاریخ اسلام نے احد کے دن امام علیؑ کو رسول اکرمؐ کا واحد یاور و مددگار قرار دیا اور ان کے ایمان، دلاوری اور ثابت قدمی کی بے حد تعریف کی ہے۔

اگرچہ محاصرے کا دائرہ تنگ ہو رہا تھا اور دشمن زیادہ جسارت کے ساتھ آنحضرتؐ کے نزدیک آ رہے تھے لیکن وہ امام علیؑ کی شجاعت

کے باعث رسول ص تک پہنچ نہ پائے۔ تب انھوں نے آنحضرت ص پر پتھر پھینکنے شروع کر دیے اور ایک پتھر آپ کی پیشانی پر آن لگا جس سے گہرا زخم آگیا اور اس میں سے خون بہنے لگا۔ دوسرا پتھر عتبہ بن ابی وقاص کے ہاتھوں حضور ص کے چہرہ اقدس پر لگا، جس سے آپ کے دو دندان مبارک شہید ہو گئے۔ اس کے علاوہ آپ کے دوش مقدس پر تلوار کا وار بھی کیا گیا لیکن آپ دوہری زرہ پہنے ہوئے تھے اس لیے یہ وار کارگر نہ ہوا۔ تاہم دشمنوں کے ہاتھوں یہ تمام تکالیف اٹھانے کے باوجود اس عظیم الشان پیغمبر ص نے اپنے لب بددعا کے لیے نہ کھولے، بلکہ خدائے تعالیٰ سے اس قوم کی ہدایت اور نجات کی دعا مانگی۔

احد کے دن جو ناگوار حادثات وقوع پذیر ہوئے ان میں سے ایک رسول اکرم ص کے بزرگوار چچا سید الشہداء حمزہ رض کی شہادت تھی۔ وہ دشمن پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے اور خدا کے دین اور رسول اکرم ص کا دفاع کر رہے تھے۔ اس وقت وحشی نامی ایک شخص نے ان پر ایک حربہ پھینکا، جس سے وہ زمین پر آ رہے اور ان کی شہادت واقع ہو گئی۔

تب وحشی نے ان کا پیٹ چاک کیا اور آپ کا جگر نکال کر ابوسفیان کی بیوی ہند کے پاس لے گیا۔ ہند نے حمزہ رض کا جگر منہ میں ڈالا اور اسے نگلنے کی کوشش کی۔ اگرچہ وہ اس کے حلق سے نیچے نہ اترا، تاہم وہ ہند جگر خوارہ کے نام سے مشہور ہو گئی اور لوگ معاویہ اور اس کے فرزندان کو ہند جگر خوارہ کی اولاد ہی کہتے تھے۔

اگرچہ جنگ احد میں قریش فائدے میں رہے اور ان کے سپاہی اپنی کامیابی پر مسکرا رہے تھے لیکن وہ جلد ہی میدان جنگ سے مکہ روانہ ہو گئے۔ تب رسول اکرم ص ایک پہاڑی سے ٹیک لگائے ہوئے اس کے

پہلو میں کھڑے تھے۔ ان کے ساتھی ہر طرف سے آ آ کر ارد گرد جمع ہو رہے تھے لیکن حمزہؓ کا کوئی پتا نشان نہ ملتا تھا۔ آنحضرتؐ نے پریشانی کے عالم میں امام علیؑ کو حمزہؓ کی خبر لانے کے لیے میدان میں بھیجا، لیکن وہ بھی بڑی دیر تک لوٹ کر نہ آئے۔

بالآخر رسول اکرم بنفس نفیس میدان میں تشریف لائے اور حمزہؓ کو اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگے۔ پھر ایک ہولناک اور دلخراش منظر آپ کی آنکھوں کے سامنے آیا اور آپ نے بے اختیار فرمایا: افسوس! حمزہؓ کو قتل کر دیا گیا ہے اور ان کا مثلہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آنحضرت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اہلبیتؑ کی روایات کے مطابق آپ کی ساری زندگی میں اتنا سخت اور ناگوار کوئی دن نہیں آیا۔

پیغمبر اسلامؐ نے اپنی عبائے مبارک اپنے کندھے سے اتاری اور اپنے عالی مرتبت چچا کے پاک اور مطہر جسم پر ڈال دی اور یوں اس دردناک منظر کو دوستوں اور عزیزوں کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ پھر آپ نے جناب حمزہؓ کی نماز جنازہ پڑھائی، اس میں ستر تکبیریں کہیں اور انہیں سید الشہداء کا لقب عطا فرمایا۔

اس کے بعد میدان کے مختلف حصوں سے دوسرے شہیدوں کی لاشیں جمع کی گئیں اور ان کی نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد انہیں دفن کر دیا گیا۔

ایک دولہا شہادت کی آغوش میں

احد کے شہیدوں کے پاک اجسام میں ایک ایسا جسم بھی نظر آ رہا تھا جو مسلمان مجاہدوں کی جانبازی اور سرفروشی کی زندہ مثال تھا۔ وہ حنظلہ

کی لاش تھی، جو چوبیس سال کی عمر کا جوان تھا اور عین وہ رات جس کی صبح کو جنگ احد وقوع پذیر ہوئی وہ اس کی شبِ زفاف تھی۔ رسول اکرمؐ نے اس نوجوان کو اجازت دی تھی کہ وہ زفاف کی خاطر مدینہ میں رہے اور پھر مجاہدین اسلام کے ساتھ آن ملے۔

حنظلہ کی دعوت ولیمہ میں کچھ ایسے مسلمان بھی موجود تھے جنہیں جنگ میں شریک ہونا تھا۔ چنانچہ وہاں شام کا کھانا کھانے کے بعد انہوں نے دولہا کو حجلۂ عروسی میں بھیج دیا اور خود چلے گئے۔

اگلی صبح کو منہ اندھیرے ہی نوبیاہتا دلہن نے اپنے دولہا حنظلہ کو زرہ پہنتے اور بدن پر جنگی ہتھیار سجاتے دیکھا۔ چونکہ یہ بات اس کے لیے عجیب اور ناقابلِ یقین تھی، اس لیے اس نے حیرت سے پوچھا: کیا رسول اکرمؐ نے تمہیں جنگ میں شریک ہونے سے معاف نہیں فرمایا؟

حنظلہ نے زیر لب کہا: کیوں؟

اس کی بیوی نے کہا: تم نے زرہ کیوں پہنی اور اپنی کمر سے تلوار کیوں باندھی ہے؟

اس نے جواب دیا: میں چاہتا ہوں کہ جا کر اسلامی سپاہ میں شامل ہو جاؤں۔

بیوی نے پوچھا: پھر تم مجھے کس کے سپرد کر کے جا رہے ہو؟

حنظلہ نے پختہ ایمان کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں جواب دیا: میں تمہیں خدا کے سپرد کیے جا رہا ہوں۔

دلہن نے حنظلہ کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے رونا دھونا شروع کر دیا لیکن یہ چیز اس کے ارادے کو متزلزل نہ کر سکی۔ مگر جب وہ

اپنے گھر سے قدم باہر رکھنے لگا تو اس کی بیوی نے کہا: ذرا دیر کے لیے رک جاؤ۔ پھر وہ بھاگی بھاگی باہر گئی اور چند ہمسایوں کو بلا لائی اور شوہر کو مخاطب کر کے کہنے لگی: ان لوگوں کے سامنے اقرار کرو کہ تم نے میرے ساتھ ہم بستری کی ہے!

حنظلہ نے جواب دیا: میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں لیکن یہ تو بتاؤ کہ یہ اقرار کرانے سے تمہارا کیا مقصد ہے؟

دلہن نے اس عالم میں کہ روتے ہوئے اس کا گلا رُندھا ہوا تھا اپنا منہ حاضرین کی جانب پھیرا اور کہا: میں نے رات کو خواب دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھل گئے، حنظلہ ان کے راستے اوپر پرواز کر گیا اور میری نظر سے غائب ہو گیا۔ لہٰذا میں جانتی ہوں کہ میرا شوہر اس جنگ سے واپس نہیں آئے گا۔ پس تم لوگ گواہ رہو کہ اگر میں کسی بچے کو جنم دوں تو وہ بچہ میرے شوہر حنظلہ کا ہو گا۔

فطرت کا تقاضا تھا کہ حنظلہ کی راہ میں آنے والی یہ رکاوٹیں اس کے ارادے کو متزلزل کر دیں لیکن خدا پر ایمان اور جانبازی کا شوق کہ جو اس کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا، وہ ایک پرکشش قوت کی مانند اسے میدان جنگ کی جانب کھینچ رہا تھا۔ آخر کار اس نے اپنی پیاری بیوی کو خدا حافظ کہا اور دنیا کے عیش و آرام کو ٹھوکر مار کر محاذ جنگ پہ پہنچ گیا۔

حنظلہ میدان احد میں دشمنوں پہ مردانہ وار حملے کرتا ہوا خدا کے دین کی نصرت کر رہا تھا کہ اچانک ایک قریشی سپاہی نے اپنا نیزہ اس کے پیٹ میں مار لیکن بجائے اس کے کہ حنظلہ پیچھے ہٹتا اور نیزے کے گھاؤ سے محفوظ رہتا، وہ آگے بڑھا اور نیزے کی انی اس کی پشت سے پار ہو گئی۔

مگر اس عالم میں بھی جب وہ آخری سانس لے رہا تھا اُس نے اپنی تلوار سے اس قریشی سپاہی کا سر تن سے جدا کر دیا۔

یوں حنظلہ شہادت کے مرتبے پر پہنچا اور وہ خواب جو اس کی بیوی نے دیکھا تھا' اس کی تعبیر ظاہر ہو گئی۔ جیسا کہ مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ یہ جوان غسلِ جنابت نہیں کر سکا تھا۔ اس لیے آسمانی فرشتوں نے اسے غسل دیا اور اس کا نام غسیل الملائکہ قرار پایا۔

وہ درخشاں ستارے جو احد میں غروب ہو گئے' یہ شہید بھی ان میں سے تھا لیکن اس کا نور ابدی اور اس کا نام تاریخ اسلام میں انمٹ ہو گیا۔

جنگِ خندق

قریش نے طے کر رکھا تھا کہ وہ توحید کے درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے یعنی مکہ کے بت پرست اس بات پر آمادہ تھے کہ وہ ہر قیمت پر محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کا نام و نشان مٹا کر دم لیں گے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے کئی ایک اقدامات کیے تھے۔ تاہم اپنے سابقہ اقدامات یعنی جنگ بدر اور جنگ احد میں وہ اپنا مقصد حاصل نہ کر سکے۔ اگرچہ قریش مکہ جنگ احد سے خوش خوش لوٹے لیکن اس کے باوجود ان کے دل کی گرہ نہ کھل سکی۔ کیونکہ ابھی تک اسلام کا مرکز اپنی جگہ قائم تھا اور محمدؐ اور ان کے ساتھی اپنی تحریک کو بدستور آگے بڑھا رہے تھے۔

اس دوران میں مدینہ کے چند یہودی کہ جن میں حیّ بن اخطب بھی شامل تھا، مکہ آئے اور قریش سے مل کر ان سے مذاکرات کیے۔

یہودیوں نے کہا: اسلام کو نابود کرنے کے لیے ایک بھرپور

اقدام کی ضرورت ہے جس کے لیے ہمیں مختلف عرب قبائل کی مدد حاصل کرنی چاہیے۔ نیز ہم خود بھی اپنی تمامتر قوت اس مقصد کے لیے صرف کرنے کو تیار رہیں۔

ابوسفیان اور قریش کے دوسرے سرداروں نے یہودیوں کی اس پیشکش کا خیر مقدم کیا اور ان کی اس تجویز پر عمل کرنے پر رضا مند ہو گئے۔ اس کے بعد وہ قبیلہ غطفان کے پاس گئے۔ ان کے ساتھ اس بارے میں گفت و شنید کی اور انہیں بھی اپنا ہمنوا بنا لیا۔

ان لوگوں کی باہمی سازباز کے بعد چند دن تیاری میں لگ گئے اور پھر ابوسفیان کی سربراہی میں دس ہزار سے زائد افراد پر مشتمل ایک عظیم فوج مکہ سے چل پڑی۔ راستے میں بعض دوسرے عرب قبائل بھی ان کے ساتھ مل گئے اور وہ سب کے سب ایک تباہ کن سیلاب کی طرح آگے بڑھتے گئے۔

جب رسول اکرمؐ کو مکہ سے اس لشکر کے روانہ ہونے کی اطلاع ملی تو آپ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ سلمان فارسیؓ نے کہا: ہمارے ملک کا دستور ہے کہ جب ایک بڑی فوج ہم پہ حملہ کرے تو ہم شہر کے گرد ایک خندق کھود لیتے ہیں۔ تاکہ دشمن ہم پر کسی طرف سے بھی حملہ نہ کر سکے۔ رسول اکرمؐ نے یہ تجویز پسند فرمائی اور مسلمان آنحضرتؐ کی سرکردگی میں خندق کھودنے لگے۔

چنانچہ جب قریش کی فوج مدینہ کی حدود میں پہنچی تو مسلمان خندق کھودنے کے کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ اس طرح انھوں نے دشمن کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ کھڑی کر دی تھی۔ اہل مکہ اس خندق

کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے، کیونکہ عربوں کے لیے یہ ایک نئی چیز تھی۔ تاہم انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ خندق ایک مسلمان یعنی سلمان فارسی رضؓ کے مشورے پر کھودی گئی ہے۔

قریش کے جنگجوؤں کا خیال تھا کہ وہ اپنی سواریوں پر سے اترے بغیر ہی مدینہ کے مسلمانوں کا کام تمام کر کے واپس لوٹ جائیں گے لیکن وہ اس صورت حال کے پیش نظر مجبور ہو گئے کہ خیمے گاڑیں اور مدینہ کا محاصرہ کر لیں۔

اسی اثناء میں حیّ بن اخطب نے پھر سے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ چنانچہ وہ یہود بنی قریظہ کے سردار کعب بن اسد سے ملنے کے لیے ان کے قلعے میں گیا لیکن کعب نے اس کا استقبال کرنے اور اس کے ساتھ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ تاہم حی بن اخطب اپنی بات پہ اڑا رہا اور حیلے حوالے سے کام لے کر کعب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ چند لحظوں کے لیے اس سے ضرور ملے۔ جب ان کی ملاقات ہوئی تو حی بن اخطب نے کہا: میں تمہارے لیے دنیا کی عزت لایا ہوں۔

کعب نے کہا: خدا کی قسم تم دنیا کی ذلت اور خواری لائے ہو۔

حیّ نے کہا: اب قریش اور غطفان کے طاقتور قبائل پختہ ارادہ کر کے آئے ہیں کہ جب تک محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کا خاتمہ نہ کر دیں واپس نہ جائیں گے۔ اب موقع ہے کہ تم بھی ہمارے ہمنوا بن جاؤ اور ہماری مدد کرو۔

کعب نے کہا: ہم نے محمدؐ سے وفا اور نیکی کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا۔ پس تم ہمیں ہمارے حال پہ چھوڑ دو اور یہاں سے چلے جاؤ۔

لیکن حیّ بن اخطب نے اس سے ایسی مکارانہ باتیں کیں کہ وہ اس کی بات مان گیا اور رسول اکرمؐ کے ساتھ کیے ہوئے معاہدۂ امن کی دستاویز پھاڑ ڈالی۔

ایسے نازک موقع پر یہود بنی قریظہ کی پیمان شکنی کی خبر نے مدینہ کے حالات کو اور بھی سنگین بنا دیا اور مسلمان بے حد پریشان ہو گئے۔ یہ صورتِ حال دونوں پہلوؤں سے خطرناک تھی۔ اول یہ کہ دشمنوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ دوم یہ کہ مسلمانوں نے خندق کھودنے میں جو تکالیف اٹھائیں وہ ضائع ہو رہی تھیں۔ کیونکہ دشمن بنی قریظہ کے کھیتوں اور قلعوں کے راستے بڑی آسانی سے مدینہ میں داخل ہو سکتا تھا۔

قریش پر پہلی ضرب

ادھر محاصرے کی مدت لمبی سے لمبی ہوتی گئی اور مکہ کے سپاہی تھکن محسوس کرنے لگے۔ چونکہ ابھی تک اس فوج کشی کا نتیجہ برآمد نہ ہوا تھا، اس لیے وہ افسردہ خاطر ہو گئے۔ پھر ایک دن عرب کے شہ سوار عمرو بن عبدوَد نے منبہ بن عثمان اور نوفل بن عبداللہ کو ساتھ لیا اور وہ تینوں سوار ایک ایسے مقام سے خندق پار کر آئے جہاں اس کی چوڑائی کم تھی۔ عمرو بن عبدوَد کی شجاعت اور دلاوری کی پورے عرب میں دھوم تھی۔ مسلمانوں کے نزدیک پہنچ کر اس نے باآوازِ بلند کہا: کوئی ہے جو میدان میں آئے اور میرے ساتھ زور آزمائی کرے؟

یہ سن کر مسلمانوں کے دل دھک سے رہ گئے اور سبھی سر نہوڑائے بیٹھے رہے۔

عمر بن خطاب جو شاید اوروں سے کچھ زیادہ ہی سہم گئے تھے، وہ اپنے اور دوسروں کے خوف کے لیے بہانہ تراشی کرنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے عمرو کی شجاعت کی کئی ایک ایسی داستانیں سنائیں کہ جن کو سن کر لوگ اور بھی ڈر گئے۔

تاہم رسول اکرمؐ نے عمر کی ان بے محل باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "تم میں سے کون ہے جو اس بت پرست سے لڑنے کو تیار ہو؟"

اس وقت جب کہ لوگوں پر موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور کوئی آواز نہیں آرہی تھی، فقط امام علیؑ نے آنحضرتؐ کے سوال کا مثبت جواب دیا اور کہا: "یا رسول اللہ! میں اس کے مقابلے پر میدان میں جانے کو تیار ہوں"۔

ابھی رسول اکرمؐ نے آپ کو میدان میں جانے کی اجازت نہیں دی تھی کہ میدان سے عمرو بن عبدوَد کی آواز دوبارہ سنائی دی وہ کہہ رہا تھا: افسوس! میں نے اتنی دفعہ مبارزطلبی کی ہے کہ میرا گلا بیٹھ گیا ہے۔ کوئی جواب کیوں نہیں دیتا؟ اے محمدؐ کی پیروی کرنے والو! کیا تمہارا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ اگر تم مارے جاؤ گے تو بہشت میں جاؤ گے اور اگر کوئی تمہارے ہاتھوں مارا گیا تو وہ دوزخ میں جائے گا؟ کیا تم میں سے کسی کو بھی بہشت میں جانے کی خواہش نہیں ہے؟

تب امام علیؑ اٹھے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے علاوہ کوئی اس کا مدمقابل نہیں ہے۔

اب رسول اکرمؐ نے رضامندی ظاہر فرمائی اور آپ نے اپنا

عمامہ امام علیؑ کے سر پہ باندھا۔ اپنی زرہ پہنائی اور انہیں میدان میں بھیج دیا۔ ان کے جانے کے بعد آنحضرتؐ نے خدائے تعالیٰ سے ان کی فتح کے لیے دعا مانگی۔

امام علیؑ مضبوطی سے قدم جماتے ہوئے میدان میں اترے۔ عمرو بن عبدوَد کے مقابل آئے اور اس کی ڈینگوں کا جواب ان الفاظ میں دیا:

خاموش رہ کہ تجھے جواب دینے والا کسی کمزوری کا اظہار کیے بغیر تیرے سامنے آپہنچا ہے۔

تجھے جواب دینے والا ایک باایمان اور صاحبِ بصیرت فرد ہے جو اپنا اجر خداوند کریم سے طلب کرتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ میں تجھے ایک ایسی ضرب لگاؤں گا کہ جس کو رہتی دنیا تک یاد کیا جائے گا۔ جلد ہی رونے والیوں کو تیری لاش پر بٹھا دوں گا۔

رسول اکرمؐ جو دور سے امام علیؑ اور عمرو کو ایک دوسرے کا سامنا کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے، انھوں نے اپنے صحابہ سے یوں فرمایا:

"آج کُل کا کُل ایمان پورے کے پورے شرک کا مقابلہ کر رہا ہے۔"

عمرو کو اس بات کا یقین نہیں آرہا تھا کہ اس سن و سال کا کوئی نوجوان اس کے مقابلے پر آنے کی جرأت کرسکتا ہے۔ لہٰذا اس نے حیرت سے پوچھا: اے سرفروش جوان! تو کون ہے؟

آپ نے فرمایا: میں علیؑ بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم ہوں۔

علیؑ کا نام سنتے ہی عمرو کے دل میں جنگ بدر میں آپ کی بے نظیر

شجاعت تازہ ہو گئی۔ چنانچہ اس نے آپ سے دوستانہ انداز میں بات شروع کی کہ شاید وہ امام علیؑ کے ہاتھوں موت کا لقمہ بننے سے بچ جائے۔ تب اس نے بے تکلفی سے کہا:

اے بھتیجے! یہ تو واقعی بڑے افسوس کی بات ہو گی کہ تم جیسا جوان میرے ہاتھوں کہ جو فارس یلیل کہلاتا ہوں، اپنی جان گنوا بیٹھے۔ میں تمہارے والد ابو طالب کے ساتھ اپنے دوستانہ تعلقات کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ بہتر ہو گا کہ تم ابھی سے لوٹ جاؤ۔ تاکہ کوئی دوسرا میرے مقابلے پہ آئے۔

امام علیؑ نے مسکرا کر جواب دیا:

لیکن مجھے اس بات کا کوئی رنج نہیں کہ فارس یلیل میرے ہاتھوں مارا جائے اور میری تلوار سے اس کا کام تمام ہو۔ اب تم ان باتوں کو چھوڑو اور اصل مقصد کی طرف آؤ۔ جیسا کہ میں نے سن رکھا ہے کہ تم نے خانہ کعبہ کا پردہ تھام کر اپنے خدا سے ایک اقرار کیا تھا۔ وہ یہ کہ جب میدان جنگ میں تیرا کوئی حریف تین چیزوں کی خواہش کرے گا تو تُو اس کی تینوں یا کم از کم ایک خواہش ضرور پوری کرے گا۔

عمرو نے جواب دیا: ہاں! ایسا ہی ہوا تھا۔

امام علیؑ نے فرمایا: میں تم سے تین چیزوں کا مطالبہ کرتا ہوں اور اپنے پیمان کے مطابق تم پہ لازم ہے کہ ان میں سے کم از کم ایک مطالبہ ضرور پورا کرو۔

عمرو نے کہا: تمہاری تین باتیں کون کون سی ہیں؟

امام علیؑ نے کہا: اول یہ کہ تم شرک اور بت پرستی ترک کر دو اور توحید

کا راستا اختیار کرو۔ خدائے وحدہٗ لاشریک کی پرستش کرو۔ حضرت محمدؐ کو سچا پیغمبر مانو اور مسلمانوں کے معاشرے میں عزت و آبرو سے رہو۔

عمرو نے کہا: تمہاری اس خواہش کا پورا کرنا میرے لیے ناممکن ہے، اب تم اپنی دوسری خواہش بتاؤ۔

امام علیؑ نے فرمایا: دوم یہ کہ تم ہمارے خلاف جنگ کرنے سے باز رہو اور جس راستے سے آئے ہو اسی راستے سے واپس چلے جاؤ۔ تم ہمیں اور ان خونخوار عربوں کو آپس میں نمٹ لینے دو۔ اگر محمدؐ حق پر نہیں ہیں تو عرب ان کا قصہ پاک کر دیں گے اور تمہاری آنحضرتؐ کے خلاف جنگ لڑنے کی ذمہ داری بھی ختم ہو جائے گی۔

عمرو نے کہا: یہ تجویز اگرچہ عاقلانہ اور قابل قبول ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ اس موقع پر میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جب ہم مکہ سے روانہ ہوتے تو عورتیں اور مرد میری طرف اشارہ کر کے ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ یہ ہے "فارس یلیل" جو محمدؐ کے خلاف جنگ کرنے جا رہا ہے۔ لہٰذا اگر میں واپس چلا جاؤں تو مجھے بچہ بچہ لعنت ملامت کرے گا۔ اب تم اپنی تیسری خواہش بیان کرو۔

امام علیؑ نے فرمایا: میری تیسری خواہش یہ ہے کہ تم اپنی سواری پر سے اتر کر پیادہ ہو جاؤ۔ کیونکہ میں بھی پیادہ ہوں۔

اس پر عمرو نے چھلانگ لگائی اور گھوڑے پر سے اتر آیا۔ چونکہ اسے امام علیؑ کی دلیری اور صاف بیانی پر غصہ آ گیا تھا۔ اس لیے وہ آگے بڑھا اور آپ کے سر پر تلوار کا وار کر دیا۔ اس کا یہ وار اتنا شدید تھا کہ اس سے آپ کی سپر کٹ گئی۔ آپ کے سر پر بھی خاصا زخم آ گیا۔

امام علیؑ نے اسی وقت بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے سر کا زخم باندھ دیا اور اس سے پیشتر کہ عمرو دوبارہ حملہ کرتا آپ نے تلوار کی ایک ہی ضرب سے اس کے دونوں پاؤں کاٹ دیے۔

اس کے ساتھ ہی عمرو کا بھاری بھرکم جسم ڈولتا ہوا دھم سے زمین پر آ رہا اور میدان میں اتنا گہرا گرد و غبار اڑنے لگا کہ دونوں جنگ آزماؤں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تاہم لوگوں کا خیال تھا کہ جیت عمرو کی ہوئی ہے اور امام علیؑ مارے گئے ہیں۔

دونوں فوجوں پر عجیب خاموشی چھائی ہوئی تھی اور وہ بھی اس جنگ کے نتیجے کے منتظر تھے۔ کچھ وقت اسی طرح گزر گیا اور پھر اچانک 'اللہ اکبر' کا نعرہ دشت و بیابان میں گونج اٹھا' جو امام علیؑ نے لگایا تھا۔

پھر ہلکی ہلکی ہوا چلی کہ جس سے گرد و غبار چھٹ گیا اور میدان کا نقشہ سامنے آ گیا۔ امام علیؑ اس حال میں کہ عمرو کا کٹا ہوا سر ان کے ہاتھ میں تھا اور خون کے قطرے ان کی تلوار سے ٹپک رہے تھے، فتحمند اور کامران ہو کر رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

تب آنحضرتؐ نے فرمایا: خندق کے دن علیؑ کی لگائی ہوئی ضرب جنوں اور انسانوں کی قیامت تک کی عبادت سے بہتر ہے۔

تاہم یہ قول مبالغہ آمیز بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر علیؑ اس دن سرفروشی کا مظاہرہ نہ کرتے تو عمرو بن عبدوَد اور قبائل عرب کے ہاتھوں اسلام کی بنیاد ڈھے جاتی اور خدا پرستی کا نام و نشان تک باقی نہ رہتا۔

ایک جنگی چال

عمرو کے مارے جانے سے قریش کے لشکر کی کمر ٹوٹ گئی۔ منبہ بن عثمان اور نوفل بن عبداللہ جو عمرو کے ساتھ خندق پھلانگ کر آئے تھے، وہ اس کی خون آلود لاش دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ نوفل بھاگتے ہوئے خندق میں جا گرا اور مسلمانوں نے اس پہ پتھر برسانے شروع کر دیے۔ آخرکار وہ بھی علیؑ کے ہاتھوں مارا گیا۔

تاہم دشمن ابھی تک مدینہ کا محاصرہ کیے ہوتے تھے اور مسلمان بڑے مشکل حالات سے گزر رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک رات قبیلہ بنی غطفان کا ایک شخص جس کا نام نعیم بن مسعود تھا، وہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے یوں عرض کیا:

یا رسول اللہؐ! میں نے اسلام قبول کر لیا ہے لیکن ابھی تک کسی کو علم نہیں ہے۔ اب میں آپ کا فرمانبردار ہوں اور آپ جو حکم بھی دیں اس کی تعمیل کروں گا۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: تم واپس جاؤ اور خفیہ طور پر اسلام کی یہ خدمت کرو کہ جس طرح بھی ہو سکے ہمارے ان دشمنوں میں پھوٹ ڈال دو۔

تب نعیم آنحضرتؐ سے رخصت ہو کر سیدھے بنی قریظہ کے قلعے کے دروازے پر پہنچے اور اس کی زنجیر ہلائی۔ کچھ دیر کے بعد وہ قلعے میں جا کر بنی قریظہ کے سردار کعب بن اسد سے بات چیت میں مشغول ہو گئے۔ دوران گفتگو انہوں نے کعب سے کہا:

تمہیں میری اور اپنی باہمی دیرینہ دوستی کا علم ہے۔ لہٰذا میں اس نازک وقت میں جب کہ تم ایک بہت بڑے خطرے سے دوچار ہو' میں نے اپنا فرض سمجھا کہ تمہیں کچھ باتوں سے آگاہ کروں۔

قریش اور غطفان کی جن فوجوں نے مدینے کا محاصرہ کر رکھا ہے اور تم بھی ان کے ساتھ مل گئے ہو ــــ ان میں سے کوئی بھی اس علاقے کا رہنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا خواہ وہ فتح پائیں یا شکست کھائیں' انھیں اپنے وطن کو لوٹ جانا ہے۔ مگر تم لوگ تو محمدؐ کے ہمسائے اور اس سرزمین کے رہنے والے ہو۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر قریش شکست کھا کر واپس چلے گئے تو تمہاری حیثیت کیا ہو گی اور تم محمدؐ کے ساتھ کس قسم کے تعلقات قائم کرو گے؟ تم کس بھروسے پر قریش کے ساتھ شامل ہوئے ہو؟ کیا قریش نے تمہیں اس بات کی ضمانت دی ہے کہ وہ تمہیں دشمنوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑیں گے؟

میرا خیال ہے کہ پیش بندی کے طور پر تمہیں قریش اور غطفان کے کچھ سرکردہ اشخاص اور رؤسا کو بطور یرغمال اپنے قلعے میں رکھنا چاہیے۔ تاکہ ناخوشگوار حالات کی صورت میں وہ لوگ تمہاری مدد کرنے پر مجبور رہوں۔

نعیم نے یہ باتیں بڑے جوش اور انتہائی خلوص کے ساتھ کہی تھیں' اس لیے یہودیوں پر ان کا بے حد اثر ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ گہری نیند سے جاگ اٹھے ہیں۔ انھوں نے نعیم کے مشورے کا شکریہ ادا کیا اور طے کیا کہ وہ اس کے مطابق عمل کریں گے۔

اس کے بعد نعیم قریش کی لشکر گاہ میں گئے اور مکہ کے سربرآوردہ

اشخاص اور سرداروں سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں انھوں نے ابوسفیان اور فوج کے دوسرے سرداروں سے یوں خطاب کیا:

حضرات! میں آپ کے دوستوں میں سے ہوں اور مجھے ایک بڑی اہم اور خفیہ خبر ملی ہے۔ اس لیے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ وہ فوراً آپ تک پہنچاؤں۔ ظاہر ہے کہ آپ بھی اس اہم راز کو پوشیدہ رکھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔

میں نے سنا ہے کہ قبیلہ بنی قریظہ کے یہودی اپنا پیمان توڑنے پر پشیمان ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اپنی غلطی کی تلافی کے لیے انہوں نے محمدؐ سے رابطہ کیا اور کہا:

ہم اپنے کیے پر شرمندہ ہیں اور اس کے بدلے میں اس بات پر تیار ہیں کہ قریش کے چند سرکردہ اشخاص کو بطورِ یرغمال آپ کے سپرد کر دیں اور پھر آپ کے ساتھ مل کر قریش سے جنگ کریں۔ چنانچہ محمدؐ نے بھی ان کی یہ پیشکش قبول کر لی ہے اور اب یہودی اپنے اس فیصلے پر عمل کرنے کا پختہ ارادہ کیے ہوئے ہیں۔ پس اب تمہارے لیے ضروری ہے کہ اگر یہودی تم سے یرغمال مانگیں تو تم ان کی بات سننے سے انکار کر دو۔

اس کے بعد نعیم بن مسعود نے قریشی سرداروں سے اجازت چاہی اور قبیلۂ غطفان کے سرداروں کے پاس گئے۔ وہاں بھی انھوں نے اپنی دوستی۔ وفاداری اور رشتہ داری کا ذکر کرنے کے بعد ان سے

ویسی ہی باتیں کہیں جیسی قریش سے کی تھیں اور پھر انھیں یہودیوں کی غداری سے خوف دلایا۔

دوسرے دن کہ جو شنبہ کا دن تھا، قریش کا ایک وفد عکرمہ بن ابوجہل کی سرکردگی میں یہودیوں کے پاس پہنچا اور انہیں یہ پیغام پہنچایا:

اس بیابان میں ہمارا قیام بہت لمبا ہو گیا ہے اور ہمارے حیوان ہلاک ہو گئے ہیں۔ اب ہم یہاں زیادہ دنوں تک نہیں ٹھہر سکتے، لہٰذا اس معاملے کو انجام تک پہنچانے کے لیے آپ لوگوں کو تیار ہو جانا چاہیے۔

یہودیوں نے جواب دیا: آج شنبہ ہے اور اس دن میں ہم کوئی کام شروع نہیں کرتے۔ دیگر یہ کہ ہم اس وقت تک جنگ میں شریک نہیں ہوں گے، جب تک تم لوگ اپنے کچھ مقتدر اشخاص کو بطور یرغمال ہمارے سپرد نہیں کرو گے۔

یہودیوں کی ان باتوں سے قریش پر نعیم بن مسعود کی دی ہوئی اطلاع کی سچائی واضح ہو گئی اور انھوں نے جواب میں کہا: ہم اپنا ایک آدمی بھی تمہیں نہیں دیں گے۔ قریش کے اس انکار سے یہودی بھی نعیم کی پیش بینی کے قائل ہو گئے اور اسے آفرین کہی۔ یوں اسلام کے مخالف دو گروہوں میں پھوٹ پڑ گئی اور دشمن کی قوت بہت حد تک گھٹ گئی۔ وہ دن گزر گیا لیکن جنگ نہ ہوئی اور پھر رات ہو گئی۔ رات آتے ہی ٹھنڈ ہو گئی اور ہوا بھی چلنے لگی۔ رفتہ رفتہ ٹھنڈ اتنی زیادہ ہو گئی کہ قریش کو اپنے خیموں میں آگ جلانی پڑی۔ پھر ہوا اور بھی زور سے چلنے لگی۔ حتیٰ کہ طنابیں ٹوٹ گئیں، خیمے اکھڑ گئے، ہر طرف آگ پھیل گئی اور قریش کے لیے زندگی عذاب بن کر رہ گئی۔

اس رات رسول اکرمؐ بارگاہ خداوندی میں مسلسل راز و نیاز فرماتے رہے اور قریش کا شر دور ہونے کی دعائیں مانگتے رہے۔ حذیفہ بن یمان کہتے ہیں: میں اس رات رسول اکرمؐ کے حکم سے معلومات حاصل کرنے کے لیے قریش کی فوج میں گیا اور ابوسفیان کے خیمے میں پہنچا۔ وہاں بڑی عجیب حالت تھی، وہ سبھی مارے سردی کے کانپ رہے تھے اور خیمے اکھڑے پڑے تھے۔ ابوسفیان نے اپنے ساتھیوں سے کہا: تم دیکھ رہے ہو کہ ہمارے جانور ہلاک ہو گئے، بنی قریظہ ہمیں چھوڑ گئے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یہاں رکے رہنا قرین مصلحت نہیں ہے، لہٰذا میں واپس مکہ جا رہا ہوں۔

یہ کہہ کر ابوسفیان اپنے اونٹ پر سوار ہوا اور وہاں سے چل دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسروں نے بھی اسی رات کوچ کیا اور مدینہ شہر کو اس فوجی محاصرے سے نجات مل گئی، جس نے مسلمانوں کو زچ کر رکھا تھا۔ چنانچہ اگلی صبح قریش کی اس طاقتور فوج کا کوئی سپاہی مدینہ کے نواح میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مسلمان ہنسی خوشی ادھر اُدھر آجا رہے تھے اور مدینہ میں زندگی معمول پر آگئی تھی۔

بنی قریظہ

پیغمبر اسلامؐ غیر مسلم قوموں کے ساتھ عموماً امن اور سکون کے ساتھ مل جل کر رہنے کا رویہ اختیار فرماتے تھے۔ بالخصوص اگر ان کے ساتھ کوئی پیمان باندھتے تو اپنا ہر وعدہ پورا کرتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ آپ نے ایک بار بھی عہد شکنی نہیں کی۔ آپ ایسا کس طرح کر سکتے تھے جبکہ ایفائے وعدہ اور عہد کی پابندی اسلام کا ایک اہم ترین اور بنیادی اصول ہے۔

اسلام ایفائے وعدہ کو ایک مسلمان اور مومن شخص کی ضروری صفات میں سے قرار دیتا ہے۔ پھر رسول اکرمؐ تو قرآنی احکام پر عمل کرنے میں تمام مسلمانوں سے بڑھ کر ذمہ دار اور سنجیدہ تھے۔ تاہم قبیلہ بنی قریظہ کے یہودیوں کے بارے میں یہ معاملہ ایک نئی صورت اختیار کر گیا تھا۔ جیسا کہ بیشتر بیان ہوا، انھوں نے رسول اکرمؐ سے کیا ہوا وعدہ عین اس وقت توڑ ڈالا،

جب ایک بہت بڑی فوج نے مدینے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ یعنی اس وقت جبکہ اسلام اور مسلمان نازک ترین دور میں سے گزر رہے تھے اور ان کا مستقبل بے حد تاریک نظر آتا تھا۔

یہ درست ہے کہ قریش کا خطرہ باقی نہیں رہا تھا اور ان کی فوج ذلت اٹھا کر مدینے سے واپس جا چکی تھی لیکن اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ وہ اسلام کے دوسرے دشمنوں کو اپنے ساتھ ملا کر دوبارہ مدینے کا محاصرہ نہیں کریں گے۔ نیز اس بارے میں کیونکر اطمینان ہو سکتا تھا کہ بنی قریظہ بھی اسلام کے دشمنوں سے دوبارہ تعاون نہیں کریں گے۔

ان نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ بدعہد یہودی مدینہ کے پہلو میں سرطانی غدود کی حیثیت رکھتے تھے۔ لہٰذا ان سے ہر لحظہ خطرہ لاحق تھا اور اس بات کا قوی احتمال تھا کہ وہ کسی بھی وقت اسلام کے دشمنوں سے مل کر مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے۔ پس یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس فاسد عضو کو کاٹ دیا جائے اور اس سرطان کی جڑ کو ہمیشہ کے لیے خشک کر دیا جائے۔

جس دن قریش کی فوج محاصرہ اٹھا کر مدینہ سے واپس گئی تھی۔ اسی دن سہ پہر کے وقت رسول اکرمؐ کے حکم سے اسلامی سپاہ بنی قریظہ کے قلعے کے پاس پہنچ گئی اور وہاں جا کر عصر کی نماز ادا کی۔

چنانچہ بنی قریظہ کا محاصرہ کر لیا گیا اور بہت سے مؤرخین کا کہنا ہے کہ یہ محاصرہ پندرہ سے پچیس دن تک جاری رہا۔ چونکہ قلعے کے دروازے بند تھے اس لیے لڑائی محض تیر چلانے اور پتھر پھینکنے کی صورت میں ہوتی رہی۔

رفتہ رفتہ بنی قریظہ اس محاصرے سے تنگ آگئے اور انھوں نے مذاکرات کی پیشکش کردی۔ چنانچہ باہمی گفتگو میں یہ طے ہوا کہ یہودی اپنا ایک ثالث چن لیں اور رسول اکرمؐ بھی اپنی طرف سے ایک ثالث مقرر فرمادیں۔ پھر وہ دونوں ثالث ___ یہودیوں اور مسلمانوں کے بارے میں جو بھی فیصلہ دیں، وہ طرفین کو قبول کرنا ہوگا۔

یہودیوں نے باہمی صلاح مشورے کے بعد سعد بن معاذؓ کو جن سے ان کے دیرینہ مراسم تھے، ان کو اپنی جانب سے ثالث مقرر کیا۔ ادھر رسول اکرمؐ بھی سعد بن معاذؓ کی ثالثی پر راضی ہوگئے اور وہ دونوں فریقوں کے متفقہ ثالث مقرر ہوگئے۔

اگرچہ یہودیوں کے ساتھ سعدؓ کے دوستانہ مراسم تھے۔ تاہم وہ ایک مخلص اور پابند شریعت مسلمان تھے اور انہیں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ میں گہری دلچسپی تھی۔ لہٰذا ضروری تھا کہ وہ طرفین کے نظریات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ایک ایسا عاقلانہ فیصلہ دیں جس سے آنے والے خطرات کا سدباب ہوسکے۔

چنانچہ سعدؓ ثالثی کے لیے مخصوص جگہ پر کھڑے ہوگئے جبکہ سیکڑوں مسلمانوں اور یہودیوں کی نگاہیں ان کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں کیونکہ ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ ایک ایسے قطعی فیصلے کی حیثیت رکھتے تھے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی۔

پھر انھوں نے تھوڑی دیر کے لیے تمام حالات و واقعات پر نگاہ ڈالی اور ان پر خوب غور کیا۔ تب انھیں یہودیوں کا قضیہ چکانے اور ان سے لاحق خطرے کو دور کرنے کے دو راستے نظر آئے۔ اوّل یہ کہ

یہودی اسلام قبول کرلیں اور دوسرے مسلمانوں کی طرح وہ بھی اسلامی مراعات اور تحفظات سے بہرہ مند ہوں۔ یعنی ان کی جان مال اور ناموس اسلام کی پناہ میں آجائیں اور اسلامی حکومت ان کے مفادات کی نگہبان بن جائے۔ دوم یہ کہ اگر وہ یہ راستا اختیار نہ کریں تو پھر ان کی طرف سے متوقع خطرے کے سدّباب کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہ تھا کہ ان کا قلع قمع کردیا جائے۔

چنانچہ سعدؓ نے اتنی بلند آواز میں کہ جسے دونوں فریق سن رہے تھے، اپنے فیصلے کا اعلان ان الفاظ میں کیا:

> میرا فیصلہ یہ ہے کہ اگر یہود بنی قریظہ مسلمان ہوجائیں تو وہ اسلام کی پناہ میں محفوظ رہیں گے اور اگر وہ ضد اور سرکشی کا راستا ترک نہ کریں تو انھیں نیست و نابود کردیا جائے۔

تاہم یہودیوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کردیا اور اپنی عہدشکنی اور غداری کی سزا پاگئے۔ یوں مسلمانوں کا مرکز (مدینہ) ان شرارت پسند اور فتنہ جو لوگوں کے وجود سے پاک ہوگیا۔

آخر میں اس نکتے کی جانب اشارہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غیرمسلم مصنفین واقعۂ بنی قریظہ کو اہل اسلام کا ایک ناقص فیصلہ قرار دیتے ہیں اور اسے اسلام کے خلاف بطور حربہ استعمال کرتے ہیں لیکن یہ مصنفین تاریخی مسائل کو نظرانداز کردیتے ہیں اور حقائق کو جان بوجھ کر بھلادیتے ہیں۔ تاکہ واقعات کو توڑ موڑ کر وہ اپنے نظریے کو صحیح ثابت کرسکیں۔

بنا بریں مسلم نوجوانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ اکثر غیر مسلم مصنفین نے "تاریخ اسلام، تمدن اسلام اور اسلام کے پیشواؤں کے سوانح حیات" وغیرہ کے ناموں سے کتابیں لکھی ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنے چہروں پر اسلام دوست، مستشرق اور اسلام شناس ہونے کا نقاب ڈال رکھا ہے لیکن وہ ہمارے ایسے دشمن ہیں جو اپنی تحریروں سے اسلام اور مسلمانوں پر کاری ضرب لگاتے اور مسلم نوجوانوں کے ذہنوں کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ ہاں تو ایک دشمن سے دوستی کی امید رکھنا بہت بڑی غلطی ہے۔

صلح حدیبیہ

پیغمبر اسلامؐ خانہ کعبہ کی زیارت اور مناسک حج ادا کرنے کے ارادے سے مسلمانوں کے ایک گروہ کے ساتھ کہ جن کی تعداد ۱۵۲۰ تک پہنچتی تھی، مدینہ سے روانہ ہوئے اور مسجد شجرہ میں احرام باندھ لیا۔

اگرچہ مسلمانوں اور قریش کے درمیان اچھے تعلقات قائم نہیں تھے لیکن یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی کہ ذی قعدہ جو تمام عربوں کے لیے واجب الاحترام مہینہ ہے۔ وہ اس مہینے میں مسلمانوں کے مکہ میں داخل ہونے میں مزاحم ہوں گے، جب کہ ان کی آمد کا مقصد فقط عبادت کرنا تھا۔ تاہم جب مسلمان حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش کی طرف سے رسول اکرمؐ کو بدیل بن ورقا کی معرفت ایک سخت پیغام ملا

اس پیغام میں قریش نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ کسی قیمت پر بھی مسلمانوں کو مکہ کی سرزمین پر قدم نہیں رکھنے دیں گے۔

اس پیغام سے مسلمانوں میں شدید پریشانی اور بے چینی پیدا ہو گئی۔ تب رسول اکرمؐ نے عمر بن خطاب کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ مکہ جا کر قریش کے سربرآوردہ اشخاص سے ملیں اور انہیں سمجھائیں کہ ہمارا یہ سفر لشکر کشی اور جنگ کے لیے نہیں ہے۔ نیز یہ واضح کر دیں کہ ہم فقط خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے آتے ہیں اور اگر ممکن ہو تو مسلمانوں کے مکہ میں داخل ہونے کے لیے ان کی رضامندی حاصل کر لیں۔ تاہم عمر نے یہ کہکر کہ وہ ایک کمزور آدمی ہیں اور ان کا قبیلہ بھی بگنام اور پست ہے اس ماموریت کی انجام دہی سے معذرت کر لی۔ لہٰذا یہ کام عثمان بن عفان کے سپرد کیا گیا اور وہ دس مسلمانوں کو ساتھ لے کر مکہ گئے۔ لیکن قریش نے رسول اکرمؐ کے نمائندوں کا احترام کرنے کی بجائے انہیں نظر بند کر لیا اور یہ ہوائی اڑادی کہ انھیں قتل کر دیا گیا ہے۔

اس خبر سے مسلمانوں میں بڑا اشتعال پیدا ہوا اور رسول اکرمؐ نے قسم کھائی کہ وہ قریش سے اس زیادتی کا انتقام ضرور لیں گے۔ پھر آپ اسی مقام پر ایک درخت کے نیچے تشریف فرما ہوئے اور مسلمانوں نے آپ سے اس امر پر بیعت کی کہ وہ اس راہ میں اپنی زندگی کے آخری سانس تک ثابت قدم رہیں گے۔

اس کے بعد آپ نے صحابہ کو حکم دیا کہ قریش کے جتنے افراد ان کے ہاتھ آئیں وہ ان کو گرفتار کر لیں۔ چنانچہ اسی رات مسلمانوں نے بھی پچاس قریشیوں کو قیدی بنا لیا۔

چنانچہ ان پچاس قریشیوں کے پکڑے جانے سے ایک بہت بڑی تبدیلی آئی اور قریش ان لوگوں کو چھڑانے کی خاطر نظر بند مسلمانوں کو رہا کرنے پر راضی ہو گئے۔ بعد میں انھوں نے سہیل بن عمرو اور حفص بن احنف کو اپنے نمائندے بنا کر بھیجا تاکہ وہ رسول اکرمؐ سے صلح نامے کی شرائط طے کرنے کے لیے گفتگو کریں۔

سہیل، جو مکہ کا ایک متعصب اور ناسمجھ بت پرست تھا، اس نے آ کر جاہلیت کی رسم کے مطابق سلام کیا اور کہا: قریش نے یہ کام میرے سپرد کیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ عدم تعرض یا صلح کے معاہدے پر دستخط کروں۔

تب رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کو حکم دیا تو آپ نے قلم لیا اور ایک کاغذ پر لکھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

لیکن جب سہیل کی نگاہ اس مقدس نام پر پڑی تو اس نے کہا: "ہم رحمٰن اور رحیم کو نہیں جانتے۔ لہٰذا اس معاہدے کی ابتداء پرانے طریقے کے مطابق "بسمک اللھم" کے جملے سے ہونی چاہیے۔" اس کی یہ تجویز مان لی گئی اور 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' کی بجائے 'بسمک اللھم' کے الفاظ لکھ دیے گئے۔

پھر امام علیؑ نے معاہدے کا آغاز اس جملے کے ساتھ کیا: یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد رسول اللہ اور قریش کے نمائندوں نے اتفاق کیا ہے۔

سہیل نے کہا: ہمیں "رسول اللہ" کے الفاظ پر اعتراض ہے۔ اگر ہم محمدؐ کو اللہ کا رسول مان لیتے تو پھر کوئی جھگڑا ہی باقی نہ رہتا، لہٰذا ان الفاظ کو بھی حذف کر دیجیے۔

تاہم امام علیؑ "رسول اللہ" کے الفاظ حذف کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، لیکن رسول اکرمؐ نے یہ الفاظ اپنے دست مبارک سے مٹا دیے اور ان کے بجائے "محمد بن عبداللہؐ" کے الفاظ لکھ دیے۔ آخر کار صلح کا یہ معاہدہ ان الفاظ میں مرتب ہوا:

اس معاہدے کے مطابق محمد بن عبداللہؐ اور قریش کے نمائندے سہیل بن عمرو نے آپس میں مندرجہ ذیل شرائط طے کی ہیں:

۱ ـــــ اس معاہدے کی مدت دس سال ہوگی اور اس دوران میں طرفین میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے ساتھ یا ایک دوسرے کے حلیفوں کے ساتھ کوئی تعرض نہیں کرے گا۔ نیز مسلمان اور قریش اپنے مال۔ جان اور آبرو کے بارے میں ایک دوسرے کے تعرض سے محفوظ رہیں گے۔

۲ ـــــ قریش اور مسلمان ایک دوسرے کے شہروں کی جانب آزادی سے سفر کر سکیں گے اور انہیں مکمل تحفظ حاصل ہوگا۔

۳ ـــــ مسلمانوں میں سے جو شخص اپنے باپ دادا کے مذہب کی طرف جانا اور بت پرستی اختیار کرنا چاہے، وہ ایسا کرنے میں آزاد ہوگا۔ اسی طرح جو بت پرست اسلام قبول کرنا چاہے وہ بھی اس بارے میں پوری آزادی سے فیصلہ کر سکے گا۔ گویا ہر شخص کو اپنے دین کے بارے میں مکمل آزادی حاصل ہوگی اور کسی دوسرے کو اس پر اعتراض کرنے کا حق نہ ہوگا۔

۴ ـــــ دوسرے عرب قبائل کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے سیاسی مفادات

کے پیشِ نظر فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں' دوستی کا معاہدہ کر لیں اور ہمارے اس معاہدے کے مطابق وہ قبیلے بھی ہر قسم کے تعرض اور زیادتی سے محفوظ رہیں گے۔

۵ ـــــ اگر قریش کا کوئی شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مسلمان ہو جائے اور ہجرت کر کے مدینہ چلا جائے تو مشرکین کو حق ہو گا کہ وہ اسے واپس مکہ لے آئیں لیکن اگر کوئی مسلمان اسلام کو ترک کر کے بت پرستی اختیار کر لے تو مسلمانوں کو اسے اپنے ہاں واپس لے جانے کا کوئی حق نہ ہو گا۔

۶ ـــــ مسلمان مکہ میں اپنے دینی مراسم ادا کرنے میں آزاد ہوں گے۔ چنانچہ کسی تحقیر یا تکلیف کا سامنا کیے بغیر انھیں حق ہو گا کہ نماز پڑھیں اور دین اسلام کے مطابق زندگی بسر کریں۔

۷ ـــــ محمد بن عبداللہ ؐ اور ان کے ساتھی اس سال ماہ ذی الحجہ میں حج نہیں کریں گے۔ تاہم اگلے سال وہ قریش کی جانب سے کسی روک ٹوک کے بغیر مکہ آ کر حج بجا لائیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ (ترویہ۔ عرفہ اور قربانی کے) تین دنوں سے زیادہ مکہ میں نہیں ٹھہریں گے۔ نیز مکہ میں داخل ہوتے وقت ان کے پاس کوئی جنگی ہتھیار نہیں ہو گا۔ تاہم ہر شخص اپنے پاس ایک تلوار رکھ سکے گا۔

جب صلح کے معاہدے پر دستخط ہو گئے تو رسول اکرم ؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے قربانی کے جانوروں کو وہیں ذبح کریں' سر کے بال ترشوائیں اور مدینہ واپس جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔

تاہم مسلمانوں کے لیے اس حکم کی تعمیل بے حد تکلیف دہ تھی، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ معاہدہ مشرکین کے حق میں جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس میں مسلمانوں کے مفادات کا خیال نہیں رکھا گیا، بلکہ وہ اسے ایک قسم کی شکست تصور کرتے تھے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ آنحضرت ص سر کے بال ترشوا رہے ہیں اور انھوں نے اپنے قربانی کے اونٹوں کو نحر کرنے کا حکم دیدیا ہے تو مجبوراً انھوں نے بھی آپ کی پیروی کی اور احرام اتار دیے۔

لیکن مسلمان صلح حدیبیہ سے اس قدر ناخوش تھے کہ فاضل حنبلی کی نقل کے مطابق جمع بین الصحیحین میں لکھا ہے:

عمر بن خطاب نے کہا: میں نے سوائے صلح حدیبیہ کے دن کے محمد ص کی نبوت میں ہرگز شک نہیں کیا (جب قریش اور اسلام کے درمیان صلح ہوئی) جب کہ میں ان کی نبوت کے بارے میں گہرے شک میں مبتلا ہو گیا۔

بہرحال رسول اکرم ص نے مسلمانوں کو تسلی دی، خدائے تعالیٰ کی عنایات کا یقین دلایا اور ان کو ہمراہ لے کر واپس مدینہ روانہ ہوگئے۔ تاہم کچھ مدت کے بعد مسلمانوں کو پتا چلا کہ اس معاہدے کی تمام شرائط دراصل انہی کے مفاد میں تھیں۔ کیونکہ اب انہیں قریش کی جانب سے کوئی خطرہ نہ رہا اور ایک طرح کا سکون حاصل ہو گیا۔ نیز اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رسول اکرم ص نے بھی دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے خاص کوششیں فرمائیں۔

جیسا کہ تاریخ اسلام میں زہری سے روایت ہے کہ اسلام جو

اس سے پہلے اتنی بڑی فتح حاصل نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ جب صلح ہوگئی تو قریش اور مسلمانوں کے درمیان لڑائی جھگڑے کا خاتمہ ہوگیا۔ تب لوگوں کو ایک دوسرے کے بارے میں اطمینان ہوگیا اور وہ بے فکری سے ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو شخص بھی تھوڑا بہت شعور رکھتا ہو، وہ اسلام کے اصولوں سے واقف ہو جاتا اور ایمان لے آتا تھا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد دو سال کے عرصے میں جو اشخاص ایمان لائے ان کی تعداد ان لوگوں سے زیادہ تھی جو اس سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔

جنگِ خیبر

جس دن رسول اکرمؐ ہجرت کرکے مدینہ آئے اور آپ نے اس شہر کو اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کا مرکز قرار دیا۔ اسی دن سے مدینہ کے نواح میں رہنے والے یہودیوں کو احساس ہوگیا کہ محمدؐ ان کے لیے ایک طاقتور حریف ثابت ہوں گے۔ انھیں اندازہ ہوگیا کہ تھوڑے عرصے میں ان کے دین کی عظمت سارے جزیرہ نمائے عرب پر چھا جائے گی۔ حتیٰ کہ وہ یہودیت اور عیسائیت کے اثر و نفوذ کو متزلزل بلکہ نیست و نابود کردے گی۔ یہی وجہ ہوئی کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ ہی مخالفت اور دشمنی قائم رہی۔

پھر یہودیوں کا حسد اس وقت شدت اختیار کرگیا' جب انھوں نے دیکھا کہ محمدؐ کے پیروؤں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور لوگ

جوق در جوق اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر حسد کے علاوہ ان کے دلوں میں خوف بھی پیدا ہو گیا۔ لہٰذا وہ اسلام کے خلاف سرگرم ہو گئے۔ جا بجا سازشیں جوڑنے لگے اور دوسروں کو بھی اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت پر اکسانے لگے۔ اگر کوئی ان سے یہ پوچھتا کہ توریت میں پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کا خیال کرو تو وہ ان کے مطالب میں تحریف کرتے، انہیں بدل دیتے اور سچ اور جھوٹ کو آپس میں ملا دیتے۔ تاکہ وہ مشرکین کی حمایت حاصل کر کے اسلام کی عظمت میں رخنہ ڈال دیں۔

قرآن مجید کی کئی ایک آیات میں یہودیوں کے توریت میں تحریف کرنے، لوگوں کو گمراہ کرنے اور خدا کے بندوں پر حسد کرنے میں انکی ظالمانہ روش پر انھیں سرزنش اور لعنت ملامت کی گئی ہے۔

تاہم رسول اکرمؐ یہودیوں کی ان سازشوں اور دشمنیوں کے بارے میں جہاں تک ممکن ہوتا چشم پوشی فرماتے اور ان کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے۔ آپ ان کی دینی رسومات کا احترام کرتے اور ان سے جو عہد و پیمان کرتے انہیں پورا کرتے۔ چنانچہ اگر یہودیوں میں سے کوئی ایک شخص اپنے عہد کے خلاف عمل کرتا تو آنحضرتؐ اس کے جرم کی سزا دوسروں کو نہیں دیتے تھے۔

یہودیوں میں کعب بن اشرف اور سلام بن ابی الحقیق دو ایسے اشخاص تھے، جو مسلمانوں کے ساتھ بہت غداری کرتے رہے۔ چنانچہ رسول اکرمؐ نے فقط انہیں دو اشخاص کو سزا دینے پر اکتفا کیا اور دوسرے یہودیوں سے متعرض نہ ہوئے۔

اسی طرح اگرچہ یہودی معاہدے کی خلاف ورزی کرتے اور آنحضرتؐ ان پر قابو پالیتے تو ان سے اعتدال اور انصاف کی حدود میں رہ کر سلوک کرتے، جیسا کہ آپ نے بنی نضیر کے ساتھ کیا۔ نیز اگر وہ کسی کو ثالث مقرر کرتے تو آپ بھی اس کی ثالثی کو قبول فرما لیتے، جیسا کہ یہود بنی قریظہ کے معاملے میں ہوا لیکن اس کے باوجود بھی یہودیوں کی شرارتیں اور سازشیں بڑھتی ہی چلی گئیں اور انہوں نے اپنی ریاست وقیادت کو بچانے کی خاطر مسلمانوں کو ختم کر دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ کبھی تو انھوں نے رسول اکرمؐ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا، کبھی عرب قبائل کو اسلام کے خلاف متحد کیا اور کبھی نازک وقت میں اپنا معاہدہ توڑ کر مسلمانوں کے دشمنوں سے مل گئے۔ تاہم انہیں اپنے کسی اقدام میں بھی کامیابی نصیب نہ ہوئی اور خدائے تعالیٰ نے ہر موقع پر اپنے دین اور اپنے پیغمبرؐ کی حفاظت فرمائی۔

پھر جب یہودیوں کی یہ تمام کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں تو خیبر کے یہودیوں نے فدک۔ تیما اور وادی القریٰ کے یہودیوں سے امداد مانگی، تاکہ مدینے پر اچانک حملہ کریں اور مسلمانوں کا کام تمام کر دیں۔

اسی دوران میں ایک یہودی کہ جو خفیہ مشن پر تھا اور جاسوسی کر رہا تھا۔ وہ امام علیؑ کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور جب اس سے بازپرس کی گئی تو اس نے اقرار کیا کہ وہ فدک اور خیبر کے یہودیوں کے درمیان رابطہ قائم کرنے میں مصروف رہا ہے۔

ایسی سرگرمیوں کا سراغ مل جانے کے بعد خاموش بیٹھے رہنا مناسب نہ تھا۔ بلکہ عقل اور منطق کا تقاضا تھا کہ معاملے کے خطرناک شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی اس کا سدباب کر لیا جائے۔ لہٰذا رسول اکرمؐ نے جنگ

کی تیاری کا حکم صادر فرمایا اور اسلامی فوج خیبر کی جانب روانہ ہوگئی۔
بعض غیر مسلم مصنفین اور یورپی مستشرقین کہ تاریخ اسلام لکھنے میں جن کے مذموم سیاسی اور نوآبادیاتی مقاصد پنہاں ہوتے ہیں۔ انہوں نے رسول اکرمؐ کی جنگوں کو لوٹ مار کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس بنا پر انہوں نے تاریخی حقائق کو نظر انداز کر دیا، مورخین کی تحریروں میں رد و بدل کیا اور ان میں جھوٹی روایات اور بے بنیاد توجیہات کا اضافہ کیا ہے لیکن اہل علم و تحقیق لوگوں پر ان بددیانت مصنفین کی غرض و غایت مخفی نہیں ہے اور مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتابیں لکھنے میں ان کا اصلی مقصد اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی اور اس آسمانی دین پر ضرب لگانا ہے۔
خود ہمارے زمانے میں بھی ان دروغ بافیوں اور یاوہ گوئیوں کی بہت سی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ جیسا کہ بعض استعماری مصنفین نے یہودیوں کے خلاف نازیوں کی تحریک کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ کئی مسلمان اہل قلم بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ نازیوں نے بہت سے یہودیوں کو قتل کیا تھا لیکن ان استعماری گماشتوں نے ان کی جو مبالغہ آمیز تعداد بتائی ہے اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔
ان کا دعویٰ ہے کہ ساٹھ لاکھ یہودی جرمنی کی قتل گاہوں میں قتل کیے اور جلا کر نیست و نابود کر دیے گئے۔ حالانکہ یورپ میں یہودیوں کی آبادی کے بارے میں نازی تحریک سے پہلے کے صحیح اعداد و شمار موجود ہیں اور ان کے مطابق ان کی کل تعداد تقریباً ساٹھ لاکھ تھی۔ جن میں سے اکثر نے نازیوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے پہلے ہی دوسرے ممالک میں پناہ لے لی اور جو یہودی مارے گئے وہ بڑے، چھوٹے، عورتیں اور

مرد سب ملا کر دو لاکھ تھے۔ گو اس قسم کے جھوٹ بعض مقاصد کے تحت گھڑے جاتے ہیں لیکن بعض مصنفین انہیں بلا تحقیق نقل کر کے چھاپ دیتے ہیں۔ اسی طرح خیبر پہ مسلمانوں کی لشکرکشی کے بارے میں بھی تاریخی حقائق وہی ہیں، جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر یہ پیش بندی نہ کی جاتی تو یہودی یقیناً مسلمانوں پہ ایسی ضرب لگاتے کہ جس کی تلافی ناممکن ہو جاتی۔

چنانچہ جب اسلامی فوج خیبر کی حدود میں پہنچی تو یہودیوں نے اپنے قلعوں میں پناہ لے لی۔ انہوں نے قلعوں کے دروازے بند کر لیے اور فقط ایک راستا جنگ لڑنے کے لیے کھلا رکھا۔

اس بارے میں جو شیعہ سنی روایات آئی ہیں، انکے مطابق رسول اکرمؐ نے پہلے دن ابوبکر کو سپہ سالار بنایا اور انہیں جنگ کا پرچم عنایت فرمایا۔ تب وہ اسلامی فوج کو ساتھ لے کر آگے بڑھے تو مرحب اپنے قلعہ کے اندر سے ان کے مقابلے پر نکلا لیکن پہلی ہی مڈھ بھیڑ میں ابوبکر میدان سے بھاگ نکلے اور اس کے ساتھ ہی اسلامی فوج کے پاؤں بھی اکھڑ گئے۔ اس سے اگلے دن رسول اکرمؐ نے عمر بن خطاب کو سپہ سالار بنایا۔ چنانچہ انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ نہ صرف یہ کہ میدان سے فرار نہیں ہوں گے بلکہ ابوبکر نے مسلمانوں کے دامن پہ جو داغ لگایا ہے، وہ اسے بھی دھو ڈالیں گے لیکن افسوس ہے کہ وہ بھی مرد میدان نہ نکلے اور پہلے حملے میں ہی موت کا سایہ دیکھ کر میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھی بھی بھاگ آئے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان دو اشخاص کے فرار کی روایت اکثر

سنی اور شیعہ مؤرخین نے نقل کی ہے اور یہ امر تاریخ کے ناقابل انکار واقعات میں سے ہے۔ جیسا کہ ابن ابی الحدید جو ایک سنی عالم ہے، وہ فتح خیبر کے قصیدے میں یوں لکھتا ہے:

ترجمہ عربی اشعار:

۱۔ "میں ہرگز نہیں بھول سکتا کہ یہ دو اشخاص (ابو بکر اور عمر) اسلامی فوج کے سالار بنے اور وہ میدان سے بھاگ نکلے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ میدان جنگ سے بھاگنا بہت بڑا گناہ ہے۔

۲۔ وہ اسلام کا مقدس پرچم لے کر میدان میں گئے، لیکن وہ اس پر ذلت اور بدنامی کا داغ لگا لائے۔

۳۔ ایک یہودی پہلوان جس کی تلوار لمبی اور گھوڑا شاندار تھا، اس نے ان پر حملہ کیا۔ اس کی تلوار اور نیزے میں سے آگ کے شعلوں کے ساتھ موت برس رہی تھی۔ لیکن میں ان کے فرار کے لیے تمہارا کوئی عذر قبول نہیں کرتا، کیونکہ موت تو ہر شخص کے لیے ناگوار اور نفرت انگیز ہے اور ہر انسان کا جی چاہتا ہے کہ وہ موت کے منہ میں نہ جائے اور زندہ رہے۔"

رسول اکرمؐ کو ان ناگوار واقعات سے بڑا دکھ پہنچا اور اب اس بارے میں آسمانی حکم کے انتظار میں تھے۔ اسی اثناء میں خدائے تعالیٰ کا فرمان نازل ہوا، جس میں فیصلہ کن جنگ لڑنے کو کہا گیا۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

کل میں یہ پرچم ایک ایسے شخص کو دوں گا جو پے در پے حملے کرتا ہے اور میدان جنگ سے ہرگز قدم پیچھے نہیں ہٹاتا۔ وہ خدا و رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور خدا و رسولؐ بھی اسے دوست رکھتے ہیں۔

ان دنوں امام علیؑ کی آنکھیں دکھتی تھیں، اس لیے وہ جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا کسی کو گمان تک نہ تھا کہ یہ "کرار غیر فرار" علیؑ ہوں گے۔ چنانچہ سبھی کی آنکھیں رسول اکرمؐ کی طرف لگی ہوئی تھیں اور ہر شخص کو آرزو تھی کہ یہ پرچم اسی کو ملے اور یہ افتخار اسی کو حاصل ہو۔

تاہم لوگوں کو زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کو طلب فرمایا، ان کی آنکھوں پر ایک شفا بخش پھونک ماری اور اسلام کا پرچم ان کے سپرد کر دیا۔ جب علیؑ قلعہ کی جانب بڑھے تو مرحب جو جنگ کے دو مرحلوں میں فتح پا چکا تھا، اس نے آپ کا راستا روکا اور اس طرح رجز پڑھا:

خیبر میں رہنے والے جانتے ہیں کہ میرا نام مرحب ہے۔ وہ مرحب جو ہتھیار بند، جنگجو اور آزمودہ کار ہے۔

امام علیؑ نے بھی اپنا ہاتھ تلوار کے قبضے پر رکھا اور فرمایا:

میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے۔
میں جنگل کے اس شیر کی مانند ہوں، جسے دیکھ کر لوگوں کو خوف آتا ہے۔

مرحب نے اپنے آپ کو یوں محفوظ کر رکھا تھا کہ اسے تلوار کے وار کی کوئی فکر نہ تھی کیونکہ اس کے سر پہ فولادی خود، اس پر دو پگڑیاں اور ان کے اوپر چکی کی طرح کا ایک پتھر بھی رکھا ہوا تھا۔ جس کے بیچ میں ایک

سوراخ تھا اور اس میں سے خود کی سیخ گزرتی تھی۔ لہٰذا اس بات کا یقین ہی نہیں آسکتا تھا کہ کوئی تلوار ان سب چیزوں میں سے گزر کر اسے زخم لگا سکے گی لیکن وہ امام علیؑ کی تلوار تھی کہ جو اتنے زور سے لگی کہ اس پتھر، خود اور اس کے پرغرور مغز کو کاٹتی ہوئی زرہ سے ڈھکے ہوئے سینے سے بھی آگے نکل گئی اور اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

مرحب کی موت کے ساتھ ہی قلعہ قموص کی جنگ ختم ہوگئی کیونکہ یہودی بھاگ کر قلعے کے اندر گھس گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ تب امام علیؑ قلعے کے دروازے پر پہنچے، اس کو ایک ہاتھ سے اکھاڑا اور ایک پل کی مانند قلعے کے اردگرد کھدی ہوئی خندق پر رکھ دیا۔

اس وقت سات اور یہودی جن کے نام عنترہ، حارث، ربیع بن ابی اسحاق، مرۃ بن مروان، یاسہ، ضجیح اور داؤد بن قابوس کہ جن کا شمار دلاوروں اور جنگجوؤں میں ہوتا تھا، وہ میدان میں آئے اور یکے بعد دیگرے امام علیؑ کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گئے۔

یوں خیبر کہ جو یہودیوں کا اہم ترین مرکز تھا، وہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ نیز اسلام اور مسلمانوں کو اس سے جو خطرہ لاحق رہتا تھا، وہ ہمیشہ کے لیے دور ہوگیا۔

باغِ فدک

فدک نام کا ایک سرسبز و شاداب گاؤں خیبر کے نزدیک واقع تھا۔ وہ اپنے باغوں اور نخلستانوں کی وجہ سے بڑا خوشحال اور آباد سمجھا جاتا تھا۔ فدک کے باشندے جو اس کے مالک تھے' وہ زیادہ تر یہودی تھے۔ خیبر کے وہ قلعے جن پر سبھی یہودی ناز کرتے تھے' وہ فتح ہو گئے اور ان کا سردار مرحب امام علیؑ کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ تب فدک والوں کو بھی پتا چل گیا کہ اسلام کے خلاف جنگ کا نتیجہ خود ان کی تباہی اور بربادی کی صورت میں نکلے گا۔ لہٰذا انہوں نے جنگ اور خونریزی کے بغیر اطاعت قبول کر لی اور اپنے قلعوں کی کنجیاں رسول اکرمؐ کی خدمت میں پیش کر دیں۔

رسول اکرمؐ نے بھی ان کے ساتھ نہایت کریم النفسی کا سلوک کیا۔ چنانچہ ان کی درخواست پر وہ زمینیں ان کو اس شرط کے ساتھ پٹے پر دیدیں کہ جب کبھی آنحضرتؐ چاہیں گے وہ لوگ فدک چھوڑ کر

چلے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ دین اسلام قبول کر لیتے تو ان کی تمام دولت اور جائداد ان کی اپنی ملکیت ہوتی اور انہیں کوئی نقصان نہ پہنچتا۔

احکام اسلام کے مطابق جنگ اور لشکر کشی میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا، اس میں تمام مسلمان سپاہیوں کا حصہ ہوتا اور وہ ان میں تقسیم کر دیا جاتا تھا لیکن فدک کے لیے کوئی جنگ نہیں لڑی گئی، بلکہ یہ زمین خدائے تعالیٰ نے لشکر کشی کے بغیر ہی اپنے پیغمبرؐ کو عنایت کر دی۔ لہٰذا قرآن مجید کی نص کے مطابق فدک کی املاک رسول اکرمؐ کی ذاتی ملکیت قرار پائی۔

قرآن مجید اس بارے میں یوں فرماتا ہے:

جو مال خدا نے اپنے رسولؐ کو ان لوگوں سے بے لڑے دلوا دیا۔ اس کے لیے تم نے اپنے گھوڑوں اور اونٹوں سے کچھ دوڑ دھوپ نہیں کی۔ مگر خدا اپنے پیغمبرؐ کو جس پر چاہتا ہے غلبہ عطا فرماتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ پھر جو مال خدا نے اپنے رسولؐ کو دیہات کے رہنے والوں سے بے لڑے دلوایا ہے، وہ خاص خدا، رسولؐ اور (رسولؐ کے) قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور دوران سفر محتاج ہو جانے والے مسافروں کا ہے۔ تاکہ تم میں سے جو دولتمند ہیں ہر پھر کر دولت انہیں کے پاس نہ رہے۔ ہاں رسولؐ جو کچھ تمہیں دیدیں وہ لے لیا کرو، جس سے منع کریں اس سے باز رہو

اور خدا سے ڈرتے رہو، بیشک خدا سخت عذاب دینے والا ہے۔
(سورہ حشر۔ آیت ۵ تا ۷)

کلمہ "ذی القربیٰ" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے نہ فقط شیعہ بلکہ سنی علماؑ نے بھی علیؑ و فاطمہؑ اور حسنینؑ کے نام لیے ہیں۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق رسول اکرمؐ نے فدک کی اراضی اپنی بیٹی فاطمہؑ کو بخشی اور اس کی ایک سند بھی لکھ دی، جس پر امام علیؑ، ام ایمنؓ اور رسول اکرمؐ کے ایک غلام نے دستخط کیے۔

پھر اس دن سے لے کر رسول اکرمؐ کی زندگی کے آخر تک فدک فاطمہ زہراؑ کے تصرف میں رہا، جیسا کہ امام علیؑ، عثمان بن حنیف کے نام ایک خط میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں

> ہاں تو نیلے آسمان کے نیچے فقط فدک ہی ہمارے ہاتھ میں تھا جس پہ ایک گروہ ابوبکر و عمر وغیرہ نے حسد کیا۔ انہوں نے ہمیں ظلم کے ساتھ اس سے بیدخل کر کے یہ دوسرں کو دیدیا، لیکن ہم نے اس سے چشم پوشی کی اور خدا ہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

رسول اکرمؐ کی رحلت کے ساتھ ہی خلافت کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ چنانچہ پہلے سے سوچے سمجھے منصوبوں کے مطابق سقیفہ بنی ساعدہ کا اجتماع منعقد کیا گیا۔ تاہم تعجب اس بات پہ ہے کہ ابھی رسول اکرمؐ کے جسدِ پاک کو سپرد خاک بھی نہیں کیا گیا تھا کہ ابوبکر اور عمر خلافت پر قبضہ جمانے کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔ حالانکہ غدیر کے دن رسول اکرمؐ نے واضح طور پہ امام علیؑ کو اپنا جانشین نامزد کیا اور ان اشخاص

نے آپ کی بیعت بھی کی تھی لیکن انہوں نے ان سب چیزوں کو نظرانداز کردیا اور حیلے حوالے سے مسند خلافت پر قبضہ جمالیا۔

پھر اپنی اس بے جواز حکومت اور خلافت کو مضبوط اور طاقت ور بنانے کے لیے وہ لوگ مل بیٹھے اور باہم مشورہ اور تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ بالآخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ علیؑ و فاطمہؑ کو فدک سے بیدخل کردیا جائے تاکہ علیؑ میں حکومت کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہ رہے۔ چونکہ مقابلے کا بہترین وسیلہ روپیہ پیسہ ہے، لہٰذا جب علیؑ کا ہاتھ خالی ہوگا تو دولت کے بندے ان کی کوئی مدد نہیں کریں گے۔

یوں فدک کا علاقہ فاطمہؑ سے ہتھیا کر اسے ابوبکر کے کارندوں کے سپرد کردیا گیا۔ تب فاطمہؑ نے فدک پر اپنی ملکیت ثابت کرنے اور اپنا حق لینے کے لیے گواہ پیش کیے، لیکن ان کی گواہی قبول نہ کی گئی۔ اس پر انہوں نے قانون وراثت کے مطابق اپنا حق طلب کیا، لیکن ابوبکر نے کہا: میں نے رسول اکرمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

ہم گروہ پیغمبراں اپنے پیچھے کوئی ورثہ نہیں چھوڑتے۔

ذرا غور فرمائیں: "ابن ابی الحدید کہ جس کا ذکر متعدد مرتبہ آچکا ہے اور جو علمائے اہلسنت میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ وہ اس بات کا معتقد ہے کہ ابوبکر، فاطمہ زہراؑ سے کچھ زیادہ "خوش" نہیں تھے عین ممکن ہے کہ وہ دل ہی دل میں کینہ رکھا کرتے ہوں۔ تاہم جب تک رسول اکرمؐ زندہ رہے انہیں اس کے اظہار کی جرأت نہ ہوئی۔ البتہ جس فرد نے ابوبکر کے دل میں اس کینہ کا بیج بویا اور اس کی پرورش کی وہ ان کی بیٹی عائشہ ہی تھیں۔

عائشہ وہ خاتون تھیں جو خدیجہؑ کی رحلت کے بعد رسول اکرمؐ کے عقد میں آئیں۔ وہ اور فاطمہ زہراؑ جو تقریباً ہم عمر تھیں۔ ان میں ہمیشہ اختلاف برقرار رہا۔ تاہم رسول اکرمؐ اپنی بیٹی کو بزرگ ترین اور شریف ترین بی بی کا رتبہ دیتے اور انہیں دنیا کی افضل ترین عورت شمار کرتے تھے۔ اس لیے یہ محال تھا کہ وہ عائشہ کے زنانہ گلوں شکووں پہ کان دھرتے۔ علاوہ ازیں خود عائشہ بھی یہ جرأت نہ کر سکتی تھیں کہ رسول اکرمؐ کے سامنے فاطمہ زہراؑ کا نام دشمنی کے ساتھ زبان پہ لائیں۔ جیسے وہ یہ نہیں کر سکتی تھیں کہ اپنی شکایتیں اور حکایتیں ان کہی رہنے دیں۔ لہٰذا اس مجبوری کے تحت وہ ہر ہفتے عشرے میں اپنے باپ ابوبکر کے پاس جاتیں اور فاطمہ زہراؑ کی شکایتیں کیا کرتیں۔

ابوبکر بھی طبعاً نرمی کی خو بو رکھتے تھے اور دردِ دل کہنے سننے کے اہل تھے۔ لہٰذا وہ بیٹی کی دکھ بھری داستانیں سنتے اور اسے لڑائی جھگڑے پر اکساتے رہتے حتیٰ کہ وہ خود بھی دوسری عائشہ بن گئے تھے۔ چنانچہ وہ بھی فاطمہ زہراؑ کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے اور اپنے دل کا غبار نکالنے کی تلاش میں رہتے تھے۔ چنانچہ آج جبکہ وہ فاطمہ زہراؑ کے دعوے کا جواب دے رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ انتقام لینے کا دن آپہنچا ہے۔ گویا کہ یہ ایک بڑا اچھا موقع ہے کہ رسول اکرمؐ کی بیٹی کو آزردہ کر کے اپنے سینے کے داغوں کا علاج کیا جائے۔

جعلی حدیث: "ہم گروہ انبیاء ترکے میں درہم و دینار نہیں چھوڑتے"

یہ ایک ایسی حدیث ہے کہ علمائے اسلام کے اجماع کے مطابق

ابو بکر کے علاوہ اس کا کوئی راوی نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ علمائے اہل سنت بھی اس روایت کو خبرِ واحد قرار دیتے ہیں۔

جی ہاں! ابو بکر یعنی عائشہ کا والد، وہ شخص جس نے اہل بیتؑ سے خلافت چھین لی تھی اور وہ شخص جو اپنی بیٹی کی خاطر اس کے شوہر کی بیٹی کو عداوت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس نے روایت کی کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: ہم گروہ انبیاء ترکے میں درہم و دینار نہیں چھوڑتے۔ تاہم یہ حدیث ابو بکر کے علاوہ کسی نے نہیں سنی تھی۔

علاوہ اس کے کہ یہ حدیث "خبر واحد" ہے اور حجت کے اعتبار سے بے حد ضعیف ہے، یہ خدائے تعالیٰ کے کلام سے بھی متصادم ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں وراثت کے بارے میں آیات کسی استثناء کے بغیر نازل ہوئی ہیں۔ جیسا کہ پروردگار عالم اپنے رسولؐ سے فرماتا ہے:

خدا تمہاری اولاد کے حق میں تم کو وصیت کرتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔

(سورۂ نساء۔ آیت ۱۱)

نیز فرماتا ہے:

خدا کی کتاب میں صاحبان قرابت باہم زیادہ حقدار ہیں۔

(سورۂ انفال۔ آیت ۷۵)

اور یہ بھی فرماتا ہے:

مرنے والا کچھ مال چھوڑ جائے تو ماں باپ اور قرابنداروں کے لیے اچھی وصیت کرے، جو اللہ سے ڈرنے والوں پر ایک حق ہے۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۸۰)

مذکورہ بالا عام آیات جو وراثت کے بارے میں مسلمانوں کو بلا استثنا حکم دیتی اور ان کی رہنمائی کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ قرآن مجید میں انبیائے کرامؑ کے ترکہ کا ذکر بھی آیا ہے۔

اے خدا! مجھے ایک جانشین (فرزند) بخش دے۔ تاکہ وہ مجھ سے اور آل یعقوب سے میراث حاصل کرے۔ اے میرے رب اس کو اپنا پسندیدہ بنا۔

(سورۂ مریم۔ آیت ۶)

سلیمانؑ اپنے باپ داؤدؑ کے وارث ہوئے تو کہا لوگو ہم کو پرندوں کی بولی بھی سکھائی گئی اور ہر چیز عطا کی گئی ہے۔

(سورۂ نمل۔ آیت ۱۶)

ان واضح آیات کے مطابق خدائے تعالیٰ کے پیغمبروں زکریاؑ و داؤدؑ نے اپنے پیچھے میراث چھوڑی اور یحییٰؑ و سلیمانؑ جو دونوں خدا کے پیغمبر تھے، انہوں نے اپنے اپنے باپ سے میراث پائی۔

اس بنا پر فاطمہ زہراؑ نے بھی اپنا حق لینے کے لیے پوری کوشش کی۔ چنانچہ انھوں نے مدینہ کی مسجد نبوی میں ایک مفصل خطبہ دیا اور پردے کے پیچھے سے حقائق پر سے پردہ اٹھایا۔ لیکن بدقسمتی سے سربراہ مملکت کی عوام فریبی اور عوام کی دنیا پرستی کے باعث فاطمہ زہراؑ اپنا حق لینے میں کامیاب نہ ہوئیں اور فدک کو غاصبوں کے ہاتھ سے نہ چھین سکیں۔

وہ اس صورت حال سے رنجیدہ خاطر ہو کر واپس آ گئیں اور

قسم کھائی کہ وہ آئندہ کبھی بھی ابوبکر سے بات نہیں کریں گی۔ اس طرح انہوں نے ابوبکر سے اپنی بیزاری کا اظہار فرما دیا تھا۔

محدث بخاری کہ جو اہل سنت کے ممتاز علماء میں سے ہیں انہوں نے اپنی صحیح میں عائشہ سے یوں نقل کیا ہے: اس دن کے بعد فاطمہؑ خفا ہوگئیں اور اس دوران میں انہوں نے ابوبکر سے دوری اختیار کی۔ پھر وہ ان سے اسی طرح ناراض رہیں حتیٰ کہ رحلت فرما گئیں۔

تاہم فدک بدستور ابوبکر اور بعد میں آنے والے خلفاء کے قبضے میں رہا۔ چنانچہ بنی امیہ کے دور میں بھی وہ ان میں سے ایک سے دوسرے خلیفہ کے ہاتھ میں منتقل ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ خلافت عمر بن عبدالعزیز کو ملی۔ تب انہوں نے اسے فاطمہؑ کی اولاد کو واپس کر دیا۔

عمر بن عبدالعزیز کے بعد دوسرے اموی خلفاء نے اولادِ فاطمہ زہراؑ سے فدک پھر چھین لیا، حتیٰ کہ ابوالعباس سفاح عباسی نے اولادِ بی بی فاطمہ زہراؑ کو واپس کر دیا۔ لیکن منصور عباسی نے ایک بار پھر اسے لے لیا اور پھر اس کے بیٹے مہدی نے واپس کر دیا۔ بعدہٗ اس کے بیٹوں موسیٰ اور ہارون نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ لیکن مامون نے واپس کر دیا۔ تاہم متوکل عباسی نے فدک پھر چھین لیا اور اس کی آمدنی عبداللہ بن عمر بازیار کے لیے لکھ دی۔

یہ ہے معاملہ فدک کا خلاصہ کہ جو ہم نے تمام باضمیر اور منصف حضرات کے سامنے فیصلے کے لیے پیش کر دیا ہے۔ نیز اسکی پوری جزئیات تاریخ اسلام میں محفوظ ہیں جو دیکھنے والوں کو ہمیشہ ہمیشہ دعوتِ فکر دیتی رہیں گی۔

عالمگیر آواز

اب وقت آگیا تھا کہ اسلام کی آواز تمام بنی نوع انسان کے کانوں تک پہنچائی جائے۔ کیونکہ اسلام وہ عالمگیر دین ہے جو خدائے تعالیٰ کی طرف سے اقوامِ عالم کی بہتری اور خوشحالی کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ مختلف ممالک کے بادشاہوں اور فرمانرواؤں کو اس آسمانی دعوت سے روشناس کرایا جاتے۔ تاکہ وہ اس ترقی پذیر اور آزادی بخش ضابطۂ حیات سے استفادہ کرسکیں۔

اس مقصد کے تحت رسول اکرمؐ نے حسبِ معمول اپنے اصحاب سے مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ مختلف ممالک کے فرمانرواؤں کو خطوط کے ذریعے سے اسلام کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ مؤرخین نے رسول اکرمؐ کی جانب سے بہت سی مملکتوں کے سربراہوں کو بھیجے گئے خطوط کا ذکر کیا ہے، جن میں سے خاص خاص یہ ہیں:

۱ —— نجاشی اول —— شاہِ حبشہ

۲ —— نجاشی دوم —— شاہِ حبشہ

۳ —— خسرو پرویز —— شہنشاہِ ایران

۴ —— ہرقل —— شہنشاہِ روم

۵ —— ضغاطر —— پاپائے اعظم روم

۶ —— مقوقس —— شاہِ مصر

۷ —— حارث بن ابی شمر غسانی۔ حاکم اردن

۸ —— ہوذہ بن علی —— حاکم یمامہ

۹ —— منذر بن ساوی —— حاکم بحرین

۱۰ —— رؤسائے نجران

۱۱ —— یمن، حضرموت اور حمیر کے سرداران قبائل

پہلا خط حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو بھیجا گیا اور اس کا مضمون یہ تھا:

خط کا ترجمہ: خدا کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ یہ خط محمد رسول اللہؐ کی جانب سے سلطان حبشہ کے نام ہے۔ امابعد

میں تمہارے سامنے خدا کی حمد و ثنا کرتا ہوں جو برحق معبود، بے نقص بادشاہ، منزہ، تمام عیوب سے پاک اور لوگوں کے ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے۔ پھر میں گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰؑ خدا کی مخلوق اور اس کا کلمہ ہیں جن کو اس نے پاک دامن اور پارسا مریمؑ پر القا فرمایا اور جس طرح

اس نے آدمؑ کو ماں باپ کے بغیر پیدا کیا اسی طرح عیسیٰؑ کو بھی باپ کے بغیر ماں کے رحم کے اندر وجود میں لایا۔

اے حبشہ کے بادشاہ! میں تمہیں خدائے وحدہٗ لاشریک کی طرف بلاتا ہوں۔ تاکہ تم اس کے مطیع ہو جاؤ۔ نیز میری پیروی کرو اور میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لاؤ، کیونکہ میں خدا کا رسولؐ ہوں۔

علاوہ ازیں میں نے اپنے چچازاد بھائی جعفرؓ کے ساتھ چند اور مسلمانوں کو بھی تمہارے پاس بھیجا ہے۔ جب وہ تمہارے پاس پہنچیں تو ان کی مدارات کرو اور سرکشی ترک کردو۔ پس میں تمہیں اور تمہاری فوج کو خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ میں نے اس خط کے ذریعے تمہیں اپنی رسالت سے آگاہ کر کے نصیحت کا حق ادا کر دیا ہے۔ لہٰذا تم میری نصیحت قبول کرو اور سلام ہو اس شخص پر جو راہ راست پر چلتا ہے۔

محمد رسول اللہؐ

پھر اس خط پر رسول اکرمؐ کی مہر لگائی گئی جس کے نگینے پر "محمد رسول اللہؐ" کے الفاظ کندہ تھے۔ اس کے بعد یہ خط عمرو بن امیہ کے ہاتھ نجاشی کے دربار میں بھیج دیا گیا۔

عمرو بن امیہ جب نجاشی کے دربار میں پہنچے تو انھوں نے بادشاہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ تب درباریوں نے انہیں بتایا کہ بادشاہ کے حضور میں جانے کے لیے یہ بات لازم ہے کہ اسے سجدہ کیا جائے۔ لیکن

عمرو نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

ہمارے عقیدے اور مذہب کے مطابق سجدہ فقط ذاتِ خداوندی کے لیے ہے اور کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں ہے۔ پھر اگر ہمیں سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو ہم سب سے پہلے اپنے عالیشان پیغمبر کو سجدہ کرتے۔

چونکہ درباریوں کے اس اصرار کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، اس لیے وہ عمرو کو بادشاہ کے پاس لے گئے۔ وہ کمال آزادی اور دلیری سے نجاشی کے حضور پہنچے اور اس سے مختصر خطاب کرتے ہوئے کہا:

بادشاہ سلامت! مجھے ایک فریضہ سونپا گیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ میں اسے انجام دوں اور جو پیغام لایا ہوں وہ آپ تک پہنچا دوں۔ لہٰذا آپ پر لازم ہے کہ جو کچھ میں کہوں اسے سنیں اور اس پر توجہ دیں۔

آپ ہم مسلمانوں کے لیے جو نیک جذبات رکھتے ہیں، ان کی بنا پر آپ درحقیقت خود ہم میں سے ہیں۔

اسی طرح ہم آپ پر جو بھروسا اور اعتماد رکھتے ہیں، اس کے پیشِ نظر ہم آپ کے قریب ہیں۔ کیونکہ آپ کے سابقہ سلوک سے پتا چلتا ہے کہ ہم نے آپ سے جس نیکی کی امید رکھی وہ آپ نے پوری کی ہے اور جس تکلیف کے سلسلے میں ہم نے آپ سے عنایت کی توقع رکھی، ہم اس تکلیف سے محفوظ رہے ہیں۔

اگرچہ آپ کے پاس اس سے پہلے بھی ہمارے پیغمبرؐ کی

رسالت کا ثبوت موجود ہے لیکن اب ہم آپ کی آسمانی انجیل سے بھی آنحضرت کی رسالت کے بارے میں ناقابلِ انکار گواہی پیش کرتے ہیں، جس کا فیصلہ حقیقت پر مبنی ہے۔ لہٰذا اب آپ کے لیے موقع ہے کہ اس کتاب کی گواہی سے استفادہ کریں اور خدا کے فضل سے بہرہ مند ہوں۔ اگر آپ اس دعوتِ حق کو رد کر دیں گے تو پھر آپ بھی ان یہودیوں کی مانند ہوں گے، جنھوں نے حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کی دعوت رد کر دی تھی۔

اسلام کے جلیل القدر پیغمبرؐ نے فقط آپ ہی کو نہیں دوسرے فرمانرواؤں اور عام لوگوں کو بھی حق کی طرف بلانے کے لیے اپنے نمائندے دنیا کے مختلف ممالک میں بھیجے ہیں لیکن انھیں جو امید آپ سے ہے، وہ دوسروں سے نہیں اور وہ جس قدر آپ سے مطمئن ہیں دوسروں سے نہیں ہیں۔ ان کو یہ امید آپ کی ان نیکیوں کی بنا پر ہے جو اس سے پیشتر آپ نے مسلمان مہاجرین کے ساتھ کی ہیں۔

عمرو کی یہ سنجیدہ اور عاقلانہ باتیں کہ جو کمال فصاحت کے ساتھ کہی گئیں، انھوں نے حاضرین پر بے حد اثر کیا اور محفل پر مکمل خاموشی چھا گئی۔

اس خطاب کے بعد وہ بادشاہ کی جانب بڑھے تاکہ رسول اکرمؐ

کا خط اسے پیش کریں۔ بادشاہ اس گرانقدر خط کے احترام کے طور پر تخت سے نیچے اتر آیا اور خط ہاتھ میں لے کر اپنے سر اور چہرے کو لگایا۔ پھر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور حکم دیا کہ فوراً اس خط کا حبشی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔

جب نجاشی نے خط کے مندرجات پڑھے تو اس کا دل اسلام کے نور سے منور ہو گیا اور اس نے کہا: اگر میرے لیے ممکن ہوتا تو میں سفر کی تیاری کرتا اور حضرت محمدؐ کے پاس پہنچتا۔

پھر اس نے عمرو بن امیہ کو تنہائی میں اپنے پاس بلایا اور کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ تمہارے پیغمبرؐ وہی پیغمبرؐ ہیں جن کا عیسائیوں اور یہودیوں کو انتظار ہے۔ کیونکہ عیسیٰؑ نے پیغمبر اسلامؐ کے آنے کے متعلق جو خبر دی ہے، وہ بعینہٖ اس بشارت کی مانند ہے جو حضرت موسیٰؑ نے حضرت عیسیٰؑ کے لیے دی تھی۔ بہرحال جو کچھ تم نے کہا ہے وہ اس بشارت سے زیادہ واضح نہیں ہے جو حضرت عیسیٰؑ نے دی تھی لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس ملک میں میرے حمایتی بہت تھوڑے ہیں۔ اس لیے مجھے مہلت دو کہ میں کچھ اور لوگوں کو اپنا ہمخیال بنا کر انہیں یہ آسمانی دعوت قبول کرنے پر آمادہ کر سکوں۔ پھر اس نے رسول اکرمؐ کے خط کا جواب ان الفاظ میں لکھا:

> خدا کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ محمد رسول اللہؐ کی خدمت میں یہ نجاشی حبشہ کا عریضہ ہے۔ اے اللہ کے نبی آپ پر اس کی رحمت اور برکت ہو۔ وہ خدا کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اسی نے مجھے اسلام کی راہ سجھائی ہے ...... الخ

اس خط میں نجاشی نے رسول اکرمؐ کے اسم مبارک کو اپنے نام پر مقدم رکھا ہے اور صاف صاف بتلا دیا ہے کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے بیٹے "ارھا" کو آنحضرتؐ کی خدمت میں بھیج کر کہا کہ اگر رسول اکرمؐ حکم دیں تو وہ خود مدینہ آکر باریابی کا شرف حاصل کرے۔

نجاشی کی طرف سے دو وفد بھی مدینہ گئے اور رسول اکرمؐ کے ساتھ اس کی مزید خط و کتابت بھی ہوئی۔ اس طرح خود نجاشی اور حبشہ کے کئی دوسرے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

نجاشی کے اسلام قبول کرنے کا جو پہلا نتیجہ نکلا وہ حبشہ کے ملک اور قوم کی آزادی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے حبشہ کا ملک روم کی نوآبادی تھا۔ اس لیے وہ ہر سال ایک بہت بڑی رقم بطور خراج ادا کیا کرتا تھا۔ لیکن جب نجاشی مسلمان ہو گیا تو وہ شاہ روم کو خراج دینے پر آمادہ نہ ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ آئندہ خراج نہیں دے گا۔

شہنشاہ روم کو اس صورت حال کی اطلاع ملی تو بھی اس نے نجاشی کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا۔ تب اس کے بھائی نے کہا: نجاشی جو تمہارا باجگزار ہے، کیا تم اسے یونہی چھوڑ دینا چاہتے ہو کہ وہ خراج نہ دے اور کسی دوسرے مذہب کا پیرو بن جائے؟

اس نے جواب دیا: نجاشی ایک مذہب کی طرف راغب ہوا ہے اور اس نے وہ مذہب اختیار کر لیا ہے۔ اب میں اس کے بارے میں کیا اقدام کروں؟ خدا کی قسم! اگر میری سلطنت کو خطرہ نہ ہوتا تو میں بھی اسی راستے پر چلتا جس پر نجاشی چل پڑا ہے۔

تاہم کچھ غدار درباری ایسے بھی تھے، جنہوں نے نجاشی کے قبول اسلامؓ کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتے ہوئے لوگوں کو اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کے خلاف زبردست مظاہرے ہونے لگے۔ تب اس نے اس فتنے کو دبانے کے لیے ایک کاغذ پر لکھا:

میں گواہی دیتا ہوں کہ خدائے واحد کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور حضرت محمدؐ اس کے بندے اور رسولؐ ہیں۔ نیز میں یہ گواہی بھی دیتا ہوں کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بندے، رسول اور اس کا مقدس کلمہ تھے جنہیں اس نے مریمؑ پر القا فرمایا۔

پھر اس نے وہ کاغذ اپنے گریبان میں چھپا لیا اور لوگوں کے روبرو آ کر کہا:

اے حبشہ کی قوم! کیا میں ماضی میں تمہارے لیے مہربان ترین شخص نہیں رہا؟

انہوں نے جواب دیا: ہاں، آپ ہم پر مہربان رہے ہیں۔

اس نے کہا: اب تک تمہارے ساتھ میرا سلوک کیسا رہا ہے؟

انہوں نے کہا: آپ کا سلوک بہت اچھا رہا ہے اور ہمیں اس بارے میں کوئی شکایت نہیں ہے۔

اس نے پوچھا: پھر ان تمام مظاہروں کی کیا وجہ ہے؟

انہوں نے جواب دیا: یہ مظاہرے اس لیے ہو رہے ہیں کہ بادشاہ نے عیسائیت کو ترک کر دیا ہے اور کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ

خدا کے بندے ہیں۔
نجاشی نے کہا: تم کیا کہتے ہو؟
انہوں نے جواب دیا: ہم کہتے ہیں کہ عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں۔
پھر نجاشی نے اپنا ہاتھ اس کاغذ پر رکھا جو اس نے گریبان میں چھپا رکھا تھا اور کہا: خدا کی قسم! میں بھی اس بات پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ حضرت عیسیٰؑ ایسے ہی ہیں اور اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہیں۔ (تاہم اس کی مراد وہ چیز تھی جو اس نے کاغذ پر لکھی تھی نہ کہ وہ جو مظاہرین کہہ رہے تھے)۔ اس کا یہ اعلان سن کر لوگ مطمئن ہو کر وہاں سے چلے گئے اور اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔
یوں نجاشی دشمن ان غدار درباریوں کا منصوبہ خاک میں مل گیا اور خدائے تعالیٰ نے اسے مخالفین کے شر سے صاف صاف بچا لیا۔

رسول اکرمؐ نے دوسرا خط خسرو پرویز شہنشاہِ ایران کے نام اس طرح لکھا:
خط کا ترجمہ: خدا کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔
یہ خط محمد رسول اللہؐ کی طرف سے ایران کے سلطان کسریٰ کے نام ہے۔ سلامتی ہے اس شخص کے لیے جو ہدایت کی راہ پر چلے، خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے اور گواہی دے کہ خدائے واحد کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے۔ وہ لاشریک اور بے مثل ہے اور محمدؐ اس

کے بندے اور رسولؐ ہیں۔ میں تمہیں اسلام اور کلمۂ حق کی جانب دعوت دیتا ہوں۔ کیونکہ میں خدا کا وہ رسولؐ ہوں جسے تمام قوموں کی رہنمائی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ باضمیر لوگوں کو خدا کے دردناک عذاب سے ڈراؤں۔ تاکہ مردہ دل اور افسردہ روح لوگوں کے سامنے حقیقت واضح کر دینے سے ان پر حجت تمام ہو جائے۔

اے بادشاہ ایران! تم دعوت حق قبول کرو اور اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کر دو۔ تاکہ دنیا اور آخرت کے عذاب سے محفوظ رہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجوسیوں کی گمراہی کی ذمہ داری تمہاری گردن پر ہو گی۔

محمد رسول اللہؐ

یہ خط عبداللہ بن خدافہ سہمی کی معرفت ایران کے دربار میں بھیجا گیا۔

ان دنوں دوسرے ممالک کی طرح ایران کے حالات بھی ناگفتہ بہ تھے۔ کسی طرف سے بھی امید کی روشنی نہیں چمکتی تھی اور نجات کی بو نہیں آتی تھی۔ خیر کے تمام راستے مسدود اور نیکی کے تمام راستے بند تھے۔ اسی دوران میں ایک ستارہ چمکا اور ہر طرف روشنی پھیل گئی اور قوموں کی نجات کے لیے ایک غیبی ہاتھ آگے بڑھا۔ یعنی رسول اکرمؐ بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لیے مبعوث ہوئے اور اب خوش بختی کا قاصد ایران کی طرف گامزن ہوا۔

رسول اکرمؐ کا یہ نمائندہ بڑی تکالیف اٹھا کر شاہِ ایران کے دربار میں پہنچا۔ یہ وہ دربار تھا جو اس زمانے میں شان و شوکت اور خوبصورتی کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔

عبداللہ نے درباریوں کو اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا تو انہوں نے اس کی اطلاع بادشاہ کو پہنچا دی۔ تب اس نے ایک خاص مجلس آراستہ کرائی اور پھر رسول اکرمؐ کے نمائندے کو وہاں آنے کی اجازت دیدی۔

لیکن جب عبداللہ بن حذافہ ایران کے بادشاہ کی مجلس میں آئے تو انہوں نے بادشاہ کے سامنے دوسرے لوگوں کی طرح فروتنی اور خاکساری کا اظہار نہیں کیا۔ اس پر خسرو پرویز نے حاضرین میں سے ایک شخص کو اشارہ کیا کہ وہ رسول اکرمؐ کا خط عبداللہ سے لے لے لیکن انہوں نے کہا کہ میں آنحضرتؐ کی طرف سے اس کام پہ مامور ہوں کہ یہ خط بادشاہ کے ہاتھ میں دوں۔ اس لیے میں یہ خط کسی اور کو نہیں دوں گا۔ بادشاہ نے یہ بات مان لی اور عبداللہ نے آگے بڑھ کر خط اس کے ہاتھ میں دیدیا۔

بادشاہ نے وہ خط عبداللہ سے لے لیا اور دربار کے مترجم کو اس کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ خط کی پہلی سطر یعنی "یہ خط ہے محمد رسول اللہؐ کی طرف سے ایران کے کسرائے عظیم کے نام ۔ ۔ ۔ ۔" شاہ ایران کے لیے اس سے زیادہ ناگوار جملہ اور کوئی نہ تھا کہ کوئی شخص اپنا نام اس کے نام پہ مقدم رکھے۔ اس پر اسے سخت طیش آیا اور وہ اتنا غضبناک ہوا کہ چلا کر کہنے لگا: اس خط کا لکھنے والا کون ہے، جس نے

اپنا نام ہمارے نام پر مقدم رکھا ہے؟ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ خط مترجم کے ہاتھ سے لے لیا اور پارہ پارہ کر دیا۔ گویا اس نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ خط آخر تک پڑھا جائے اور اس کے مضمون کا پتا چلے۔

اس کے ساتھ ہی خط لانے والے کو بھی مجلس سے نکال دیا گیا۔ یوں خسرو پرویز نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور وہ اپنے کبر و نخوت کے باعث حقیقت کو سمجھنے اور نیک بختی کی راہ پر چلنے سے باز رہا۔

اندریں حالات عبداللہ نے مدائن میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور وہ فوراً ہی مدینہ روانہ ہو گئے۔ جب وہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں پہنچے تو سارا ماجرا کہہ سنایا۔

رسول اکرمؐ کو خسرو پرویز کے اس ناپسندیدہ رویے پر بہت دکھ ہوا اور آپ نے ان الفاظ میں دعا مانگی:

> اے پروردگار! ہمارا خط پھاڑنے کی سزا میں اس کی بادشاہی اور سلطنت کا شیرازہ بکھیر دے۔

رسول اکرمؐ کے نامۂ مبارک کو چاک کرنے کے علاوہ خسرو پرویز نے ایک اور حرکت بھی کی، جو اس کے مقدر پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہی۔ وہ یہ کہ ان دنوں یمن بھی ایران کے ماتحت تھا۔ اس نے شاہِ یمن کو ایک خط لکھا کہ جس کا مضمون یہ تھا:

> قریش مکہ میں سے ایک آدمی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ اس نے مجھے ایک خط بھیجا اور اس میں اپنا نام میرے نام سے پہلے لکھا ہے۔ لہٰذا یہ خط ملتے ہی تم

اپنے دو آدمی اس کے پاس بھیجو، تاکہ وہ اسے معافی مانگنے
کو کہیں۔ پھر اگر وہ معافی مانگنے سے انکار کرے تو وہ آدمی
اس کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دیں۔

جب یمن کے بادشاہ باذان کو شہنشاہ ایران کا فرمان پہنچا تو اس نے اپنے ایک درباری بابویہ کو جو مرد شمشیر زن اور صاحب قلم تھا رسول اکرمؐ کے نام ایک خط اور خسرو پرویز کا فرمان دے کر خرخسرہ نامی ایک ایرانی کے ہمراہ حجاز بھیجا۔ اس ضمن میں اس نے بابویہ سے یہ بھی کہا: "جو کام تمہارے سپرد کیا گیا ہے، اسے انجام دینے میں انتہائی ہوشیاری سے کام لینا اور محمدؐ کے بارے میں اچھی طرح چھان بین کرنا۔ اگر تم سمجھو کہ وہ جھوٹا اور مکار ہے تو اسے گرفتار کر کے ایران کے دربار میں بھیج دینا۔ لیکن اگر تم اسے راستباز پاؤ تو پھر مجھے اطلاع دے دینا۔

چنانچہ بابویہ اور اس کا ساتھی پہلے مکہ گئے اور وہاں سے مدینہ پہنچے۔ جہاں وہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تب بابویہ نے آنحضرتؐ کو بتایا کہ شہنشاہ ایران نے یمن کے بادشاہ کو حکم دیا ہے کہ وہ آپ کو دربار ایران میں بھیج دے۔ اب اگر آپ اس حکم کی اطاعت کرتے ہیں تو یمن کا بادشاہ خسرو پرویز کو مطلع کر دے گا تاکہ وہ معاف کر دے، لیکن اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا خود کو ھلاکت میں ڈالیں گے۔ کیونکہ شہنشاہ ایران کی فوجی طاقت کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔

تاہم رسول اکرمؐ نے ان دھمکیوں کی کوئی پروا کیے بغیر ان دونوں

قاصدوں کو اسلام کی دعوت دی اور انہیں قرآن مجید کی وہ آیتیں پڑھ کر سنائیں جن میں بہشت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذاب کا ذکر تھا۔ اگرچہ انہوں نے وہ دعوت قبول نہ کی لیکن آنحضرتؐ سے بات چیت کرتے ہوئے وہ آپ سے بے حد مرعوب ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے بار بار یہ کہا اگر آپ ہمارے ساتھ دربار ایران چلنے پر تیار نہیں ہیں تو ہمیں یمن کے بادشاہ کے خط کا جواب لکھ دیں تاکہ ہم اپنے ملک کو لوٹ جائیں۔

پھر چند دن کے بعد آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا: تم لوگ کل صبح میرے پاس آنا' تاکہ میں تمہیں کچھ بتا سکوں۔ چنانچہ دوسرے دن وہ آپ سے کوئی جواب پانے کی امید میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تب حضورؐ نے فرمایا: گزشتہ رات میرے پروردگار نے تمہارے فرمانروا کو اس کے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل کروا دیا ہے۔ ہاں! اب تم لوگ یمن واپس چلے جاؤ اور اپنے بادشاہ کو بتا دو کہ جلد ہی ہمارا دین کسریٰ بادشاہوں کی مملکتوں پر غالب آجائے گا۔ اگر وہ ہمارا دین قبول کرے تو اس کی سلطنت ہمیشہ قائم رہے گی ورنہ اسے جان لینا چاہیے کہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو خسرو پرویز کا ہوا ہے۔

بابویہ جو ایک سمجھدار شخص تھا' یہ باتیں سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ تاہم اس نے رسول اکرمؐ کے ارشادات بمعہ تاریخ کے ایک کاغذ پر لکھ لیے اور پھر اپنے ایرانی ساتھی کے ہمراہ حجاز سے یمن روانہ ہو گیا۔

جب وہ یمن کے بادشاہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے تمام واقعات اس کے گوش گزار کیے۔ بادشاہ نے ان سے آنحضرتؐ کی بود و باش کے بارے میں سوال کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا محمدؐ نے کوئی دربان وغیرہ بھی رکھے ہوئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: نہیں! ان کا کوئی محافظ یا دربان نہیں ہے اور وہ بے حد سادہ زندگی گزارتے ہیں لیکن ان کا رعب اور وقار ایسا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اگرچہ وہ بادشاہوں کے زمرے میں شامل نہیں ہیں لیکن ہم نے کسی بادشاہ کو بھی ان جیسا باعظمت اور باوقار نہیں دیکھا۔

باذان نے کہا: محمدؐ کے بارے میں تم نے جو کچھ کہا ہے' اس کے مطابق میں انہیں خدا کا پیغمبر سمجھتا ہوں' لیکن پوری طرح مطمئن ہونے کے لیے میں کچھ اور انتظار کروں گا تاکہ یہ دیکھ لوں کہ انہوں نے خسرو پرویز کے قتل ہو جانے کی جو خبر دی ہے وہ درست ہے یا نہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے اگر وہ صحیح ہے تو وہ یقیناً خدا کے رسولؐ ہیں لیکن اگر وہ غلط ہے تو پھر میں ان کے بارے میں مزید سوچ بچار کے بعد ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔

تاہم یمن کے بادشاہ کو کچھ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ چند دن بعد ہی اسے خسرو پرویز کے بیٹے شیرویہ کا یہ خط ملا:

> میں نے ملک اور قوم کے مفاد کی خاطر اپنے باپ کو قتل کر دیا ہے۔ کیونکہ اس نے ملک کے سربرآوردہ اشخاص کو قتل کروایا اور قوم میں پھوٹ ڈال دی تھی۔ تمہیں چاہیے کہ یہ خط ملتے ہی یمن کے لوگوں سے میرے لیے بیعت

حاصل کرو۔ جہاں تک اس شخص کا تعلق ہے کہ جس نے حجاز میں دعوائے نبوت کیا ہے اور میرے باپ نے تمہیں اسے گرفتار کرنے کا حکم دیا تھا، اب اس کے خلاف کوئی اقدام نہ کرو اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔

اس خط میں خسرو پرویز کے قتل کی جو تاریخ لکھی تھی، وہ وہی تھی جو رسول اکرمؐ نے باذان کے نمائندوں کو بتائی تھی۔ یعنی اس کو سہ شنبہ دس ربیع الاول ۷ھ کو آدھی رات کے وقت قتل کیا گیا تھا۔

اس خط کے بعد کوئی شک و شبہ باقی نہ رہا اور یمن کے بادشاہ نے خلوص دل سے اسلام قبول کر لیا۔ نیز کئی دوسرے ایرانی جو یمن میں قیام پذیر تھے، وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ پھر وہ یمن کے بادشاہ کے حکم سے ایک وفد کی شکل میں مدینہ آئے اور رسول اکرمؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ جب یمن کا بادشاہ مسلمان ہو گیا تو اسے ایران کے تسلط سے نجات مل گئی اور اس کا ملک آزادی اور خود مختاری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی جانب سے سربراہان حکومت کو جو خطوط لکھے گئے، ان میں سے ایک خط قیصر روم ہرقل کے نام تھا، جس کا متن یہ تھا:

خط کا ترجمہ: خدا کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔
یہ خط محمد رسول اللہؐ کی طرف سے قیصر روم ہرقل کے نام ہے۔
سلام اس پہ جو ہدایت کی راہ پہ چلے اور اس کی پیروی کرے۔

بعدہٗ میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ تم اسلام قبول کرو تاکہ دنیا اور آخرت کی مصیبتوں سے محفوظ رہو۔ پھر خدا بھی تمہیں دوہرا اجر (یعنی عیسٰی ابن مریمؑ پر ایمان لانے اور اسلام قبول کرنے کی بنا پر) دے گا۔ اگر تم اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کرو گے تو تمہاری قوم کی گمراہی کا گناہ بھی تمہارے ہی کندھوں پر ہوگا۔

اے توریت اور انجیل کی پیروی کرنے والو! اس کلمے کی طرف آؤ جو ہمارے تمہارے لیے مورد قبول ہے۔ یعنی ہم خدائے تعالیٰ کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں۔ کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو ربوبیت کا درجہ نہ دے۔ اگر تم اس دعوت سے روگردانی کرو تو بھی گواہ رہو کہ ہم مسلمان اسی عقیدے پر قائم ہیں۔

محمد رسول اللہؐ

یہ خط دحیہ بن خلیفہ کلبی کے ہاتھ بھیجا گیا۔ وہ رسول اکرمؐ کے حکم سے پہلے حاکم بصریٰ کے پاس گئے، جو شام کے تابع تھا۔ اس نے عدی بن حاتم کو ان کے ہمراہ کرکے ان دونوں کو روم کے بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔

وہ دونوں قیصر روم کے دربار میں پہنچے تو انھوں نے اپنا تعارف کرایا اور اس سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ چنانچہ امرائے دربار

وہاں کے کچھ آداب و رسوم کے بعد انہیں بادشاہ کے پاس لے گئے۔ تب دحیہ آگے بڑھے اور وہ خط قیصر کے ہاتھ میں دیدیا۔

بادشاہ نے خط لیتے ہی حکم دیا کہ اس کا ترجمہ کیا جائے۔ اس وقت مترجم نے پہلے جملے کا ترجمہ کیا جو یوں تھا:

"یہ خط محمد رسول اللہ ؐ کی جانب سے قیصر روم ہرقل کے نام ہے"۔

بادشاہ کا بھتیجا جو ایک ناسمجھ اور خود پسند شخص تھا، یہ سن کر طیش میں آگیا کہ پیغمبر اسلام ؐ نے اپنا نام بادشاہ کے نام سے پہلے لکھا ہے چنانچہ اس نے جھپٹ کر مترجم کے ہاتھ سے وہ خط لے لیا تاکہ اسے پھاڑ دے۔

قیصر کو اپنے بھتیجے کی یہ گستاخانہ حرکت بری لگی، اس نے اسے سرزنش کی اور کہا: بیٹے! تم ایک چھوٹے احمق یا بڑے دیوانے ہو۔ کیا تم وہ خط پھاڑ دینا چاہتے ہو، جس کا ابھی ترجمہ بھی نہیں ہوا اور مجھے یہ بھی علم نہیں کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ خدا کی قسم! اگر اس خط کا لکھنے والا خدا کا پیغمبر ہے تو اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنا نام میرے نام سے پہلے لکھے۔

اس اثنا میں مترجم نے خط کے باقیماندہ حصے کا ترجمہ بھی کر دیا۔ اس وقت ایک عیسائی عالم بھی دربار میں موجود تھا۔ اس نے خط کے مندرجات سن کر بلند آواز سے کہا:

خدا کی قسم! یہ وہی پیغمبر ہے جس کی خبر حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت عیسیٰ ؑ نے دی اور جس کا ہم ایک مدت سے انتظار کرتے رہے ہیں۔ تب قیصر اس عالم کی طرف متوجہ ہوا اور رسول اکرم ؐ کے خط کے بارے میں اسکی رائے طلب کی۔ اس نے جواب دیا: میں ذاتی طور پر محمد ؐ کی تصدیق کیساتھ انکی پیروی بھی کرتا ہوں۔

قیصر نے کہا: مجھ پر بھی یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ محمد بن عبداللہؐ وہی موعود پیغمبرؐ ہیں جن کا عیسائی انتظار کررہے ہیں لیکن فی الحال مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ ان کی پیروی کروں۔ اگر میں ان کا دین قبول کروں تو سلطنت میرے ہاتھ سے نکل جائے گی اور رومی مجھے زندہ بھی نہیں رہنے دیں گے۔

اگرچہ قیصر کو رسول اکرمؐ کی سچائی کا یقین آگیا تھا، تاہم اس نے مزید اطمینان کے لیے کچھ اور اقدامات بھی کیے۔ چنانچہ اس نے آنحضرتؐ کے بارے میں رومیہ کے ایک بزرگ مسیحی عالم کو ایک خط لکھا۔ اس نے جواب میں لکھا کہ بلاشبہ محمد بن عبداللہؐ وہی موعود پیغمبر ہیں جن کا یہودی اور عیسائی انتظار کررہے ہیں۔ لہٰذا تمہیں چاہیے کہ ان کی تصدیق کرو اور ان پر ایمان لاؤ۔

علاوہ ازیں قیصر نے اپنے ایک وزیر کو حکم دیا کہ وہ شام و فلسطین کے شہروں میں حجاز کے لوگوں کی جستجو کرے اور ان میں سے کسی کو لے آئے۔ جس سے وہ محمدؐ کے بارے میں معلومات حاصل کرسکے۔

اتفاق کی بات ہے کہ قیصر کے اہلکاروں کی ملاقات معاویہ کے باپ ابوسفیان سے ہوگئی، جو رسول اکرمؐ کا جانی دشمن تھا۔ وہ مکہ کے کچھ لوگوں کے ساتھ تجارت کی غرض سے شام آیا ہوا تھا۔ چنانچہ قیصر کے کارندے ان سب کو دربار میں لے گئے۔

قیصر روم اپنے تخت پر بیٹھا تھا اور ملک کے کچھ ممتاز افراد بھی وہاں موجود تھے۔ جب مکہ کے لوگ دربار میں آئے تو انہوں نے شاہی رسوم کے مطابق بادشاہ کو سجدہ کیا۔ تب قیصر نے اپنے مترجم

کے ذریعے ان لوگوں سے پوچھا: وہ محمدؐ کہ جنہوں نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے، تم میں سے کون ان کا رشتہ دار ہے؟

یہ سن کر ابوسفیان نے کہا: میں ان کا رشتہ دار ہوں اور وہ قبیلہ میں میرے چچیرے بھائی ہیں۔

اس پر قیصر نے ابوسفیان کو اپنے نزدیک بلایا اور دوسرے عربوں کو اس کے پیچھے کھڑے رہنے کا حکم دیا۔ پھر قیصر نے اپنے مترجم کی زبانی ان سے کہا: میں نے تمہیں یہاں اس لیے کھڑا کیا ہے کہ اگر ابوسفیان اپنی گفتگو میں غلط بیانی سے کام لے تو تم اسے ٹوک دو اور اس بات کا خیال رکھو کہ وہ جھوٹ نہ بولنے پائے۔

چنانچہ قیصر نے مترجم کے توسط سے درج ذیل سوالات کیے:

قیصر: جس شخص نے دعوائے نبوت کیا ہے اور مجھے خط لکھا ہے، اس کا حسب و نسب کیا ہے؟

ابوسفیان: ہماری قوم میں محمدؐ بن عبداللہ کا حسب و نسب بہت بلند ہے اور ان کا تعلق ایک اعلیٰ اور شریف خاندان سے ہے۔

قیصر: کیا حجاز میں محمدؐ سے پہلے بھی کچھ لوگوں نے دعوائے نبوت کیا ہے یا نہیں؟

ابوسفیان: نہیں! ان کے علاوہ کسی شخص نے بھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا۔

قیصر: محمدؐ نے تمہارے معاشرے میں اس سے پہلے کس طرح دن گزارے۔ تم لوگ انہیں جھوٹا سمجھتے تھے یا سچا؟

ابوسفیان: جہاں تک ان کی پہلی زندگی کا تعلق ہے، وہ اپنی

نیکی اور سچائی کے لیے مشہور رہے ہیں اور کسی نے ان سے جھوٹی یا غلط بات کبھی نہیں سنی۔

قیصر: کیا ان کے آباو اجداد میں کوئی بادشاہ بھی گزرا ہے یا نہیں؟

ابوسفیان: نہیں! ان کے آباو اجداد میں سے کوئی بادشاہ نہیں ہوا۔

قیصر: عقل و ہوش کے لحاظ سے محمدؐ کیسے ہیں؟

ابوسفیان: عقل و ہوش کے لحاظ سے ان میں کوئی عیب نہیں نکالا جا سکتا اور وہ ایک عقلمند انسان ہیں۔

قیصر: جو لوگ ان پر ایمان لائے ہیں ان کا تعلق کس طبقے سے ہے؟ کیا وہ دولتمند اور سربرآوردہ اشخاص ہیں یا مزدور پیشہ اور محروم لوگ ہیں؟

ابوسفیان: ان کے پیرو نادار اور کمزور لوگ ہی ہیں۔

قیصر: روز بروز ان کے پیروؤں میں اضافہ ہو رہا ہے یا کمی واقع ہو رہی ہے؟

ابوسفیان: جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے محمدؐ کے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

قیصر: کیا کوئی ایسا شخص بھی ہے جو ان سے وابستہ ہو کر بعد میں ان کے دین سے پھر گیا ہو اور ان کی برائی کرتا ہو یا سب کے سب ان کی پیروی میں ثابت قدم ہیں؟

ابوسفیان۔ ان کا کوئی پیرو اپنے دین سے نہیں پھرتا، حتیٰ کہ

دشمنوں کے ہاتھوں شدید تکلیفیں اٹھا کر بھی وہ اپنے عقیدے پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔

قیصر: کیا محمدؐ اپنے عہد و پیمان کی پابندی کرتے ہیں؟ اور کیا وہ اپنے کام کو آگے بڑھانے کی خاطر دھوکے اور فریب سے کام لیتے ہیں یا نہیں؟

ابوسفیان: وہ اپنے معاملات میں کسی بھی طرح کے مکر و فریب سے کام نہیں لیتے۔ آجکل ہم نے بھی ان سے ایک معاہدہ (حدیبیہ) کر رکھا ہے۔ لیکن اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ انکا طرزِ عمل کیا ہوگا۔

قیصر: تمہارے اور ان کے درمیان جو لڑائیاں ہوئی ہیں ان کا کیا نتیجہ نکلتا رہا ہے؟

ابوسفیان: بعض جنگوں میں ہماری فتح ہوئی ہے اور بعض میں ان کی ہوئی ہے۔ ایک دفعہ وہ جنگ بدر میں ہم پر غالب آئے، لیکن میں اس جنگ میں شامل نہ تھا۔ تاہم ایک اور جنگ (احد) میں ہم نے ان کے شہر پر حملہ کیا تو ان کے بہت سے ساتھیوں کو قتل کیا اور ان کے پیٹ چاک کر دیے۔

قیصر: محمدؐ لوگوں کو کس چیز کی دعوت دیتے ہیں اور انکی دعوت کی بنیاد کن اصولوں پر قائم ہے؟

ابوسفیان: وہ کہتے ہیں: ایک خدا کی پرستش کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ نماز پڑھو، زکات دو، سچ بولو، محتاجوں کی مدد کرو اور پاکدامن رہو۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنے عہد و پیمان کو پورا

کرو اور امانتوں کی ادائیگی میں کوتاہی نہ برتو۔

اس مرحلے پر قیصر کے سوالات کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ پھر اس نے اپنے مترجم کے ذریعے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ سوالات پوچھنے میں اس کا کیا مقصد تھا۔

اس نے کہا: میں نے محمدؐ کے حسب و نسب کے بارے میں پوچھا اور تم نے موافق جواب دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء کے لیے لازم ہے کہ وہ شریف خاندانوں سے تعلق رکھتے ہوں۔

پھر میں نے پوچھا ہے کہ کیا ان سے پہلے بھی کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر ان سے پہلے کسی نے ایسا دعویٰ کیا ہے تو ممکن ہے کہ محمدؐ نے بھی اس کی نقل کی ہو۔

پھر میں نے ان کی راستگوئی کے بارے میں پوچھا تو تم نے ان کی راستگوئی کی تصدیق کردی۔ میرے اس سوال کی غرض یہ تھی کہ اگر کوئی شخص روزمرہ زندگی کے معاملات میں جھوٹ نہیں بولتا تو وہ خدا کے بارے میں قطعاً کوئی جھوٹی بات نہیں کہے گا۔

میں نے تم سے یہ بھی پوچھا کہ ان کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ تو نہیں گزرا۔ اس سوال کا مطلب یہ تھا کہ اگر کسی شخص کے باپ دادا میں سے کوئی بادشاہ ہوا ہو تو ممکن ہے کہ اس پر بادشاہت کی دھن سوار ہو اور وہ اپنی آبائی میراث حاصل کرنا چاہتا ہو۔

علاوہ ازیں میں نے ان کے پیروؤں کی بابت اس لیے پوچھا کہ انبیاءؑ کی پیروی کرنے والے اکثر و بیشتر لوگ معاشرے کے محروم اور کمزور طبقے ہی سے ہوتے ہیں۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ کی معرفت کے معاملے

میں اس طبقے کے لوگ دوسرے طبقوں کے مقابلے میں ہمیشہ اور ہر زمانے میں پیش پیش رہے ہیں۔

میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ آیا محمدؐ کے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پیغمبروں کی دعوت ہمیشہ ترقی کرتی ہے۔ تاکہ وہ اپنی رسالت کے فریضے کو خوش اسلوبی سے انجام تک پہنچا سکیں۔

میں نے ایک اور سوال محمدؐ کے طرزِ عمل کے بارے میں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خدا کے پیغمبروں کو دھوکے اور فریب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اسی طرح تمہاری اور ان کی لڑائیوں کے نتائج کے متعلق پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ پیغمبر کبھی غالب آتے ہیں اور کبھی مغلوب ہو جاتے ہیں لیکن حقیقی کامیابی اور آخری فتح انہیں کو نصیب ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں میں نے تم سے ان کی تعلیمات کے بارے میں پوچھا اور تم نے ان کی جو تفصیل بیان کی، اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ محمدؐ خدائے تعالیٰ کے رسولؐ ہیں۔ کیونکہ تمام انبیاءؑ لوگوں کو نیکی اور پاکیزگی کی طرف دعوت دیتے ہیں اور گناہوں اور برائیوں سے منع کرتے ہیں۔ ہاں! جو کچھ تم نے ان کے بارے میں بتایا ہے اگر وہ درست ہے تو زیادہ مدت نہیں گزرے گی کہ وہ اس تخت کے مالک بن جائیں گے جس پر اب میں بیٹھا ہوں۔ اگرچہ مجھے علم تھا کہ انبیاء کے سلسلے میں ایک نبی کو ابھی آنا ہے، لیکن میرا یہ خیال نہ تھا کہ وہ نبی تم لوگوں میں سے مبعوث ہوں گے۔ تاہم اگر میرے لیے ممکن ہوتا تو میں انکی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل کرتا اور انکے پاؤں دھو کر بیحد فخر محسوس کرتا۔

چنانچہ اس مجلس میں شاہِ روم نے کھلے لفظوں میں رسول اکرمؐ سے اپنی محبت اور وابستگی کا اظہار کیا اور آپ کی نبوت کو تسلیم کیا۔ اس کے بعد بھی اس نے عیسائی علمار سے اسلام قبول کرنے کے بارے میں گفتگو کی اور چند مواقع پر رومی قوم کے سامنے اسلام کا تذکرہ کیا۔ تاہم عیسائی علمار نے اسے اسلام کی جانب مائل ہونے سے منع کر دیا اور ناسمجھ رومی قوم نے ہنگامے بپا کرنے شروع کر دیے۔

ان حالات میں ہرقل نے اپنے تخت کی حفاظت کے لیے اسلام اور مسلمانوں سے لڑائی کا آغاز کر دیا۔ جیسا کہ بعض مؤرخین کا خیال ہے' اس نے کئی ایک نگہبان مقرر کر دیے تاکہ وہ راستوں کی نگرانی کریں اور لوگوں سے اور بالخصوص رؤسا اور سربرآوردہ اشخاص سے پیغمبرِ اسلام کے رابطوں میں رکاوٹ ڈالیں۔

رسول اکرمؐ کا ایک قاصد حارث بن عمیر ازدی شام کے نزدیک واقع مقام موتہ میں شاہ روم کے عامل شرجیل بن عمرو غسانی کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور مار ڈالا گیا۔ جب رسول اکرمؐ کو حارث کے مارے جانے کی خبر ملی تو آپ کو بے حد رنج ہوا اور آپ نے بھی اس کے قاتلوں سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے نتیجے میں جنگ موتہ وقوع پذیر ہوئی جس کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا۔

ایک اور خط جو خدا کے رسول محترمؐ کی جانب سے بھیجا گیا وہ پاپائے اعظم کے نام تھا۔ عیسائیوں کے کیتھولک فرقے کے پیشوا اور سربراہ کا لقب پوپ ہے جس کا مآخذ یونانی لفظ "پاپاس" ہے۔ جو باپ کے معنی میں ہے۔

عیسیٰ ابن مریمؑ کے عروج کے وقت سے لے کر ۱۲۶ء تک کلیسا کی سربراہی اور روحانی پیشوائی کے لیے یکے بعد دیگرے پوپ منتخب ہوتے رہے اور ان کا عمل دخل فقط دینی امور تک محدود ہوتا تھا لیکن اس کے بعد پوپ نے سیاسی امور میں بھی دخل دینا شروع کر دیا اور وہ فرمانرواؤں کے انتخاب یا معزولی میں اپنا کردار ادا کرنے لگا، جیسا کہ صلیبی جنگیں جو مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان دو سو سال تک جاری رہیں، وہ پوپ ہی کی تحریک پر شروع ہوئی تھیں۔

مختصر یہ کہ پوپ عیسائیوں کی زندگی کے تمام شعبوں میں غیر ضروری دخل دیتا اور بالخصوص ان علماء، اور ان کے نظریات کے خلاف بڑا سخت رویہ رکھتا تھا، جو انجیل سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ علماء کے خیالات پر قدغن لگانے کے لیے عقائد کی تفتیش کا محکمہ (INQUISITION) وجود میں آیا اور بہت سے علماء اپنے علمی نظریات کی بنا پر کلیسا۔ پوپ اور اس خطرناک محکمے کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ آخر کار علم و دانش کی ترقی کے مقابلے میں کلیسا نے مات کھائی اور پوپ نے دوبارہ اپنا پہلا منصب سنبھال لیا۔ یعنی اس کا عمل دخل فقط دینی امور تک محدود ہو گیا اور سیاست اور امور مملکت سے اس کا تعلق منقطع ہو گیا۔

۱۳۰۹ء تک پوپ کی فرمانروائی کا مرکز شہر روم تھا لیکن پوپ کلمان پنجم نے روحانی پیشوائی کا صدر مقام فرانس کے شہر آوینیون میں منتقل کر دیا۔

لیکن ۱۳۷۷ء میں جب پوپ گروار یازدہم لوگوں کو دین کی دعوت

دینے کے لیے روم گیا اور اس کا انتقال ہوگیا تو آوینیون کے شہریوں نے ایک نیا پوپ منتخب کر لیا۔ اُدھر روم میں بھی ایک پوپ کا انتخاب عمل میں آیا اور یوں ۷۱ سال تک ان دو شہروں کے پوپوں کے درمیان اختلاف اور جھگڑا موجود رہا۔ نیز مسیح کے پیرو بھی دو فرقوں یعنی کیتھولک اور پروٹسٹنٹ میں بٹ گئے، جس سے کلیسا کی طاقت اور بھی گھٹ گئی۔

رسول اکرمؐ کے زمانے میں عیسائیوں کا مذہبی پیشوا ضغاطر نامی ایک عالم تھا جسے "اینور" ENOR کہا جاتا تھا اور دوسرے عیسائی علماء اس کی پیروی کرتے تھے۔ اسے عیسائیوں کے تمام طبقوں میں مکمل اثر و رسوخ حاصل تھا۔ حتیٰ کہ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ لوگوں کی نظروں میں تو وہ روم کے بادشاہ سے بھی زیادہ معزز اور قابل احترام تھا۔ رسول اکرمؐ کی جانب سے جو خط قیصر روم کو بھیجا گیا، اس کے ساتھ ہی ایک خط پاپائے اعظم ضغاطر (اسکوتر) کو بھی لکھا گیا اور یہ دونوں خط دحیہ کلبی کے ہاتھ ارسال کیے گئے۔ خط کا متن یہ تھا:

> سلام ہو اس شخص پر جو خدا پر ایمان لائے۔ سلام کے بعد واضح ہو کہ بلاشبہ عیسیٰ بن مریمؑ خدائے تعالیٰ کی روح اور مقدس کلمہ ہیں، جنہیں اس نے پاکدامن مریمؑ پر القا فرمایا۔ میں ایمان رکھتا ہوں خدا پر اور اس پر جو اس کی جانب سے ہم پر اور ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور اسباط پر نازل ہوا ہے۔ نیز میں ایمان رکھتا ہوں اس پر جو خدا کی طرف سے حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور دوسرے نبیوں کو دیا گیا ہے۔ ہم خدا کے

پیغمبروں کے درمیان فرق نہیں کرتے اور خدائے تعالیٰ کی متابعت کرتے ہیں۔ سلام ہے اس پر جو ہدایت کے راستے پر ثابت قدم رہے۔

اس خط میں رسول اکرمؐ نے فقط جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرنے اور حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کا حقیقی مقام بیان کرنے پر اکتفا فرمایا ہے۔ آپ نے دوسرے مسائل کو چھیڑا تک نہیں۔ تاہم اسی مختصر خط نے پاپائے اعظم کے دل پر گہرا اثر کیا۔

جب قاصد نے وہ خط پاپائے اعظم کے ہاتھ میں دیا تو اس نے اسے پڑھنے کے بعد قدرے تامل کیا اور پھر رسول اکرمؐ کے سفیر سے کہا:

خدا کی قسم! تمہارا صاحب نبی مرسل ہے اور ہم عیسائی اسے اس کے اوصاف سے پہچانتے ہیں کیونکہ ہماری کتاب میں اس کا نام اور اوصاف موجود ہیں۔

اس کے بعد پوپ نے صاف ستھرا لباس پہنا اور عصا ہاتھ میں لیے کلیسا میں آیا۔ وہاں جو لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے وہ احترام کے تمام مراسم بجا لائے۔ تب پوپ عصا کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور اس نے بڑے وثوق سے کہا:

اے رومیوں کی قوم! ہمارے پاس احمدؐ کا ایک خط آیا ہے، جس میں انھوں نے ہمیں خدا کی طرف دعوت دی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدائے واحد کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اس کے پیغمبر اور رسول ہیں۔

لیکن یہی چند جملے ان نا سمجھ، متعصب اور دنیا پرست لوگوں کو اس

کے خلاف بھڑکانے کے لیے کافی تھے۔ چنانچہ ایک دم شورش بپا ہوگئی اور کلیسا میں تہلکہ مچ گیا۔ یہاں تک کہ اس حقیقت پسند اور خدا پرست بزرگ کو کلیسا کے اندر قتل کر دیا گیا اور یوں اس کا نام اسلام کے شہدأ کی فہرست میں شامل ہوگیا۔

لوگوں کے دلوں میں پوپ کی بے حد عزت اور احترام کے باوجود اس کے قتل ہو جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ روم کا بادشاہ اسلام قبول کرنے سے باز رہا اور اپنے تخت کی حفاظت کی خاطر اس نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔

جنگِ موتہ

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، رسول اکرمؐ کے قاصد کو قتل کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسا جرم تھا جو کسی اخلاقی اور انسانی اصول سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ لہٰذا آنحضرتؐ رومیوں کی اس بزدلانہ حرکت پر بہت مضطرب ہوئے اور آپ کو شرجیل بن عمرو غسانی کے ہاتھوں حارث بن عمیر کے مارے جانے کا بے حد صدمہ ہوا۔ اس لیے آپ نے انتقام لینے کا فیصلہ کیا اور یوں جنگِ موتہ کی بنیاد پڑ گئی۔

چنانچہ جہاد کا حکم دیدیا گیا اور تین ہزار مسلمان محاذِ جنگ پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ تب رسول اکرمؐ نے فوج کی سالاری امام علیؑ کے بھائی جعفرؓ بن ابی طالب کے سپرد کی اور فرمایا:

اگر جعفر کو کوئی گزند پہنچے تو زید بن حارثہ سالارِ لشکر ہوں گے اور اگر انہیں بھی کچھ ہو جائے تو یہ منصب عبداللہ بن رواحہ

سنبھال لیں گے، لیکن اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمانوں کو اختیار ہو گا کہ اپنے لشکر میں سے جس کو چاہیں سپہ سالاری کے لیے منتخب کر لیں۔

جب اسلامی فوج مدینہ سے روانہ ہوئی تو رسول اکرمؐ "ثنیۃ الوداع" تک ان کے ہمراہ گئے۔ وہاں آپ نے تین ہزار افراد پر مشتمل فوج کے سالاروں اور سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

اے اسلام کے سپاہیو! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ تم پرہیزگار اور خوددار رہو جو مسلمان تمہارے ہمراہ ہیں۔ ان کیساتھ اخلاص عدل اور احسان کا برتاؤ کرو۔ اب تم خدا کا نام لو، اس کی مدد کے ساتھ بڑھو اور اپنے اور خدا کے دشمنوں سے مردانہ وار جنگ کرو۔

اس سفر کے دوران تمہارا سامنا ایسے لوگوں سے بھی ہو گا جو خانقاہوں اور عبادت گاہوں میں عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ وہ معاشرے سے الگ تھلگ ہیں اور کسی جماعت اور گروہ سے وابستہ نہیں ہیں۔ پس ہشیار رہنا اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کرنا۔ نہ تو انہیں قتل کرنا اور نہ ہی ان کی عبادت وریاضت میں کوئی رکاوٹ ڈالنا۔

اسی طرح عورتیں ہیں جو آنے والی نسل کو پالنے والی ہیں، انہیں قتل نہ کرنا۔ بچوں کو تلوار کے گھاٹ نہ اتارنا۔ جو درخت لوگوں کے لیے فائدہ مند ہوں انہیں نہ کاٹنا اور جو عمارتیں لوگوں کے لیے آرام وآسائش کا موجب

ہوں انہیں بھی نہ گرانا۔

یہ ہدایات دینے کے بعد فرمایا:

تم اس جگہ تک جاؤ جہاں حارث شہید ہوئے تھے۔ پہلے ان لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دو۔ اگر وہ سرتابی کریں تو ان کے ساتھ جنگ کرو اور سرکشوں کو ان کے برے اعمال کی سزا دو۔

بعدۂ اسلام کے سپاہیوں نے ایمان کی قوت پر بھروسہ کرتے ہوئے مدینہ سے شام کی جانب کوچ کیا اور منزلیں طے کرتے ہوئے معان پر پڑاؤ جا ڈالا۔ شرجیل کو بھی اسلامی فوج کے اجتماع کی خبر مل گئی۔ تاہم اس کا خیال تھا کہ وہ اسلامی فوج کو آسانی سے شکست دیدے گا۔ لہٰذا اس نے حاضر وقت سپاہیوں کو اپنے بھائی سدوس کی کمان میں مسلمانوں کے مقابلے پر بھیجا لیکن وہ جنگ کے ابتدائی مرحلے میں ہی مارا گیا اور اس کے سپاہی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

تب شرجیل نے محسوس کیا کہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے، جتنا کہ اس نے سمجھ رکھا تھا۔ لہٰذا اس نے قیصر روم کو واقعات جنگ کی اطلاع دیتے ہوئے اس سے امداد طلب کی اور خود قلعہ بند ہو گیا۔

اس پر قیصر نے ایک لاکھ جنگجو رومی اور شامی سپاہیوں پر مشتمل فوج تیار کی اور اسے محاذِ جنگ پر بھیج دیا۔ یہ فوج جو کیل کانٹے سے لیس تھی اور اس کی تعداد بھی مسلمانوں سے تیس گنا زیادہ تھی، وہ اس کی آمد سے پریشان ہو گئے اور جنگ کے بارے میں سوچ بچار میں پڑ گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس صورت حال سے رسول اکرمؐ کو مطلع کیا جائے اور ان

سے از سر نو ہدایات حاصل کی جائیں لیکن بعض کا کہنا تھا کہ جنگ شروع کرکے ہمیں اپنا فریضہ مستقل مزاجی اور پامردی سے انجام دینا چاہیے۔

اس وقت اسلامی فوج کے دلاور افسر عبداللہ بن رواحہ (جو بعد میں سالارِ لشکر بنے) نے ایک پر جوش اور ہیجان انگیز تقریر کی اور سارے شکوک و شبہات کا خاتمہ کر دیا۔ انہوں نے کہا:

اے مسلمان سپاہیو! تم اسی چیز سے پہلو تہی کر رہے ہو جس کی خاطر تم وطن سے باہر آئے ہو۔ تم نے یہ سارا سفر اس لیے طے کیا اور یہ تمام تکلیفیں اس غرض سے اٹھائی ہیں کہ شہادت کا مرتبہ حاصل کرو۔ یاد رکھو کہ ہم مسلمانوں نے کوئی جنگ محض کثرت تعداد کے بل بوتے پر نہیں لڑی بلکہ ہماری طاقت بس ہمارا دین ہی ہے کہ جس کے وسیلے سے خدائے تعالیٰ نے ہمیں عزت بخشی اور سرفراز فرمایا ہے۔ لہٰذا آج رومیوں سے جنگ کرنے میں بھی ہم دو برکتوں میں سے ایک ضرور حاصل کریں گے۔ یعنی یا تو ہم ان پر فتح پائیں گے یا خدا کی راہ میں جانیں دے کر شہادت کا شرف حاصل کریں گے۔

عبداللہ کی اس مختصر تقریر سے مسلمان مجاہدوں میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہو گیا اور انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اپنی قلت تعداد کے باوجود جنگ لڑیں گے اور دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائیں گے۔

تب روم کی فوج نے بلقاء کے ایک گاؤں "مشارف" کے قریب اپنی صفیں آراستہ کیں۔ ادھر اسلامی سپاہ نے سرزمین شام میں

"موتہ" کے مقام پر صف بندی کی اور وہی میدان جنگ قرار پایا۔

جب دونوں فوجوں نے ایک دوسرے کے سامنے مورچے سنبھال لیے تو لشکر اسلام کے سالار جعفر بن ابی طالبؓ نے حملے کا حکم دیا اور وہ خود بھی بڑی بے خوفی کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے حملے اتنے سخت تھے کہ دشمن بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ جعفر نے یکے بعد دیگرے دشمن کی صفیں الٹ دیں اور وہ آگے ہی آگے بڑھتے گئے، یہاں تک کہ دشمن کے ٹڈی دل لشکر میں غائب ہو گئے۔ لڑتے لڑتے جب ان کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تو انہوں نے اسلام کا پرچم بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ جب بایاں ہاتھ بھی کٹ گیا تو انہوں نے اس پرچم کو اپنے دونوں بازوؤں میں تھام لیا کہ جن میں سے خون بہہ رہا تھا۔ ان کے بدن پر تقریباً نوے زخم آئے، دونوں ہاتھ کٹ گئے اور بہت زیادہ خون بہہ گیا، اس لیے وہ جنگ جاری نہ رکھ سکے۔ تب دشمنوں نے اس جاں نثار اور سرفروش کی لاش کو نیزے کی انی کے ساتھ اچھالا اور یوں جعفر بن ابی طالبؓ نے بنی نوع انسان کو دلاوری اور ثابت قدمی کا عظیم ترین سبق دیا۔ اسکے ساتھ ہی دوسرے سالار یعنی زید بن حارثہ آگے بڑھے اور اسلام کا پرچم اپنے ہاتھ میں تھام کر دشمن پر شدید حملے کا آغاز کر دیا۔ وہ اتنی بے جگری سے لڑے کہ ان کا نیزہ ٹوٹ گیا۔ لیکن پھر بھی لڑتے رہے اور آخر کار شہید ہو گئے۔ اب تیسرے سردار عبداللہ بن رواحہ کی باری آئی وہ بھی بے جگری سے لڑ کر شہادت پا گئے۔

یہ تین اشخاص جن کو خود رسول اکرمؐ نے سالار لشکر کے طور پر نامزد فرمایا تھا۔ ان کی شہادت کے بعد لازم تھا کہ مسلمان اپنے امیر کا انتخاب کریں۔ چنانچہ خالد بن ولید کہ جو کچھ ہی عرصہ پہلے مسلمان ہوئے تھے، لوگوں کی

نگاہیں ان پر پڑیں اور وہ اسلامی فوج کے سالار چن لیے گئے۔

خالد ایک دلاور اور کار آزمودہ سپاہی تھے اور جنگ کے داؤ پیچ خوب جانتے تھے۔ اس لیے پہلے انہوں نے اسلام کے سپاہیوں کی صفیں ایک خاص طرز پر منظم کیں اور پھر حملے کا حکم دیا۔ اسی طرح اگلے دنوں میں بھی انہوں نے صفیں منظم کرنے میں کچھ نئے طریقے استعمال کیے جس سے دشمن یہ سمجھے کہ مسلمانوں کو تازہ کمک پہنچ گئی ہے۔ یوں وہ موتہ کے شہیدوں کا انتقام لینے کے قابل ہو گئے اور انہوں نے روم کی طاقتور فوج کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔

چنانچہ رومی سپاہ بھاری نقصان اٹھا کر میدان جنگ چھوڑ گئی اور مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا۔ تاہم عام مسلمان اس جنگ کے نتیجے سے خوش نہ تھے۔ کیونکہ اسلامی لشکر نے بہت سی قیمتی جانوں کی قربانی دینے کے باوجود وہ شاندار کامیابی حاصل نہیں کی تھی جو انہیں دوسری جنگوں میں نصیب ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب خالد بن ولید اسلامی سپاہ کے ساتھ مدینے واپس آئے تو رسول اکرمؐ کے ہمراہ لوگوں نے ان کا استقبال کیا لیکن عام مسلمانوں کے چہروں پر پریشانی اور دکھ کے آثار نمایاں تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے خالد اور اس کے سپاہیوں کو علانیہ برا بھلا کہا کہ: اے بھگوڑے سپاہیو! کیا تم خدا کی راہ میں جان دینے سے ڈر گئے تھے؟ کچھ ایسے بھی تھے جو اس سے ایک قدم آگے بڑھ گئے۔ چنانچہ انہوں نے موتہ کی جنگ لڑنے والوں کے چہروں پر مٹی پھینک کر ان سے اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

جیسا کہ ابن ابی الحدید کہتا ہے: کسی بھی اسلامی لشکر کو فوج موتہ

کی طرح توہین اور تحقیر کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ حتیٰ کہ جب ان میں سے بعض سپاہی اپنے گھروں کو گئے تو ان کے گھر والوں نے یہ کہہ کر دروازے بند کر لیے کہ تم بھی دوسروں کی طرح قتل کیوں نہیں ہو گئے۔

پھر گھر اور باہر سے ہونے والی یہ اہانت یہاں تک بڑھ گئی کہ کچھ سپاہی گوشہ نشین ہو گئے۔ آخر کار رسول اکرمؐ نے ان لشکر والوں کی حمایت کی اور فرمایا:

> نہیں! یہ بھگوڑے نہیں ہیں۔ بلکہ جنگجو ہیں، جنہوں نے دشمن کی صفوں پر حملے کیے اور خدا کے دین کی خدمت کی ہے۔

گو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اس جنگ کا نتیجہ کچھ زیادہ خوش آئند نہ تھا، لیکن انہوں نے رومیوں کے دلوں پر گہرا اثر باقی چھوڑا۔ کیونکہ رومیوں کے ایک لاکھ اور بقولے تین لاکھ جنگجو سپاہیوں کے مقابلے میں صرف تین ہزار سپاہیوں کا ڈٹ جانا بجائے خود ایک غیر معمولی بات تھی۔ پھر وہ تو دشمن کو فرار اور پسپائی پر مجبور کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔

یہ ثابت قدمی اور سرفروشی اور یہ کامیابیاں مسلمانوں کے پختہ ایمان اور خدائے تعالیٰ کی عنایات کا نتیجہ تھیں۔ جن کی بدولت وہ قلت تعداد، بہت کم سازوسامان کے باوجود اپنے سے زیادہ طاقتور دشمنوں کو شکستِ فاش سے دوچار کر دیتے تھے۔

ایسا بہت ہوا ہے کہ خدا کے حکم سے چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر غالب آ گئی ہے۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۴۹)

فتح مکہ

معاہدۂ حدیبیہ کہ جس پر ہجرت کے ساتویں سال میں رسول اکرمؐ اور قریش کے نمائندے نے دستخط کیے تھے۔ وہ طرفین کے ایک دوسرے کے ساتھ تعرض نہ کرنے کی بنیاد پر عمل میں آیا تھا۔ اس عہدنامے میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ مسلمانوں کی جانب سے قریش اور انکے حلیفوں پر کوئی زیادتی نہ کی جائے گی۔ نیز قریش بھی مسلمانوں اور ان کے حلیفوں پہ کوئی سختی نہ کریں گے۔

مکہ کے نواح میں بنی خزاعہ اور بنی کنانہ دو قبیلے آباد تھے۔ ان میں سے بنی خزاعہ نے رسول اکرمؐ سے پیمان باندھ رکھا تھا اور بنی کنانہ کو قریش کی حمایت حاصل تھی۔

ایک دن بنی کنانہ کے ایک شخص نے پیغمبر اسلامؐ کی ہجو میں کچھ اشعار کہے اور ان کو سرِ مجلس پڑھنے لگا۔ اس پہ مسلمانوں کے حلیف

بنی خزاعہ کے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس شاعر کو اس حرکت پر ڈانٹا۔ لیکن اس شاعر نے کوئی پروا نہ کی اور بدستور اشعار پڑھتا رہا۔ اس پر خزاعی نوجوان کو سخت طیش آیا۔ چنانچہ اس نے بدزبان شاعر کے منہ پر تابڑ توڑ گھونسے مارے اور اسے زخمی کر دیا۔

بنی کنانہ کے لوگوں کو اپنے شاعر کی اس توہین پر بے حد غصہ آیا لیکن وہ اپنے اندر بنی خزاعہ پر حملہ کرنے کی قوت نہیں رکھتے تھے، اس لیے وہ خفیہ طور پر مکہ گئے اور وہاں جا کر قریش سے مدد مانگی۔ اگرچہ قریش نے رسول اکرمؐ سے عدم تعرض کا معاہدہ کر رکھا تھا، پھر بھی رؤسا قریش نے بنی کنانہ کی مالی مدد کی۔ علاوہ ازیں سہیل بن عمرو، عکرمہ بن ابوجہل، حویطب بن عبدالعزیٰ، صفوان بن امیہ اور مکرز بن حفص جیسے سرکش اور شریر لوگ بھیس بدل کر رضاکارانہ طور پر بنی کنانہ کے ساتھ مل گئے۔ چنانچہ انہوں نے اس قبیلے کے کچھ اشخاص کے ساتھ مل کر بنی خزاعہ پر حملہ کر کے ان کے بیس آدمی قتل کر دیے۔ پھر وہ اس امید کے ساتھ واپس آ گئے کہ ان کی اس دغابازی پر پردہ پڑا رہے گا۔

ابوسفیان جو دوسروں سے زیادہ سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ جب اسے اس حادثے کی خبر ملی تو وہ بہت پریشان ہوا اور کہنے لگا: بلاشبہ یہ خبر محمدؐ تک ضرور پہنچے گی۔ وہ بنی خزاعہ کے خون کو بے ارزش نہیں سمجھیں گے اور خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ اس سے پیشتر کہ محمدؐ کو حالیہ واقعے کی خبر ملے، میں مدینہ جاؤں اور ان سے گفت و شنید کر کے کسی نہ کسی طرح معاہدے کی مدت میں توسیع کرا لوں۔

پھر ابوسفیان اپنے اس ارادے کے تحت مدینہ روانہ ہو گیا لیکن

اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی بنی خزاعہ کے وفد نے عمرو بن سالم کی سرکردگی میں رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر قریش کی عہد شکنی، ان کے حملے اور قتل و غارت کی تفصیل بیان کردی اور رسول اکرمؐ ان سے مدد اور حمایت کا وعدہ کر چکے تھے۔

چند ہی دنوں میں بدیل بن ورقا کی قیادت میں بنی خزاعہ کا دوسرا وفد رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور قریش کی عہد شکنی اور قتل و غارت کی داستان آنحضرتؐ کے گوش گزار کی۔ تب آپ نے فرمایا: اگر میں بنی خزاعہ کی مدد سے ہاتھ کھینچوں تو خدا بھی میری مدد نہ کرے۔

ادھر ابو سفیان بھی مدینہ آپہنچا اور سب سے پہلے اپنی بیٹی ام حبیبہؓ زوجۂ رسولؐ کے گھر گیا لیکن وہ اس کے ساتھ سرد مہری سے پیش آئیں۔ پھر وہ ابو بکر اور عمر کے پاس گیا تاکہ وہ اس کی خاطر رسول اکرمؐ سے بات کریں لیکن وہ بھی نہیں مانے۔ بعدہٗ اس نے علی مرتضیٰ اور فاطمہ زہراؑ کی پناہ لینا چاہی لیکن ان میں سے کسی نے بھی اسے پناہ نہ دی۔ اب وہ خود ہی رسول اکرمؐ کے پاس آیا، لیکن آنحضرتؐ نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ فرمائی اور اٹھ کر چلے گئے۔

جب ابو سفیان نے دیکھا کہ اس کی کوششوں اور کاوشوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو وہ مدینہ سے واپس مکہ چلا گیا۔

ابو سفیان کے چلے جانے کے بعد رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کو ایک سفر کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا۔ تاہم کسی کو آنحضرتؐ کے ارادے کا علم نہ تھا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ کہاں تشریف لے جائیں گے۔

اگرچہ آپ کے ہدف اور مقصد کا کسی کو بھی علم نہ تھا لیکن اس بات کا قوی احتمال تھا کہ آپ مکہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں۔

اسی گمان کے تحت رسول اکرمؐ کے ایک صحابی حاطب بن بلتعہ نے اس صورت حال سے مکہ والوں کو باخبر کرنے کے لیے ایک خط لکھا اور وہ ایک کنیز کی معرفت بھیجا۔ تب آنحضرتؐ نے امام علیؑ کو طلب کیا اور چند اشخاص کو ان کے ساتھ کر کے فرمایا: تم خاخ کی سرزمین میں جاؤ، وہاں ایک باغ میں تم ایک عورت کو دیکھو گے۔ وہ رؤسائے قریش کے نام ایک خط لے جا رہی ہے۔ تم وہ خط اس سے لے لینا اور اسے آزاد چھوڑ دینا۔

امام علیؑ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس مقام پر پہنچے تو وہ کنیز انہیں ایک باغ میں مل گئی۔ لیکن اس نے یہ بات تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا کہ وہ کوئی خط لے جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ اس کے سامان کی تلاشی بھی لی گئی، لیکن وہ خط برآمد نہ ہوا۔ اس پر امام علیؑ نے فرمایا: خدا کی قسم! پیغمبر اسلامؐ نے جھوٹ نہیں بولا۔ پھر آپ نے تلوار کھینچ لی اور اس عورت سے کہا: خط دیدو ورنہ میں تمہاری گردن اڑا دونگا۔ جب کنیز نے امام علیؑ کا غضب اور فیصلہ کن انداز دیکھا تو اپنے بالوں کی مینڈھیوں میں سے خط نکال کر آپ کو دیدیا۔ چنانچہ وہ خط لا کر رسول اکرمؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آنحضرتؐ نے صاحبِ خط حاطب کو بلوا بھیجا اور ان سے پوچھا: تم نے یہ خط کس مقصد کے تحت لکھا؟ حاطب نے جواب دیا: یارسول اللہؐ! خدا کی قسم میں نے یہ خط کسی بری نیت سے نہیں لکھا، میں اسلام سے روگرداں نہیں ہوا

اور کفار قریش سے بھی میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میری بیوی اور بچے مکہ میں ہیں، اس لیے میں نے چاہا کہ قریش کی کچھ خدمت کروں تاکہ وہ میرے گھر والوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ چنانچہ رسول اکرمؐ نے ان کا یہ عذر قبول کر لیا اور انہیں معاف کر دیا۔

پھر چند دنوں میں مسلمان سفر کے لیے تیار ہو گئے اور انھوں نے اپنے خیمے مدینہ سے باہر گاڑ دیے۔ اگرچہ بارہ ہزار افراد پر مشتمل فوج کی تیاری کوئی ایسا کام نہیں تھا جو چپکے سے انجام پا جاتا۔ تاہم یہ اقدام اتنی رازداری سے کیا گیا کہ اہل مکہ کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر انھیں پتا چل بھی جاتا تو بھی ان میں اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کرنے کی تاب نہ تھی۔

پھر جب اسلامی سپاہ نے مکہ سے ایک منزل دور "مرالظہران" کے مقام پر پڑاؤ ڈالا تو اس وقت بھی مکہ کے لوگ اس کی آمد سے بالکل بے خبر تھے۔ تاہم مکہ کی فضا میں اضطراب اور تشویش کی دھند چھائی ہوئی تھی اور قریش کے سردار اپنے مستقبل کے بارے میں خوفزدہ تھے۔ اگرچہ وہ مسلمانوں کی طرف سے خطرہ محسوس کر رہے تھے لیکن انہیں اس بات کا گمان تک نہ تھا کہ ان پر مدینہ سے حملہ ہونے والا ہے۔

وہ ماہ رمضان کی بیسویں شب تھی، جب ابوسفیان اور اس کے دو دوست ٹہلتے اور باتیں کرتے ہوئے مکہ شہر کے دروازے سے باہر آئے۔ یوں چلتے چلتے وہ مکہ سے بہت دور نکل آئے اور ایک اونچے ٹیلے پر آ پہنچے۔ تب اچانک ہی ٹیلے کی دوسری جانب انہیں ایک ایسا منظر دکھائی دیا کہ جسے دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ کیونکہ وہ سارا بیابان

سپاہیوں کے خیموں سے پٹا پڑا تھا اور ہر خیمے کے پاس آگ روشن تھی جس سے رات کی تاریکی میں دن جیسا اجالا ہو رہا تھا۔

ابوسفیان نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا: یہ کیا ماجرا ہے اور یہ فوج کہاں سے آئی ہے؟ اس کے ساتھی نے کہا: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبیلہ بنی خزاعہ کے لوگ ہیں، جو انتقام لینے کے لیے مکہ پر شبخون مارنا چاہتے ہیں۔ اس پر ابوسفیان نے بڑی حقارت کے ساتھ کہا: بنی خزاعہ؟ نہیں! ہر قسم کے ساز و سامان سے لیس اتنی بڑی فوج بنی خزاعہ جیسے چھوٹے اور کمزور قبیلے کی ہرگز نہیں ہو سکتی۔

عین اس موقع پر عباس بن عبدالمطلبؓ رسول اکرمؐ کے مرکب پر سوار اسی بیابان میں کسی ایسے آدمی کو تلاش کر رہے تھے، جس کے ہاتھ وہ اہل مکہ کو یہ پیغام بھجوا سکیں کہ وہ آئیں اور آنحضرتؐ سے امان طلب کریں۔ چنانچہ ان کا ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں سے سامنا ہو گیا۔ انہوں نے ابوسفیان کی آواز پہچان کر اسے صدا دی۔ اس نے بھی عباسؓ کی آواز پہچان لی، وہ ان کے پاس آیا اور بڑی تشویش کے ساتھ پوچھنے لگا: کیا ماجرا ہے؟

عباسؓ نے جواب دیا: یہ رسول خدا ہیں، جو بارہ ہزار جنگجو افراد کے ساتھ تمہاری طرف آئے ہیں اور تم ان سے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ابوسفیان نے پوچھا: اب کیا کرنا چاہیے؟

عباسؓ نے کہا: تم میرے ساتھ سوار ہو جاؤ۔ تاکہ میں تمھیں رسول اکرمؐ کے پاس لے جاؤں اور ان سے تمہارے لیے امان حاصل کروں۔

تب ابوسفیان ان کے ساتھ سوار ہوگیا اور اسلامی لشکر گاہ میں آپہنچا۔ جب عمر بن خطاب کی نگاہ اس پر پڑی تو اس عداوت کی بنا پر جو وہ ایک دوسرے سے رکھتے تھے۔ عمر نے چاہا کہ رسول اکرمؐ کے پاس جائیں اور ان سے ابوسفیان کو قتل کرنے کی اجازت طلب کریں، لیکن بیشتر اس کے کہ وہ یہ قدم اٹھائیں عباسؓ نے آنحضرتؐ سے عرض کر دیا کہ میں نے ابوسفیان کو امان دی ہے۔ لہٰذا میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ بھی عنایت فرمائیں اور میری دی ہوئی امان کو قابلِ قبول قرار دیں۔

رسول اکرمؐ نے ابوسفیان سے فرمایا: اسلام قبول کر لو تاکہ محفوظ رہو۔ ابوسفیان نے کہا: لیکن میں لات اور عزیٰ کا کیا کروں جو میرے محبوب بت ہیں اور جن کا میں احترام کرتا ہوں۔

عمر بن خطاب نے کہا: "ان پر کوڑا ڈال دو۔"

ابوسفیان نے اعتراض آمیز لہجے میں کہا: اف ہے تم پر کہ تم اتنے بدزبان ہو؟ تم مجھے اپنے چچازاد بھائی سے بات کیوں نہیں کرنے دیتے؟

بالآخر ابوسفیان نے وہ رات عباسؓ کے خیمے میں بسر کی اور دوسرے دن علی الصبح رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب اس نے دیکھا کہ اسلام قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے تو وہ مسلمان ہوگیا اور یوں امان حاصل کر لی۔ علاوہ ازیں عباسؓ کی سفارش پر رسول اکرمؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا اسے بھی امان حاصل ہوگی۔

پھر رسول اکرمؐ نے اپنے لشکر کو مکہ کی جانب کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ ابوسفیان کو فوج کے راستے میں ایک تنگ

مقام پر کھڑا کر دیا جائے۔ تاکہ وہ اسلام کی شان و شوکت اور طاقت کو اچھی طرح دیکھ لے اور آئندہ کوئی شورش برپا کرنے کی جرأت نہ کرے۔

جب اسلامی سپاہ کے مختلف دستے ابوسفیان کے پاس سے گزرے تو ان تمام سپاہیوں اور جنگی ساز و سامان کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ بعد میں جب وہ مکہ پہنچا تو قریش نے دیکھا کہ وہ سراسیمگی کے عالم میں چلا آرہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اسلامی فوج کی آمد سے جو گرد و غبار اٹھا، اس نے فضا کو تاریک کر دیا ہے۔

تب قریش نے ابوسفیان سے پوچھا: کیا خبر ہے؟

اس نے جواب دیا: یہ محمدؐ ہیں جو ایک بیکراں سمندر ایسا لشکر لے کر بڑھے آرہے ہیں۔ جو کوئی میرے گھر میں داخل ہو جائے وہ امان میں ہے، جو کوئی لڑائی کے ہتھیار پھینک دے وہ بھی امان میں ہے، جو کوئی اپنے گھر میں دبک جائے اور دروازہ بند کر لے وہ بھی امان میں ہے، اور جو کوئی مسجد الحرام میں پناہ لے لے وہ بھی امان میں ہے۔

ادھر اسلامی سپاہ جو مختلف دستوں میں منقسم تھی، شمالی، جنوبی، مشرقی اور مغربی دروازوں سے شہر میں داخل ہو گئی اور رسول اکرمؐ نے بھی سورۂ فتح پڑھتے ہوئے شہر میں قدم رکھا۔ آپ سیدھے مسجد الحرام میں گئے، خانۂ خدا کا طواف کیا، حجرِ اسود کو بوسہ دیا اور صدائے تکبیر بلند کی۔ آپ کی تکبیر کے ساتھ ہی اسلام کے تمام سپاہیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور خدا کی توحید کی آواز شہر، جنگل اور میدان میں گونجنے لگی۔

پھر رسول اکرمؐ بتوں کو توڑنے اور خانۂ خدا کو پاک و پاکیزہ کرنے کی جانب متوجہ ہوئے۔ آپ انھیں ایک لاٹھی کے ساتھ گراتے

اور یہ فرماتے جاتے تھے:

حق آگیا اور باطل نابود ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ باطل مٹنے ہی والا تھا۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۱)

جن بتوں تک ہاتھ پہنچ سکتا تھا، وہ سب سرنگوں ہو گئے۔ ہاں وہ بڑے بت باقی رہ گئے، جو چھت پر نصب تھے۔ اب رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کو حکم دیا کہ وہ آپ کے کندھے پر پاؤں رکھ کر اوپر جائیں اور ان بتوں کو بھی توڑ دیں۔ چنانچہ انھوں نے آنحضرتؐ کے ارشاد کی تعمیل کی اور ان بڑے بڑے بتوں کو بھی توڑ پھینکا۔ پھر ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ نے اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا اور مسکرائے۔ رسول اکرمؐ نے مسکرانے کی وجہ پوچھی تو عرض کیا: یا رسول اللہؐ! میں نے اپنے آپ کو بہت بلند جگہ سے زمین پر گرایا ہے لیکن مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ حضورؐ نے فرمایا: تمہیں تکلیف کیسے پہنچتی، جب کہ محمدؐ نے تمہیں اٹھا رکھا تھا اور اب جبرئیل نے نیچے اتارا ہے۔ ؎

بعد ازاں رسول اکرمؐ نے خانۂ کعبہ کی کنجی لے کر دروازہ کھولا اور حکم دیا کہ انبیاء اور ملائکہ کی وہ تمام تصویریں جو مشرکین نے خانۂ خدا کی دیواروں پر نقش کر رکھی تھیں مٹا دی جائیں۔

جب رسول اکرمؐ بتوں کو توڑنے میں مصروف تھے، قریش کے سردار اور مکہ کے سرکش اشخاص مسجد الحرام کے پاس کھڑے کانپتے ہوتے

؎ ایران و عرب کے عظیم شعراء دوش رسولؐ پر چڑھ کر امام علی کی بت شکنی کے واقعہ کو آپ کے مناقب میں بڑے اہتمام کے ساتھ بیان کرتے چلے آرہے ہیں۔

دلوں کے ساتھ اپنی سرنوشت کا انتظار کر رہے تھے۔

ہاں یہ بڑے نازک لمحات تھے اور ضروری تھا کہ انہی لمحات میں ان لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا جائے جن کی زندگی کے خاتمہ کے لیے آنحضرتؐ کا ایک اشارہ ہی کافی تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے گزشتہ ایام میں بڑے ناروا کام کیے، پیغمبر اسلامؐ کو شدید تکلیفیں دیں، جنگیں اور فتنے بپا کیے تھے اور کئی خون بہائے تھے۔ اگر آنحضرتؐ ان کا مواخذہ کرتے اور ان سے انتقام لیتے تو یہ چیز عدل کے عین مطابق ہوتی۔ تاہم وہ منتظر تھے کہ دیکھیے آپ ان کے بارے میں کیا فرماتے ہیں اور کیا حکم صادر کرتے ہیں۔

اس اثنا میں رسول اکرمؐ قریش کی صف کے سامنے تشریف لائے اور فرمایا: تم لوگ اپنے بارے میں کیا کہتے ہو اور مجھ سے کیا امید رکھتے ہو؟

انہوں نے کہا: ہم بھلائی کی بات کرتے ہیں اور بھلائی کے منتظر ہیں۔ آپ ہمارے محترم بھائی اور عزت دار بھتیجے ہیں اور اس وقت ہم آپ کے رحم و کرم پر ہیں۔

آنحضرتؐ ان کی حالت دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے، آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اہل مکہ بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ تب رسول اکرمؐ نے فرمایا: میں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی حضرت یوسفؑ نے کہی تھی:

آج سے تم پر کوئی الزام نہیں۔ خدا تمہارے گناہ معاف فرمائے اور وہ سب سے بڑا بخشنے والا ہے۔

(سورۂ یوسف۔ آیت ۹۲)

پھر فرمایا: جاؤ کہ میں نے تم سب کو آزاد کر دیا ہے۔ چونکہ نماز کا وقت آ گیا تھا، اس لیے رسول اکرمؐ کے خاص مؤذن بلالؓ نے خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان کہی اور آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو نماز پڑھائی۔

اس کے بعد قریش کے کئی افراد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے بہ رضا و رغبت اسلام قبول کیا۔ جب عورتوں سے بیعت لینے کا موقع آیا تو آپ نے پانی کا ایک پیالہ لے کر اس میں ہاتھ ڈالا۔ پھر وہ پیالہ عورتوں کے پاس بھیج دیا اور فرمایا: میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کیا کرتا، لہٰذا جو عورت مجھ سے بیعت کرنا چاہے وہ اپنا ہاتھ اس پیالے میں ڈال دے، بس بیعت ہو جائے گی۔

یوں قریش کی سرگرمیوں کا مرکز "مکہ" فتح ہو گیا اور اسلام کے دشمنوں کی آخری امید بھی نا امیدی میں بدل گئی۔ اس موقع پر انصار میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے: اب جب کہ رسول اکرمؐ اپنے وطن واپس آ گئے ہیں، ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آیا وہ ہمیں چھوڑ کر مکہ میں ہی قیام کرتے ہیں یا ہمارے ساتھ مدینہ چلتے ہیں۔ تب آنحضرتؐ نے ان سے پوچھا: تم لوگ یہ کیا باتیں کر رہے ہو؟ پہلے تو انصار نے کچھ نہ بتایا، لیکن جب آپ نے اصرار کیا تو مطلب کی بات زبان پر لے آئے۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا: معاذ اللہ! تمھاری زندگی میری زندگی اور تمھاری موت میری موت ہے۔ میں تمھیں چھوڑ کر ہرگز یہاں نہیں رہوں گا۔ انصار یہ خوشخبری سن کر بےحد مسرور ہوئے اور پھر آنحضرتؐ نے بھی اپنا وعدہ پورا فرمایا۔

جنگِ حنین

جب قریش کا آخری گڑھ یعنی مکہ فتح ہو گیا تو مشرکین قریش پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام کے مقابل آنے کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے علاوہ کچھ نہ نکلے گا۔ تاہم طائف کے دو بڑے قبیلے یعنی ہوازن اور ثقیف اپنے آپ کو قریش سے زیادہ قوی سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر ان کے اہم اور سربرآوردہ اشخاص ہوازن کے سردار مالک بن عوف کے گرد جمع ہو گئے۔ پھر وہ چار ہزار جنگجو مردوں کو ساتھ لے کر مسلمانوں پر چڑھ دوڑے۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے بیوی بچوں اور جانوروں کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

اس کے علاوہ مالک نے اپنی فوج میں اور اضافہ کرنے کے لیے بنی سعد سے بھی مدد مانگی۔ انھوں نے جواب میں کہا:

محمدؐ نے اپنی شیر خوارگی اور بچپن کا زمانہ ہمارے قبیلے میں گزارا

ہے - اس بنا پر وہ ہمارے رضاعی عزیز ہیں - لہٰذا ہم ان سے جنگ ہرگز نہیں کریں گے - تاہم اس نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور اس قبیلے کے مختلف افراد سے مسلسل خط و کتابت کرتا رہا - یہاں تک کہ ان میں سے کئی ایک کو جھکمہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔

اس لشکر میں ایک جہاندیدہ اور تجربہ کار آدمی درید بن صمہ بھی شامل تھا' جو بڑھاپے کے باعث نابینا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا: اس وقت تم کون سی سرزمین میں ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہم وادیٔ اوطاس میں ہیں۔ اس نے کہا: یہ جنگ کے لیے بہت ہی مناسب ہے لیکن یہاں بھیڑ بکریوں اور دوسرے چوپایوں کا شور کیوں سنائی دے رہا ہے - نیز عورتوں کے بولنے اور بچوں کے رونے کی آوازیں کیوں آ رہی ہیں؟

انہوں نے جواب دیا: قبیلے کا سردار مالک بن عوف تمام عورتوں' بچوں اور چوپایوں کو ہمراہ لے آیا ہے - تاکہ ہر مرد اپنے بیوی بچوں اور مال کا دفاع کرے اور ان کی خاطر سردھڑ کی بازی لگا دے۔

اس نے کہا: رب کعبہ کی قسم! مالک فقط ایک چرواہا ہے اور وہ رموز جنگ سے بالکل بے خبر ہے' تم اسے میرے پاس بلاؤ۔ جب مالک آیا تو درید نے اس سے کہا: اے مالک! اس وقت تم قوم کے سردار ہو' لہٰذا تمہیں چاہیے کہ جو کام بھی کرو ہوشیاری کے ساتھ کرو۔ ہاں تو کوئی نہیں جانتا کہ کل کو کیا ہونے والا ہے - پس تم یہ حکم دیدو کہ عورتیں اور بچے اپنے چوپایوں سمیت گھروں کو واپس چلے جائیں۔ پھر تم اپنے جنگجو مردوں اور سپاہیوں کو ساتھ لے کر دشمن کا

مقابلہ کرنا۔ اگر تم نے فتح پائی تو خاندان کے لوگوں کو اپنے پاس بلانا آسان کام ہے لیکن اگر تمہیں شکست ہوئی تو عورتوں کی وجہ سے ہونیوالی رسوائی سے بچ جاؤ گے۔

مالک نے کہا: اے دربد! تم بوڑھے ہوگئے ہو اور تمہاری عقل ماؤف ہوگئی ہے۔ اس لیے تم ہمارے کام میں کوئی دخل اندازی کرنے سے باز رہو۔

رسول اکرمؐ کو مکہ تشریف لائے ہوئے ابھی پندرہ ہی دن گزرے تھے کہ آپ کو اس فوج کے کوچ کی اطلاع ملی۔ چنانچہ آپ بھی بارہ ہزار مسلمانوں کو ساتھ لے کر اس قوم کی سرکوبی کے لیے مکہ سے روانہ ہوگئے۔

لشکر اسلام کا بڑا پرچم امام علیؑ کے سپرد کیا گیا اور دوسرے لوگوں کو وہی پرچم دیے گئے جو انھوں نے فتح مکہ کے وقت اٹھا رکھے تھے۔

گزشتہ جنگوں میں مسلمانوں کی تعداد کفار سے ہمیشہ کم ہوتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس اس جنگ میں انہیں تعداد اور جنگی ساز و سامان کے لحاظ سے دشمن پر برتری حاصل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بعض افراد کے دلوں میں غرور پیدا ہوگیا۔ حتیٰ کہ ابوبکر نے کہا: یہ ایک عجیب لشکر جمع ہوگیا ہے، ہم ہرگز شکست نہیں کھائیں گے۔

خالد بن ولید ہراول دستے کے سردار تھے اور بنی سلیم کے افراد کے ہمراہ فوج کے آگے آگے چل رہے تھے۔ جب وہ ایک درے کے پیچ و خم سے گزرے تو اچانک انھیں قبیلہ بنی ہوازن کے حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ حملہ اتنا سخت اور غیر متوقع تھا کہ یہ ہراول دستہ کوئی مقابلہ کیے بغیر ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ دوسرے مسلمان جوان کے پیچھے آ رہے تھے

ان لوگوں کے فرار ہونے کا ان کے دلوں پر بہت برا اثر پڑا اور وہ بھی تتر بتر ہو گئے۔

ایسے میں امام علیؑ کہ جو علمدار تھے وہ اور بنی ہاشم کے چند افراد ہی رسول اکرمؐ کے پاس باقی رہ گئے تھے، انہوں نے جنگ جاری رکھی۔ ان افراد میں عباس بن عبدالمطلبؓ۔ فضل بن عباس۔ ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب۔ نوفل بن حارث۔ ربیعہ بن حارث۔ عبداللہ بن زبیر بن عبدالمطلب اور عتبہ بن ابی لہب بنی ہاشم میں سے تھے۔ ان کے علاوہ ایک اور شخص ام ایمن کے بیٹے ایمن تھے جو اس کشمکش میں مارے گئے۔ اس وقت امام علیؑ، رسول اکرمؐ کے آگے اور باقی تمام افراد آنحضرتؐ کے دائیں بائیں اور پیچھے رہ کر جنگ کر رہے تھے۔

رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کو فرار ہوتے دیکھا تو آپ نے عباسؓ کو جن کی آواز بہت بلند تھی، حکم دیا کہ وہ انھیں واپس بلائیں۔ تب انہوں نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر کہا:

> اے مہاجرین وانصار! اے سورۂ بقرہ والو! اے بیعت شجرہ کے ساتھیو! کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ ہاں دیکھو تو سہی کہ رسول خداؐ کہاں ہیں۔

جب مسلمانوں نے عباسؓ کی آواز سنی تو پلٹ پڑے اور بالخصوص انصار دوسروں سے پہلے واپس پہنچے۔ میدان جنگ پھر سے گرم ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں قبیلہ ہوازن کی فوج بدترین حالت کے ساتھ بھاگ نکلی اور مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا۔ کفار کے کچھ اوپر سو آدمی مارے گئے اور مالک بھاگ کر طائف کے قلعے میں جا چھپا۔ تب ان کی عورتیں،

مال و اسباب اور چوپائے مسلمانوں کے ہاتھ آ گئے۔

رسول اکرمؐ نے ان کافروں کا طائف تک پیچھا کیا اور ماہِ شوال کے آخر تک اس شہر کو محاصرے میں لیے رکھا لیکن ماہ ذی قعدہ میں (جو حرام مہینوں میں سے ہے) محاصرہ اٹھا لیا گیا اور آنحضرتؐ مکہ لوٹ آئے۔ اثناءِ راہ میں جعرانہ پہنچنے پر آپ نے اس جنگ میں حاصل شدہ مالِ غنیمت تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم میں آپ نے قریش اور دوسرے عرب کہ جو نو مسلم تھے، تالیفِ قلوب کی خاطر ان کو زیادہ حصہ عطا فرمایا اور انصار کو مالِ غنیمت میں سے کچھ نہ دیا۔

تب انصار کے رئیس سعد بن عبادہ، رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: آپ کے انصار مالِ غنیمت میں سے حصہ نہ ملنے پر کچھ افسردہ خاطر ہو رہے ہیں۔

آپ نے فرمایا: انہیں اس مقام پہ جمع کرو تاکہ میں ان سے بات کروں۔

جب انصار وہاں جمع ہو گئے تو آنحضرتؐ ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

اے گروہ انصار! جب میں تمہارے شہر آیا تو کیا تم گمراہ نہ تھے اور خدائے تعالیٰ نے تمہیں سیدھی راہ دکھا دی۔ کیا تم تہی دست نہ تھے اور اس نے تمہیں تونگر کر دیا۔ کیا تم ایک دوسرے کے دشمن نہ تھے اور اس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور ان میں الفت پیدا کر دی۔

انہوں نے جواب دیا: یا رسول اللہؐ ایسا ہی تھا۔

پھر فرمایا: اے گروہِ انصار! تم میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے؟

انہوں نے کہا: ہم کیا کہیں اور کیا جواب دیں؟ ہم پر خدا اور اس کے رسولؐ کا احسان ہے۔

آپ نے فرمایا: خدا کی قسم! اگر تم چاہو تو میری باتوں کا جواب دے سکتے ہو اور وہ درست بھی ہوگا۔ تم یوں کہو: آپ ہمارے شہر میں اس وقت آئے جب آپ کو پناہ نہ ملتی تھی۔ تب ہم نے آپ کو پناہ دی۔ آپ نادار تھے اور ہم نے اپنا مال و متاع آپ کے حوالے کر دیا۔ آپ کو دشمنوں کا خوف تھا اور ہم نے آپ کو اطمینان دلایا۔ آپ بے یار و مددگار تھے اور ہم نے آپ کا ساتھ دیا۔

انہوں نے کہا: ہم تو خدا اور اس کے رسولؐ کے احسان مند ہیں۔

پھر اس عالم میں کہ مہربانی اور شفقت آپ کے چہرے سے ٹپک رہی تھی، رسول اکرمؐ نے اپنی گفتگو یوں جاری رکھی:

اے گروہ انصار! تم اس لیے آزردہ ہو گئے ہو کہ میں نے فانی دنیا کا کچھ مال دوسرے لوگوں کو دیدیا، تاکہ ان کے دل اسلام کی جانب راغب ہو جائیں۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ وہ لوگ بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کے ساتھ اپنے گھروں کی راہ لیں اور تم خدا کے رسولؐ کو لے کر اپنے وطن لوٹ جاؤ؟

اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر تمام لوگ ایک راستے پر چلیں اور انصار ایک اور راستے پر

چلیں تو میں اس راستے پر چلوں گا جس پر انصار چلیں گے۔
ہاں اگر ہجرت کا مسئلہ بیچ میں نہ ہوتا تو میں بھی انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔

اے پروردگار! انصار پر، ان کی اولاد پر اور ان کی اولاد پر رحمت اور برکت نازل فرما۔"

آنحضرتؐ کے یہ ارشادات سن کر سب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انہوں نے یک زبان ہو کر کہا: ہم خدا اور اس کے پیغمبرؐ کی تقسیم پر راضی اور خوش ہیں۔ یہ کہہ کر وہ اپنے اپنے خیمے میں چلے گئے۔

جنگ حنین میں جن لوگوں کو قیدی بنایا گیا، ان میں حلیمہ سعدیہؓ کی بیٹی اور رسول اکرمؐ کی رضاعی بہن بھی شامل تھیں۔ جب انھوں نے اپنا تعارف کرایا تو آنحضرتؐ ان سے بڑی شفقت سے پیش آئے۔ آپ نے ان کے بیٹھنے کے لیے اپنی عبا زمین پر بچھا دی اور دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے۔ پھر آپ نے انھیں اس بات کا اختیار دیا کہ چاہیں تو اپنے وطن کو لوٹ جائیں اور چاہیں تو آنحضرتؐ کے پاس رہیں۔ آخرکار انہوں نے وطن جانے کا فیصلہ کیا اور رسول اکرمؐ کو الوداع کہنے آئیں۔ تب آپ نے انہیں ایک کنیز، چند بھیڑ بکریاں اور دو اونٹ دے کر رخصت فرمایا۔

اس موقع پر قبیلہ ہوازن کا ایک وفد رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ وفد کے نمائندے نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا: یا رسول اللہؐ! ان قیدیوں میں آپ کی خالائیں اور وہ عورتیں بھی ہیں، جنہوں نے آپ کے بچپن میں آپ کی پرورش کی تھی۔ اگر ہم اپنے قبیلے میں نعمان بن منذر جیسے لوگوں کی پرورش کرتے اور بعد میں

ان کے ہاتھوں قیدی بن جاتے تو ہم ان سے محبت اور مہربانی کی امید رکھتے۔ پھر آپ تو دنیا کے سب سے زیادہ نیک سیرت اور بزرگوار انسان ہیں۔ بعدازاں اس نے چند اشعار پڑھ کر اپنا بیان ختم کر دیا۔

رسول اکرمؐ نے اس وفد کو جواب دیتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا: تمہیں ان دو چیزوں میں سے کونسی چیز زیادہ عزیز ہے۔ قیدی یا مال؟

انہوں نے جواب دیا: یا رسول اللہؐ! آپ نے ہمیں دولت اور نسب کے درمیان اختیار دیا ہے۔ پس ہم اپنے نسب اور شرافت کو ہر چیز سے اہم سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کی بات نہیں کرتے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: جو قیدی بنی ہاشم کے حصے میں آئے ہیں، وہ سب آپ لوگوں کو واپس کیے جاتے ہیں۔ باقی رہے وہ قیدی کہ جو دوسرے مسلمانوں کے حصے میں آئے ہیں۔ ان کے لیے میں مسلمانوں سے بات کروں گا اور سفارش کروں گا کہ وہ انہیں چھوڑ دیں لیکن خود تمہیں بھی چاہیے کہ مسلمانوں کو اپنے اسلام لانے کی اطلاع دو اور ان سے اپنے قیدیوں کے بارے میں بھی گفتگو کرو۔

اس گفتگو کے بعد قبیلۂ ہوازن کے لوگ وہاں سے چلے گئے اور جب رسول اکرمؐ نمازِ جماعت سے فارغ ہوئے تو اپنی جگہ سے اٹھے اور مذکورہ بالا معاملہ بآوازِ بلند تمام مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا اور فرمایا: اے مسلمانو! میں نے بنی ہاشم کا حصہ ان لوگوں کو بخش دیا ہے اور ان کے قیدی انہیں واپس کر رہا ہوں۔ پس تم میں سے بھی جو شخص چاہے ان کے قیدی واپس کر دے۔ اگر کوئی شخص اپنے حصے کے قیدی بلامعاوضہ واپس نہ کرنا چاہے تو وہ ان کی قیمت لے لے اور

ان کی قیمت میں خود ادا کروں گا۔ چنانچہ دو اشخاص کے علاوہ باقی سب مسلمانوں نے اپنے اپنے حصے کے قیدی واپس کر دیے اور وہ وفد خوش خوش اپنے وطن لوٹ گیا۔

بعدہٗ رسول اکرمؐ نے اس معاملے کو انجام تک پہنچانے کی خاطر قبیلہ ہوازن کے رئیس مالک بن عوف کو یہ پیغام بھیجا۔

اگر تم اسلام قبول کر کے ہم سے وابستہ ہو جاؤ تو ہم تمہاری تمام لغزشیں معاف کر دیں گے۔ نیز ہم تمہارے قیدی اور تمہارا مال و اسباب بھی تمہیں لوٹا دیں گے اور اپنی طرف سے بھی تمہیں سو اونٹ دیں گے۔ جب مالک کو یہ پیغام ملا تو وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کر لیا۔ رسول اکرمؐ نے اس کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا اور اس کے علاوہ اسے پورے قبیلے کا سردار بھی بنا دیا۔ یوں اس ہنگامے کے خاتمے پر سارے کا سارا جزیرہ نمائے عرب اسلام کے زیر نگین آ گیا۔

اعلانِ براءت

رسول اکرمؐ کا اصول یہ تھا کہ آپ لوگوں کو اسلام قبول کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں آزادی دیتے تھے۔ چنانچہ آپ نے کسی موقع پر بھی کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ نیز قرآن مجید میں بھی اس بارے میں صریحاً ارشاد ہوا ہے کہ:

دین میں کسی طرح کی زبردستی نہیں۔

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۵۶)

چنانچہ آپ نے اپنے اسی اصول کے مطابق فتح مکہ کے موقع پر قریش کو اسلام قبول کرنے یا اپنی سابقہ روش پر قائم رہنے کا اختیار دیدیا۔ ہاں یہ شرط ضرور لگائی کہ مشرکین اپنی سرکشی اور جنگ بازی کو ترک کردیں اور اسلام کی پناہ میں پرامن زندگی بسر کریں۔

لیکن کچھ مدت کے بعد مشرکین نے عہد شکنی کرتے ہوئے

اپنی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا اور پھر کھلم کھلا سرکشی اور بغاوت پر اتر آئے۔ چنانچہ ان کی اسی عہد شکنی کے بارے میں آیات براءت نازل ہوئیں۔ اگرچہ قرآن کریم کی تمام سورتیں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے جملے سے شروع ہوتی ہیں، لیکن سورۂ برأت کا آغاز خدائے تعالیٰ کے نام کے بغیر ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "بسم اللہ۔۔۔۔ آیۂ رحمت ہے جبکہ اس سورہ میں مشرکین سے بیزاری کا اعلان ہے اور انہیں عذاب و عقاب کی سنائی دی گئی ہے۔

جب یہ سورہ نازل ہوا تو رسول اکرمؐ نے ابوبکر کو مامور کیا کہ وہ مکہ جا کر اس سورہ کی چالیس آیتیں مشرکین کے اجتماع میں بلند آواز سے پڑھیں اور یہ اعلان خداوندی ان تک پہنچا دیں۔

تب ابوبکر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ سے مکہ روانہ ہو گئے۔ لیکن ایک منزل پر کہ جو مدینہ سے چنداں دور نہ تھی، امام علیؑ رسول اللہؐ کے مرکب پر سوار ان سے آملے اور فرمایا:

> رسول اکرمؐ نے مجھے اس کام پر مامور کیا ہے کہ میں آپ سے آیات برأت لے کر خود مکہ جاؤں اور وہ آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سناؤں۔

ابوبکر نے یہ بات مان لی اور وہ آیتیں امام علیؑ کے سپرد کر کے خود مدینہ لوٹ گئے۔ جب وہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں پہنچے تو اُن سے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! کیا میرے بارے میں کوئی چیز نازل ہوئی ہے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں! لیکن یہ بات ہے کہ خدا کے حکم سے

جبرئیلؑ میرے پاس آئے اور انھوں نے کہا:

یعنی خود آپ کے یا آپ کے خاندان کے کسی ایک مرد کے علاوہ کوئی دوسرا یہ فریضہ انجام نہیں دے سکتا۔

ان آیات میں عہد شکنی کرنے والوں سے کہا گیا ہے کہ وہ چار ماہ تک مکہ میں آزادی سے رہ سکتے ہیں لیکن اس کے بعد انھیں دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ یعنی وہ اسلام قبول کرلیں اور دیگر مسلمانوں کی طرح اسلام کے فوائد سے بہرہ مند ہوں۔ اگر یہ نہیں تو خدا کی طرف سے دردناک عذاب جھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

امام علیؑ، ابوبکر سے آیات برائت حاصل کرنے کے بعد مکہ پہنچے اور قربانی کے دن لوگوں کے ایک عظیم اجتماع میں کھڑے ہو کر آواز دی:

اے لوگو! مجھے رسول خداؐ نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ تب آپ نے آیاتِ برائت پڑھیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا:

- اس سال کے بعد کسی مشرک کو خانۂ خدا میں داخل ہونے کا حق حاصل نہ ہوگا۔
- کسی مرد یا عورت کو اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ برہنہ ہو کر خانۂ خدا کا طواف کرے۔
- جن لوگوں نے رسول اکرمؐ سے کوئی معاہدہ کر رکھا ہے اور اس مدت کا تعین نہیں ہوا، اس کی مدت آئندہ چار ماہ ہوگی۔
- جن لوگوں نے رسول اکرمؐ سے کوئی معاہدہ کر رکھا ہے اور اس کی مدت طے شدہ ہے، اس کی مدت وہی رہے گی۔

اس دن تک مشرکین حج اور طواف کے لیے خانۂ خدا میں آیا

کرتے تھے۔ ان کے ہاں یہ رسم تھی کہ اگر کوئی شخص مکہ آتا اور اپنا لباس پہن کر طواف کرتا تو پھر اسے وہ لباس اپنے پاس رکھنے کا حق نہ ہوتا تھا۔ بلکہ اس پر لازم ہو جاتا کہ وہ اپنا لباس بطور صدقہ دیدے۔ چنانچہ بہت سے مشرکین اس صورت سے بچنے کے لیے طواف کے وقت اپنا لباس اتار دیتے اور کسی دوسرے شخص سے مانگ لیتے تھے۔ جب طواف کر لیتے تو وہ لباس اس کے مالک کو واپس کر دیتے تھے۔ لیکن اگر انہیں مانگے کا لباس دستیاب نہ ہوتا، تو وہ برہنہ ہو کر طواف کر لیا کرتے تھے۔

اسی سال ایک خوبصورت عورت طواف کی غرض سے مکہ پہنچی۔ اس نے مانگے کا لباس حاصل کرنے کی بے حد کوشش کی لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ تب اسے کہا گیا: اگر وہ اپنا لباس پہن کر طواف کرے گی تو وہ لباس اسے بطور صدقہ دینا پڑے گا۔ وہ کہنے لگی: جب میرے پاس اس کے علاوہ کوئی اور لباس ہے ہی نہیں تو میں اسے بطور صدقہ کیسے دے سکتی ہوں؟ بالآخر اس نے اپنا لباس اتار دیا اور سر تا پا برہنہ ہو کر طواف کرنے لگی۔ پھر تو اس پر ہر طرف سے نگاہیں گڑ گئیں اور وہ اپنی شرمگاہ پہ ہاتھ رکھ کر طواف کرتی رہی۔

یہ شرمناک رسمیں اور یہ ناروا اعمال ـــــ اور وہ بھی خانۂ خدا میں، ایک ایسی برائی تھی جس کو ختم کر دینا ضروری تھا۔ تاکہ اس مقدس مکان کو ہمیشہ کے لیے نجاستوں سے پاک کر دیا جاتے۔

خدا اور رسولؐ کا جو فرمان امام علیؑ کی معرفت لوگوں تک پہنچا۔ اس کے ذریعے سے ان رسوم کو ممنوع قرار دیا گیا اور مشرکین کی فتنہ جوئی کا خاتمہ کر دیا گیا۔

ایک اور نکتہ کہ جسے اس داستان میں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے' یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے صریحاً فرمایا کہ ابو بکر کا معزول کرنا اور امام علیؑ کا بھیجا جانا خدائے تعالیٰ کے حکم کے مطابق تھا۔ علاوہ ازیں خود آپ یا آپ کے خاندان کے ایک مرد کے علاوہ کوئی اور یہ فریضہ ادا نہیں کرسکتا۔ ایک مطلق حکم ہے اور شیعوں اور سنیوں کی کسی روایت میں اسے آیات برائت کی تبلیغ سے مشروط نہیں کیا گیا۔

لہذا ہمارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ ہم اس جملے کو اسی ایک واقعہ کے ساتھ مخصوص کردیں۔ مزید یہ کہ رسول اکرمؐ نے خدائے تعالیٰ کا جو ارشاد نقل فرمایا ہے' اس کے مطابق خود رسول اکرمؐ یا انکے خاندان کے ایک مرد کے علاوہ کوئی دوسرا شخص آنحضرتؐ کی ذمہ داری پوری نہیں کرسکتا۔ پھر امام علیؑ کا انتخاب کرکے لوگوں کو عملاً بھی سمجھا دیا گیا کہ رسول اکرمؐ کے بعد خاندانِ رسالت کے وہ اہل مرد فقط امام علیؑ ہی ہیں۔

جنگِ تبوک

مدینہ کے لوگوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ قیصر روم ایک بہت بڑا لشکر لیکر مدینہ کی طرف آرہا ہے۔ ان دنوں کچھ سوداگر شام سے مدینہ آئے اور انہوں نے لوگوں کو یہ خبر سنائی۔ پھر رفتہ رفتہ یہ افواہ سارے شہر میں پھیل گئی اور رسول اکرمؐ کے کانوں تک بھی پہنچی۔

چونکہ اس وقت کے حالات و قرآئن اس اطلاع کے درست ہونے کی تائید کرتے تھے، اس لیے آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ دور و نزدیک کے تمام مسلمان اٹھ کھڑے ہوں اور اس سفر کے لیے تیار ہو جائیں۔

اگرچہ رسول اکرمؐ اکثر جنگوں میں اپنا اصلی مقصد اور حقیقی ہدف اس لیے پوشیدہ رکھتے تھے کہ دشمن پیش دستی نہ کرسکے لیکن اس موقع پر آپ نے اپنا ہدف اور مقصد اس لیے واضح طور پہ بیان کر دیا کہ اتنی لمبی مسافت پہ ایک طاقتور دشمن کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے بہت زیادہ

ساز و سامان کی ضرورت تھی۔
مزید برآں یہ سفر مسلمانوں کے لیے بڑا سخت اور ناگوار تھا۔ کیونکہ گرمی کا موسم، دور کا سفر اور دشمن بڑا طاقتور تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ فصل کاٹنے اور پھل چننے کا وقت تھا۔ اس بنا پر لوگ آجکل کرتے ہوئے روانگی میں تاخیر کیے جا رہے تھے۔

مدینہ کے سیاسی ماہروں کے نقطۂ نظر سے قیصر روم کی طاقتور فوج سے جنگ لڑنا ایک خطرناک اقدام تھا۔ نیز بعض منافقین اپنی خفیہ نشستوں میں یہ کہہ رہے تھے: محمدؐ یہ سمجھتے ہیں کہ قیصر روم سے جنگ کرنا بھی ان کی عربوں کے خلاف کسی جنگ کی مانند ہے کہ جسے جیت لینے کی توقع ہو۔

ایسے خیالات کا پرچار عموماً منافقین کی جانب سے ہوتا تھا جو دوسروں کے حوصلے پست کرتا اور انہیں کوئی مستعدانہ قدم اٹھانے سے باز رکھتا تھا۔ تاہم رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کے اجتماع میں ایک ایسا خطبہ دیا، جس نے منافقین کی معاندانہ باتوں کو بے اثر کر دیا اور مسلمانوں کے دلوں میں ایک تازہ ولولہ پیدا ہو گیا۔

چنانچہ رسول اکرمؐ نے اپنے اس خطبے میں خدائے تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد بہت سے اخلاقی اجتماعی اور دینی مسائل کے ضمن میں لوگوں کو کئی ایک نکات سمجھائے۔ آپ نے ان کے اندر ترقی اور سرفرازی کی روح کو ابھارا اور آزادی و سربلندی کا احساس بیدار کر دیا۔ آپ نے ان پہ واضح کیا کہ دین حق کے لیے شہید ہونا بہترین سعادت ہے۔ آپ نے انہیں یہ بھی بتایا کہ خدا اور اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرنا

مسلمان کا ایک ایسا فریضہ ہے جس سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔ علاوہ ازیں آپ نے دین کی حفاظت اور مملکت کی آزادی کی خاطر مال و دولت خرچ کرنے کو دولتمند لوگوں کا سب سے اہم فریضہ قرار دیا۔

اس خطبے نے مسلمانوں پر گہرا اثر ڈالا اور مدینہ میں بیحد جوش و خروش پیدا ہوگیا۔ یہی وجہ تھی کہ مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے قابل قدر مالی تعاون کیا۔ چنانچہ ایک مسلمان نے اتنی چاندی پیش کی کہ جس کی قیمت ایک ہزار دینار تھی۔ عباس بن عبدالمطلب ایک بھاری رقم لے آئے۔ عاصم بن وہب نے ستر اونٹوں کا بار کھجوریں پیش کیں۔ ایک آدمی نے ساری اور دوسرے نے اپنی آدھی دولت دیدی۔ مزید یہ کہ مسلمان عورتوں نے فوجی سازو سامان کے لیے اپنے سونے چاندی کے زیورات ہدیے کے طور پر پیش کر دیے۔

ظاہر ہے کہ جب ملک کو خطرے کا سامنا ہو تو سارے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ایثار اور قربانی کے جذبے سے اپنے دین اور وطن کا دفاع کریں۔ اگر وہ دشمن کا مقابلہ کرنے میں سستی برتیں گے اور روپیہ پیسہ خرچ کرنے سے پہلوتہی کریں گے تو جلد ہی وہ وقت آجائے گا، جب ان کے ملک پر دشمنوں کا قبضہ ہو جائے گا اور قوم غیروں کی غلام بن جائیگی۔

اس لشکر کی تیاری میں جو مختلف مشکلات درپیش تھیں، ان کے علاوہ سب سے بڑی اور خطرناک مشکل منافقین کا وہ منصوبہ تھا جسکے ذریعے وہ جوابی انقلاب برپا کر کے اسلام کا نام ونشان مٹا دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ اسلام کے آنے سے ان کی ریاست ختم ہوگئی تھی اور مجبوراً انہیں اسلام کا لبادہ اوڑھنا پڑا تھا۔ چنانچہ انھوں نے رسول اکرمؐ کے سفر پر روانہ ہونے

اور مدینہ کے خالی رہ جانے کے پیش نظر فیصلہ کیا کہ اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت پر قبضہ جما لیا جائے۔

چنانچہ منافقین نے ایک عیسائی راہب ابو عامر کو بطور رئیس و حاکم نامزد کیا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے ایک مسجد بھی تعمیر کی، جو بعد میں مسجد ضرار کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ رسول اکرمؐ کی روانگی کے بعد مدینہ کو لوٹ لیں اور آپ کے تمام پیروکاروں کو قتل کر دیں۔ نیز یہ کہ ان کے کچھ آدمی رسول اکرمؐ کے ساتھ بھی جائیں اور موقع پا کر تبوک کے راستے ہی میں آنحضرتؐ کو قتل کر دیں۔ تاکہ وہ اپنے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے اور مملکت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اس کے علاوہ بعض منافقین نے دومۃ الجندل کے بادشاہ سے خط و کتابت بھی کی اور اسے لکھا کہ اگر تم مدینہ پر حملہ کرو تو ہم تمہارے ساتھ مل کر محمدؐ کو ختم کر دیں گے۔

منافقین کی ان خفیہ سرگرمیوں اور جوابی انقلاب کے امکان کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ رسول اکرمؐ کسی کو اپنا جانشین مقرر فرمائیں اور مدینہ کا نظم و نسق ایک ایسے شخص کے سپرد کر دیں، جو ہر لحاظ سے خود آپ سے مشابہ ہو۔ وہ ایک ایسا آدمی ہو جو ذاتی قوت سے کام لے کر دینی اور ملی مفادات کی حفاظت کر سکتا ہو۔ نیز اپنے تقویٰ، فضیلت، صداقت اور امور سلطنت سے واقفیت میں سب سے بہتر و بالاتر ہو۔ نیز یہ کہ وہ کسی گروہ اور جمعیت سے وابستہ نہ ہو، کسی قیمت پر خریدا نہ جا سکتا ہو، افواہوں سے خوفزدہ اور دھمکیوں سے مرعوب نہ ہوتا ہو۔

چنانچہ رسول اکرمؐ نے تمام مسلمانوں پر نگاہ ڈالی، جن میں سے تقریباً

تیس ہزار سپاہی اور افسر تھے۔ پھر ان میں سے کئی ایک تو بڑے قابل اور آزمودہ کار بھی سمجھے جاتے تھے، لیکن آنحضرتؐ نے امام علیؑ کے علاوہ کسی اور کو اپنی جانشینی کے لائق نہ سمجھا۔ حتیٰ کہ تمام شیعہ اور سنی اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرتؐ نے انہیں اس منصب کا اہل قرار دیا اور دارالحکومت مدینہ ان کے سپرد کر دیا۔ پھر آپ اسلامی سپاہ کو لے کر اطمینان کے ساتھ محاذ جنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔

شاید یہاں یہ سوال کیا جائے کہ رسول اکرمؐ نے ان سازشیوں کو گرفتار کر کے سزا کیوں نہ دی یا کم از کم قید خانے میں کیوں نہ ڈال دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پیغمبروں اور سیاست دانوں کے طرزِ عمل میں بہت فرق ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک سیاست دان کے نقطۂ نگاہ کے مطابق کسی سازش پر عمل درآمد ہونے سے پہلے اس میں شریک تمام افراد کو سزا دینی چاہیے لیکن ایک آسمانی پیشوا کے نظریے کے مطابق ارتکاب جرم سے پہلے کسی شخص کو گرفتار کرنے۔ سزا دینے۔ جلاوطن کرنے یا قید میں ڈالنے کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔

اس طرح امام علیؑ مدینہ میں رہ گئے، شہر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جو فرائض ان کے سپرد کیے گئے تھے، انہیں انجام دینے میں مشغول ہو گئے۔ یہ دیکھ کر منافقین سمجھ گئے کہ ان کا منصوبہ خاک میں مل گیا ہے، کیونکہ وہ امام علیؑ کو خوب جانتے تھے۔ نیز آپ کی شجاعت۔ ہوشمندی۔ ثابت قدمی اور درخشاں کارنامے بھی کسی سے پوشیدہ نہ تھے۔ لہٰذا ان پر ناامیدی اور مایوسی چھا گئی اور انہیں پتا چل گیا کہ امام علیؑ کے مدینہ میں موجود ہوتے ہوئے وہ (یعنی منافقین) کچھ بھی نہ کر پائیں گے۔ بلکہ

وہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالیں گے، اس میں ان کو رسوائی اور بدبختی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ان حالات میں انہوں نے سیاسی ضرورت کے تحت افواہیں پھیلانا شروع کر دیں۔ ان کا خیال تھا کہ شاید ان ہوائیوں سے متاثر ہو کر امام علیؑ مدینہ چھوڑ کر رسول اکرمؐ سے جا ملیں گے۔

وہ کہنے لگے: اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اکرمؐ، علیؑ کو جنگ میں اپنے ساتھ نہ لے جائیں لیکن اس جنگ میں وہ انہیں اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آنحضرتؐ ان سے خفا ہیں۔ اگرچہ ان بے بنیاد باتوں نے کچھ سیدھے سادے لوگوں کو ضرور متاثر کیا، لیکن سمجھدار لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ سب کچھ شرپسند منافقوں کا کیا دھرا ہے۔

چونکہ ان افواہوں کے سلسلے کو ختم کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس لیے امام علی فوراً ہی روانہ ہوئے اور مدینہ کے باہر رسول اکرمؐ سے جا ملے اور گروہ منافقین کی کہی ہوئی تمام باتیں آپ کے گوش گزار کیں۔ اس پر رسول اکرمؐ نے سب لوگوں کے سامنے واضح اور واشگاف الفاظ میں کہا:

> اے علیؑ! مدینہ کا انتظام میرے یا تمہارے بغیر نہیں چل سکتا۔ تم میرے اہل وعیال، میرے مقام ہجرت مدینہ اور میری قوم کے درمیان میرے جانشین ہو۔ کیا تم اس بات پر راضی اور خوش نہیں ہو کہ تمہیں میرے ساتھ وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ سے تھی۔ بجز اس امر نبوت کے کیونکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

یہ حدیث منزلت ہے اور شیعہ وسنی محدثین نے اسے نقل کیا ہے۔ اس

میں رسول اکرمؐ نے منافقوں کے منصوبوں اور سازشوں کی جانب اشارہ کیا اور فرمایا ہے کہ ان کو بے اثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ خود آنحضرتؐ یا امام علیؑ مدینہ میں موجود ہوں۔ نیز کسی جنگ کی غرض سے یہ آنحضرتؐ کا آخری قصد سفر تھا، جس میں آپ نے مدینہ میں امام علیؑ کو اپنا جانشین بنایا۔ اس طرح لوگوں پہ یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ جب آپ ابدی سفر پہ روانہ ہوں تو امام علیؑ ہی آپ کے حقیقی جانشین ہوں گے۔

اس کے بعد امام علیؑ مدینہ واپس آگئے اور وہاں کے نظم ونسق میں مصروف ہو گئے۔ اِدھر رسول اکرمؐ بھی اسلامی سپاہ کے ہمراہ تبوک کی جانب چل دیے۔ اس سفر میں طویل فاصلے اور سامانِ خورد و نوش کی کمی کے باعث مسلمانوں کو شدید تکلیفوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی حالت یہ تھی کہ ہر دس آدمیوں کے پاس سواری کے لیے ایک اونٹ تھا۔ جس پر ان میں سے ہر ایک تھوڑی دیر کے لیے سوار ہو جاتا تھا اور باقی نو ساتھی پیدل چلتے تھے۔ نیز ان کی خوراک اَن چھلنے جو کی روٹیاں اور گھٹیا قسم کی کھجوریں تھیں اور بدقسمتی سے وہ بھی ضرورت سے بہت کم اور ناکافی ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک شخص کھجور کا ایک دانہ منہ میں ڈال کر اسے چوستا اور جب اس کا منہ میٹھا ہو جاتا تو وہ اس کھجور کو اپنے منہ سے نکال کر دوسرے کو دے دیتا۔ پھر وہ بھی اسے تھوڑی دیر تک چوسنے کے بعد تیسرے کو دے دیتا تھا۔ اس طرح کھجور کے ایک ایک دانے کو کئی کئی آدمی باری باری چوستے، حتیٰ کہ وہ ختم ہو جاتی تھی۔

یوں اسلام کے سپاہی بھوک اور موت کا مقابلہ کرتے رہے اور انہوں نے ان مشکل حالات میں اپنے دین اور وطن کا دفاع کیا۔

بلاشبہ ان باایمان اور دین اسلام پہ فدا ہونے والے مسلمانوں کے لیے دعائے خیر کرنا چاہیے اور انہیں ان کی ثابت قدمی پر آفریں کہنا چاہیے۔

آخرکار مسلمانوں نے تبوک میں پڑاؤ جا ڈالا۔ تب رسول اکرمؐ نے قیصر روم کو ایک خط لکھا اور اسے اختیار دیا کہ وہ اسلام قبول کرے یا جزیہ ادا کرے یا جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ جب آنحضرتؐ کا وہ خط ہرقل کو ملا تو اس نے بعض سربرآوردہ اشخاص کو اپنے پاس بلایا۔ جب وہ آ گئے تو اس نے یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا اور کہا:

> حضرت عیسیٰؑ نے ایک آنے والے پیغمبر کی جو نشانیاں بتائی ہیں، وہ سب حضرت محمدؐ میں موجود ہیں۔ لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ ہم اسلام اختیار کرلیں اور حق سے روگردانی نہ کریں۔

لیکن ان لوگوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا اور شور و غل مچانے لگے۔ تاہم ہرقل نے انہیں خاموش کرا دیا اور اپنے تخت و تاج کو بچانے کی خاطر اس موضوع پہ مزید کوئی بات نہ کہی۔ ان حالات میں اس نے آنحضرتؐ کے خط کا جواب دینے میں لیت و لعل سے کام لیا، نیز جنگ کے لیے بھی کوئی اقدام نہ کیا اور اس معاملے کو تعویق میں ڈال دیا۔

جب رسول اکرمؐ نے قیصر کی طرف سے جنگ کے کوئی آثار نہ دیکھے تو آپ نے مسلمانوں کے مشورہ سے مدینہ مراجعت فرمائی۔ واپسی کے اس سفر میں خالد بن ولید نے دومۃ الجندل کے حاکم کو گرفتار کر لیا اور یوں اس کا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ نیز تبوک کے بعض نواحی علاقوں کے حاکم بھی رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ کے ساتھ صلح کے معاہدے کر لیے۔

مباہلہ

مکہ اور مدینہ کے درمیان نجران نام کا ایک شہر واقع تھا۔ وہاں کے باشندے پہلے بت پرست تھے، پھر یہودیت کے پیرو بن گئے اور کچھ مدت گزرنے کے بعد ایک عیسائی کی تبلیغ کے نتیجے میں دینِ مسیحؑ میں داخل ہو گئے۔

حمیر کا بادشاہ ذونواس یہودی تھا اور وہ یہودیت کو ہر جگہ سرکاری مذہب کے طور پر رائج کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے نجران پر حملہ کیا اور کئی ایک عیسائیوں کو زندہ جلا دیا۔ [1]

اگرچہ اس حملے میں بہت سے عیسائی مر گئے تھے لیکن ذونواس کے

---

[1] یہ داستان اس کتاب کے ابتدائی حصے میں "اصحاب اخدود" کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے۔

زوال کے بعد عیسائیت کو دوبارہ فروغ حاصل ہوا اور لوگ اس مذہب کی طرف راغب ہوگئے۔ نجران میں خانۂ کعبہ کے مقابلے پہ ایک عبادت گاہ بھی تعمیر کی گئی جس میں بہت سے عیسائی علماء اور راہب عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

اس زمانے میں یہ تین افراد نجران کی اہم ترین شخصیتیں شمار ہوتے تھے۔ ان میں سے پہلا شخص عاقب "عبدالمسیح" حاکم نجران تھا۔ دوسرا ایہم معروف بہ "سید" جو معاشرے کا نمائندہ تھا۔ تیسرا ابوحارثہ بن علقمہ جو نجران کا روحانی پیشوا اور لاٹ پادری تھا۔

رسول اکرمؐ نے نجران کے لوگوں کو اسلام کی جانب دعوت دینے کی غرض سے وہاں کے لاٹ پادری کو ایک خط لکھا کہ جس کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ خط محمد رسول اللہؐ کی جانب سے نجران کے اسقف کے نام ہے۔

تم لوگ اسلام قبول کر لو اور کلمہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کرو۔ اگر تم ایسا کرو تو میں تمہارے سامنے اس خدا کی حمد کرتا ہوں جو حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا خدا ہے۔ اس کے بعد میں تمہیں غیر خدا کی پرستش کی ذلت سے نکلنے اور خدا کی پرستش کی عزت پانے کی دعوت دیتا ہوں۔ نیز بندوں کی ولایت اور حکومت کی بجائے پروردگار عالم کی ولایت کی طرف بلاتا ہوں۔ اگر تم کو اسلام قبول کرنے سے انکار ہے تو پھر تمہیں قانون کے مطابق جزیہ ادا کرنا ہوگا اور اگر تم اس کے لیے بھی آمادہ نہیں تو

میں تمہارے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں۔ والسلام

یہ خط رسول اکرمؐ کے چار اصحاب کے توسط سے نجران بھیجا گیا۔ جب اسقف نے یہ خط پڑھا تو وہ بیحد خوفزدہ اور پریشان ہوا۔ لہذا اس نے اس معاملے کا کوئی حل تلاش کرنے کی خاطر سربرآوردہ اشخاص کو بلا کر انہیں اس سے آگاہ کیا اور ان سے رائے مانگی۔

شرجیل کہ جو نجران کا ایک لائق آدمی تھا اور اس کو اسی وجہ سے بلایا گیا تھا' اس نے کہا: تم خود جانتے ہو کہ خدا نے ابراہیم خلیل اللہؑ سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ان کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی ذریت میں سے ایک پیغمبر کو مبعوث کرے گا۔ تاہم میں اس معاملے میں کوئی رائے دینے کا اہل نہیں ہوں۔ ہاں اگر کوئی اجتماعی یا سیاسی مسئلہ ہوتا تو میں اپنی رائے کا اظہار کر سکتا تھا۔

جو اشخاص بلائے گئے تھے' ان میں حمیر کا ایک سرکردہ شخص عبداللہ بن شرجیل تھا۔ اس نے بھی اپنے آپ کو نبوت اور رسالت کے بارے میں کوئی رائے دینے کا اہل نہ سمجھا اور کہا: میں تمہیں دنیاوی اور اجتماعی امور کے بارے میں کوئی مشورہ دے سکتا ہوں' لیکن نبوت کے معاملات کا مجھے کوئی خاص علم نہیں ہے۔

جبار بن فیض وہ تیسرا شخص تھا' جسے مشورہ کے لیے بلایا گیا تھا۔ اس نے بھی پہلے دو اشخاص سے ملتا جلتا جواب دیا اور خود کو اس معاملے میں دخل دینے کے قابل نہ پایا۔

ظاہر ہے کہ جہاں تک دینی معلومات کا تعلق تھا' اسقف کو دوسروں سے مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ تاہم اسے جو فکر لاحق تھی وہ یہ تھی

کہ نجرانیوں کے اسلام قبول کرنے سے کہیں اس کی اپنی سرداری ختم نہ ہو جائے۔

جب اس صلاح مشورے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو اسقف نے مناسب سمجھا کہ عامتہ الناس سے رجوع کر کے ان سب کا نقطہ نظر معلوم کیا جائے۔ چنانچہ لوگوں کی اکثریت کا خیال یہ تھا کہ اپنا ایک وفد مدینے بھیجا جائے جو محمدؐ کے بارے میں تحقیقات کر کے اپنی رائے دے۔ پھر ارکان وفد کی رائے کے پیش نظر اس امر کا قطعی فیصلہ کیا جائے۔

یہ بات طے ہو جانے کے بعد حاکم نجران اور اسقف کی سربراہی میں چھ اشخاص پر مشتمل ایک وفد مدینہ روانہ ہو گیا۔ راستے میں اسقف کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ زمین پہ گر گیا۔ اس پر اس کے بھائی نے جو اس کے ہمراہ تھا، رسول اکرمؐ کے بارے میں کچھ نازیبا الفاظ کہے۔ اسقف کو اس کی حرکت پر بے حد غصہ آیا اور اسے لعنت ملامت کرتے ہوئے کہا: تم محمدؐ کے بارے میں ایسی بدزبانی کیوں کرتے ہو؟ وہ وہی موعود پیغمبر ہیں جن کا ہم انتظار کر رہے ہیں۔

اس کے بھائی نے کہا: اگر یہ بات ہے تو تم ان کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ اور مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟

اسقف نے جواب دیا: یہ تمام مال و دولت اور خدم و حشم ہمیں عیسائیوں نے دیا ہے اور وہ مسلمان ہونے پر راضی نہیں ہیں۔ اگر ہم اسلام کے پیرو بن جائیں تو ان تمام فوائد اور مراعات سے محروم ہو جائیں گے۔ اس بات نے اسقف کے بھائی کو بہت متاثر کیا اور جب وہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مسلمان ہو گیا۔

بہرحال اس وفد کے ارکان گرانبہا ریشمی لباس زیب تن کیے اور

سونے کی انگوٹھیاں پہنے ہوئے مدینہ پہنچے اور مسجد میں رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب آنحضرتؐ نے ان کی وضع قطع دیکھی تو ان کے سلام کا جواب نہ دیا اور ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

اہل نجران اس سج دھج کے ساتھ اس لیے آئے تھے تاکہ مسلمان ان کی شان و شوکت سے مرعوب ہو جائیں، لیکن جب رسول اکرمؐ نے ان سے بے اعتنائی برتی تو عام مسلمانوں نے بھی ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ گویا آنحضرتؐ نے عملی طور پر ان کی تادیب کی اور انہیں سمجھایا کہ انسان کی شخصیت کا دارومدار عمدہ لباس اور سونے کی انگوٹھیوں پر نہیں ہے۔

چنانچہ اس وفد کے ارکان تین دن تک مدینہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ آخرکار امام علیؑ کی فہمائش پر انہوں نے اپنی وضع تبدیل کر لی۔ انہوں نے معمولی کپڑے پہن لیے، زیورات اتار دیے اور پھر رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تب آنحضرتؐ نے ان کی پذیرائی کی اور ان سے گفتگو شروع کر دی۔

اس سلسلے میں اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ نجرانیوں نے اپنے دینی مراسم مسجد نبوی میں ادا کیے۔ گو مسلمانوں کو یہ بات ناگوار گزری، لیکن رسول اکرمؐ نے انہیں کھلی اجازت دیدی کہ وہ اپنے دینی مراسم مسجد میں انجام دیں۔ یوں آپ نے ثابت کر دیا کہ اسلام آزادی کا دین ہے، جس میں غیر مسلموں کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ مسلمانوں کی مسجدوں میں آئیں، کلام الٰہی سنیں اور ہدایت پائیں۔

نجرانیوں نے رسول اکرمؐ سے اپنی گفتگو کے آغاز میں یہ سوال کیا: آپ ہمیں کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں؟

رسول اکرمؐ نے فرمایا: میں تمہیں خدائے واحد پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہوں جس کا کوئی شریک اور مثل نہیں ہے۔ میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ میں اس کا نبی اور رسولؐ ہوں۔ نیز میں تمہیں اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے بندے اور اس کی مخلوق ہیں۔

انہوں نے کہا: اگر واقعی حضرت عیسیٰؑ خدا کے بندے ہیں اور اسکے بیٹے نہیں ہیں تو پھر ان کا باپ کون ہے؟

آنحضرتؐ نے وحی کے مطابق فرمایا: تم لوگ حضرت آدمؑ کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہو؟ کیا وہ خدا کے بندے اور مخلوق تھے یا نہیں؟

انہوں نے کہا: ہاں! وہ خدا کے بندے تھے۔

تب آنحضرتؐ نے پوچھا: ان کا باپ کون تھا؟

اس پر عیسائی حیران رہ گئے کہ اس سوال کا کیا جواب دیں! اس پر رسول اکرمؐ نے انہیں یہ آیت پڑھ کر سنائی:

خدا کے نزدیک عیسیٰؑ کی حالت آدمؑ جیسی ہے کہ ان کو مٹی سے بنایا اور کہا کہ ہو جا' تو وہ انسان ہو گئے۔

(سورۂ آل عمران - آیت ۵۹)

تاہم نجران کے عیسائی اصول مناظرہ پر قائم نہ رہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ تسلیم نہ کیا کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے نہیں' اس کے بندے ہیں۔ چونکہ اس بحث اور استدلال کا کوئی نتیجہ نہ نکلا' اس لیے رسول اکرمؐ نے انہیں مباہلہ کی دعوت دیدی۔ یعنی دونوں فریق خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر لعنت کریں' تاکہ

جو فریق حق پر نہیں اور جھوٹا ہے وہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو جائے۔

نجرانیوں نے اس تجویز کو ایک معمولی چیز سمجھا اور رسول اکرمؐ سے مباہلہ کرنے کی حامی بھرلی لیکن بعد میں جب اس معاملے کی اہمیت ان کی سمجھ میں آئی تو وہ سخت پریشان ہوئے۔

اگلی صبح مدینہ کے بہت سے لوگ مباہلہ کا منظر دیکھنے کے لیے شہر کے باہر جمع ہو گئے۔ اسی اثنا میں انھوں نے دیکھا کہ رسول اکرمؐ حسنؑ کو انگلی پکڑائے اور حسینؑ کو کندھے پر اٹھائے تشریف لا رہے ہیں۔ جب کہ ان کے پیچھے پیچھے اسلام کی بزرگوار خاتون فاطمہ زہراؑ اور ان کے عقب میں امام علیؑ تھے۔ پھر آنحضرتؐ مباہلہ کے لیے معینہ مقام پر رونق افروز ہوئے۔

تمام شیعہ اور سنی مؤرخین اور مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ علیؑ، فاطمہؑ اور حسنینؑ کہ جو آیت مباہلہ کے مصداق تھے۔ رسول اکرمؐ ان کے علاوہ کسی اور کو اپنے ہمراہ نہیں لے گئے۔ نیز اس دن آپ نے واضح الفاظ میں فرمایا:

اے پروردگار! یہ میرے اہل بیتؑ ہیں۔

نجران کے عیسائی جو دور سے رسول اکرمؐ کی آمد کا منظر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی توقع کے خلاف مشاہدہ کیا کہ آنحضرتؐ کے ہمراہ کوئی بہت بڑی جماعت نہیں۔ صرف ایک مرد، ایک عورت اور دو بچے ہیں۔ تب انہوں نے پوچھا: جو لوگ رسول اکرمؐ کے ہمراہ ہیں۔ ان کا آپ سے کیا رشتہ ہے؟ انہیں بتایا گیا: یہ وہ لوگ ہیں جو آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ ان میں سے ایک آپ کی بیٹی فاطمہؑ،

دوسرے آپ کے چچازاد اور داماد علیؑ اور آپ کے نواسے حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔

شرجیل کہ جو ایک دانا شخص تھا اور نجران کے وفد میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: خدا کی قسم! میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر وہ خدا سے دعا مانگیں کہ وہ پہاڑ اپنی جگہ سے سرک جائے تو خدا ان کی دعا رد نہیں کرے گا۔ لہٰذا تم لوگ مباہلہ سے باز آؤ۔ کیونکہ آج تک کوئی ایسا شخص نہیں ہوا کہ جس نے کسی پیغمبر سے مباہلہ کیا ہو اور وہ ہلاک نہ ہوا ہو۔

تب اس قوم کے دانشمند لوگوں کا ایک گروہ نجران کے حاکم عاقب کے پاس پہنچا اور اس سے صلاح مشورہ کیا۔ عاقب نے کہا: اے لوگو! تم بخوبی جانتے ہو کہ محمدؐ وہی پیغمبر ہیں، جن کی بشارت حضرت عیسیٰؑ نے دی ہے۔ اگر وہ تمہارے حق میں بددعا کریں گے تو تم سب کے سب ہلاک ہو جاؤ گے۔

شرجیل نے کہا: میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ اس سے بھی کہیں زیادہ اہم اور خطرناک ہے، جتنا کہ آپ لوگ سمجھ رہے ہیں۔ کیونکہ اگر محمدؐ دنیا دار آدمی ہوتے اور انہیں حکومت کی خواہش ہوتی تو ہم وہ پہلے لوگ ہوتے جن سے وہ جنگ کرتے لیکن جو آثار اور نشانیاں ہم نے دیکھی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ خدا کے رسولؐ ہیں۔ لہٰذا اگر ہم ان سے مباہلہ کریں گے تو تباہ ہو جائیں گے۔ پس بہتر یہی ہے کہ اب ہم اس معاملے کو مباہلے کی بجائے مصالحت کے ذریعے طے کریں۔ چونکہ محمدؐ ایک راستباز اور انصاف پسند شخص ہیں، اس لیے ہم انہیں کو ثالث منتخب کریں اور جو فیصلہ وہ دیں اسے قبول کریں۔

چنانچہ حاضرین جلسہ نے شرجیل کی رائے سے اتفاق کیا اور رسول اکرمؐ کو پیغام بھجوایا کہ آپ ہم سے مباہلہ نہ فرمائیں۔ اس کی بجائے آپ فریقین کی طرف سے ثالث کے فرائض انجام دیتے ہوئے مصالحت کرا دیں۔

اس مرحلے پر رسول اکرمؐ نے ان کی یہ تجویز قبول فرمائی اور پھر امام علیؑ کے ہاتھوں ایک صلحنامہ لکھوایا۔ جس میں نجرانیوں پر اتنا سالانہ جزیہ عائد کیا گیا کہ جسے وہ بہ آسانی ادا کر سکیں اور یوں یہ معاملہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

بہتر ہوگا کہ اس بحث کے خاتمے پر ہم ایک مختصر سا واقعہ بیان کر دیں جو "صحیح مسلم" میں نقل ہوا ہے:

عامر بن سعد بن ابی وقاص اپنے باپ سے نقل کرتا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک روز معاویہ نے مجھ سے کہا: تم ابوتراب (علیؑ) کو گالیاں کیوں نہیں دیتے؟ میں نے جواب دیا: میں نے رسول اکرمؐ سے تین ایسی چیزیں سنی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی میرے بارے میں ہوتی، تو میری نظر میں وہ دنیا کے بہترین اونٹوں سے زیادہ قیمتی ہوتی۔

۱۔ جنگ تبوک میں جب رسول اکرمؐ نے علیؑ کو مدینہ میں جانشین بنایا تو انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہؐ! کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں کا حاکم بنا رہے ہیں؟ تب آنحضرتؐ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تمہیں میرے ساتھ وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھی، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔

۲۔ خیبر کے دن رسول اکرمؐ نے فرمایا: کل میں اس شخص کو علم دوں گا، جو

خدا اور رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور خدا اور رسولؐ بھی اسے دوست رکھتے ہیں۔ اس وقت ہم میں سے ہر شخص کو یہ امید تھی کہ وہ شخص میں ہوں گا۔ لیکن جب اگلا دن آیا تو آنحضرتؐ نے فرمایا: علیؑ کو میرے پاس بلا لاؤ۔ اگرچہ وہ دردِ چشم میں مبتلا تھے، تو بھی انہیں آنحضرتؐ کی خدمت میں لایا گیا۔ تب رسول اکرمؐ نے اپنا لعابِ دہن ان کی آنکھوں پر لگایا اور ان کا درد زائل ہو گیا۔ پھر آپ نے وہ علم علیؑ کو دیا اور خدائے تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں مسلمانوں کو فتح نصیب کی۔

۲۔۔۔۔ جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے علیؑ۔ فاطمہؑ۔۔۔ حسنؑ اور حسینؑ کو طلب فرمایا اور کہا:

"اے پروردگار! یہ میرے اہل بیتؑ ہیں۔"

حجۃ الوداع

وہ رات کہ جس میں رسول اکرمؐ نے غمگین دل کے ساتھ مکہ سے خفیہ طور پہ ہجرت فرمائی اور اس مقدس سرزمین کو خدا حافظ کہا تھا۔ اس رات سے لے کر آخر عمر تک آپ نے فقط تین مرتبہ مکہ جانے کا قصد فرمایا۔

مکہ کے پہلے سفر میں آپ کو قریش کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر صلحنامہ حدیبیہ طے پایا۔ لیکن جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے، اس سال آنحضرتؐ حج نہ کر سکے۔ آپ نے دوسرا سفر فتح مکہ کے موقع پہ کیا۔ جس میں آپ نے خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک فرمایا تھا لیکن وہ حج کا وقت نہ تھا۔ لہٰذا اس کو سفرِ حج کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

پھر ہجرت کے دسویں سال میں رسول اکرمؐ کو حکم ملا کہ وہ خط اور منادی کے ذریعے دور و نزدیک کے لوگوں کو حج کی خاطر مکہ معظمہ آنے کی دعوت دیں۔ چنانچہ جو لوگ استطاعت رکھتے تھے وہ آنحضرتؐ کے

ہمراہ سفرِ حج پر روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں انھوں نے آنحضرتؐ کے اعمال کا بڑی گہری نظر کے ساتھ مشاہدہ کیا تاکہ مناسکِ حج سیکھ لیں اور آپ کے قول و فعل کے مطابق عمل کریں۔

چنانچہ جب ماہ ذی قعدہ کے ختم ہونے میں چار دن باقی رہ گئے، تو اس قافلے نے مدینے سے باہر خیمے گاڑ دیے۔ ظاہر ہے کہ جس قافلے کے سالار رسول اکرمؐ ہوں، لازماً وہ بڑی شان و شوکت اور شکوہ و جلال کا مالک ہو گا۔

کہا جاتا ہے کہ اس سفر میں ایک لاکھ چوبیس ہزار عورتیں اور مرد رسول اکرمؐ کے ہمرکاب مکہ جا رہے تھے۔ مسجد شجرہ کہ جو مدینہ کے باشندوں کا میقات ہے۔ جب وہ لوگ وہاں پہنچے تو انہوں نے احرام باندھ لیے اور تلبیہ پڑھنے لگے:

لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ

حتٰی کہ وہ فضا ان کی آوازوں سے گونج اٹھی۔

اس طرح ۴ ذی الحجہ کو یہ پُروقار قافلہ مکہ پہنچ گیا۔ یہ وہی مکہ تھا، جو چند سال پہلے تک عربوں کا بت خانہ تھا لیکن اب یہاں توحید کا نور چمک رہا تھا اور گھر گھر سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی صدا بلند ہو رہی تھی۔

رسول اکرمؐ مسجد الحرام کے دروازے پر رک گئے۔ خدائے تعالیٰ کی حمد و ثنا بجالائے اور معمار کعبہ حضرت ابراہیمؑ پر سلام بھیجا۔ پھر حرم کعبہ میں قدم رکھا اور طواف میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے حجر اسوؑ کو مس کیا، اسے بوسہ دیا اور مقام ابراہیمؑ پر دو رکعت نماز ادا کی۔

اس کے ساتھ ہی آپ چاہ زمزم پر تشریف لے گئے۔ اس کا پانی پیا اور ایک دعا پڑھی۔ بعد ازاں آپ حجر اسود کی طرف واپس آئے اور اس پر ہاتھ پھیرا۔ پھر صفا کی طرف گئے اور پوری توجہ اور خضوع کے ساتھ صفا و مروہ کے درمیان سعی بجالائے۔

یوں ۸ ذی الحجہ تک رسول اکرمؐ نے مکہ میں توقف فرمایا اور اسی دن ظہر کے وقت منٰی روانہ ہوگئے۔ چنانچہ وہاں آپ نے ظہر و عصر، مغرب و عشاء اور صبح کی نمازیں مسلمانوں کے ساتھ ادا کیں۔

۹ ذی الحجہ کی صبح کو آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ عرفات روانہ ہوگئے۔ ظہر کے وقت آپ نے غسل فرمایا اور عرفات میں داخل ہوئے۔ وہاں آپ نے مسلمانوں کے عظیم اجتماع میں ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں آپ نے لوگوں کو تقویٰ اور پاکدامنی اختیار کرنے کی وصیت کی۔ نیک اور شائستہ کام انجام دینے کی دعوت دی اور سود خوری کو قوانین اسلام کے خلاف قرار دیا۔ نیز آپ نے زمانۂ جاہلیت کے بے بنیاد رسم و رواج پر خط تنسیخ پھیر دیا اور لوگوں کو شیطان کے شر سے بچنے کی تاکید فرمائی۔ پھر زن و شوہر کی باہمی ذمہ داریوں کے بارے میں فرمایا:

> میرے لائے ہوئے دین میں عورتوں کے مردوں پر اور مردوں کے عورتوں پر کچھ حقوق ہیں جن کا ادا کرنا ضروری ہے۔
> عورتوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے شوہروں کے سوا کسی اور کو اپنے نزدیک نہ آنے دیں اور خود کو گناہ اور بدکاری سے آلودہ نہ کریں۔ مردوں پر فرض یہ ہے کہ وہ اپنی بیویوں کو خوراک اور پوشاک مہیا کریں۔ نیز عورت

کو خدا کی امانت سمجھیں اور اس کو عزیز رکھیں۔ خدا نے تمام انسانوں کو مٹی سے پیدا کیا ہے اور سبھی کو خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ فقط وہی شخص دوسروں سے زیادہ معزز ہے جو زیادہ پارسا اور پرہیزگار ہو۔

جو لوگ اس صحرا میں میری باتیں سن رہے ہیں، وہ انھیں ان لوگوں تک پہنچا دیں جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں۔ کیونکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس سال کے بعد میں تم سے ملاقات نہ کر سکوں۔

۹ ذی الحجہ کو سورج غروب ہونے کے بعد آپ نے عرفات سے مشعر کا قصد فرمایا۔ وہاں آپ نے مغرب و عشاء کی نماز ادا کی اور وہ رات بھی وہیں بسر کی۔ صبح کی نماز ادا کرنے اور سورج طلوع ہونے کے بعد آپ مشعر سے منیٰ میں آگئے اور وہاں رمیٔ جمرات اور قربانی کی رسوم بجا لائے۔ اسی دن آپ نے سر کے بال منڈائے اور پھر خانہ کعبہ روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر آپ نے خانۂ خدا کا طواف کیا، صفا و مروہ کے درمیان سعی انجام دی اور پھر واپس منیٰ پہنچے۔ آپ ایام تشریق کے آخری دن یعنی ۱۳ ذی الحجہ تک وہیں رہے۔ آپ نے اس دن بھی رمیٔ جمرات کی پھر مکہ معظمہ لوٹ آئے۔

اس طرح مناسک حج اختتام کو پہنچے اور رسول اکرمؐ مکہ سے واپس مدینہ روانہ ہو گئے۔ جو لوگ آنحضرتؐ کے ساتھ حج کے لیے آئے تھے ان کی اکثریت واپسی کے وقت بھی آپ کے ہمرکاب تھی۔ جیسا کہ شیعہ اور سنی مورخین نے لکھا ہے ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ تھی۔

پھر دن گزرتے رہے اور یہ عظیم قافلہ بھی اپنی منزلیں طے کرتا رہا۔
حتیٰ کہ ۱۸ ذی الحجہ کو پنجشنبہ کے دن غدیر خم کے مقام پر پہنچا۔
اس بے آب زمین پر شدید گرمی کے موسم میں رسول اکرمؐ کو حکم ملا کہ یہاں وہ لوگوں کو اسلام کے عظیم ترین اور نازک ترین معاملے سے آگاہ کریں یعنی اپنا خلیفہ اور جانشین نامزد کر کے لوگوں سے اس کا تعارف کرادیں۔ تاکہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ملتِ اسلامیہ پیشوا کے بغیر نہ رہ جائے اور غلط راستے پر نہ چل پڑے۔
ممتاز سنی علماء نے واقعۂ غدیر کے بارے میں جو کچھ نقل کیا ہے اس کی تفصیل آئندہ باب میں درج ہے۔

اکمالِ دین

حج کا قافلہ جحفہ کے نزدیک غدیر خم کے مقام پہ آ پہنچا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سے تین راستے نکلتے تھے۔ چنانچہ یہاں سے اسلام کا پرشکوہ "قافلہ" تین حصوں میں بٹ جاتا تھا۔ مصری لوگ ایک راستا، عراقی دوسرا اور اہل مدینہ تیسرا راستا اختیار کر لیتے تھے۔ تاہم یہ قافلہ ابھی مختلف حصوں میں بٹا نہ تھا اور تمام لوگ رسول اکرمؐ کے ہمرکاب تھے۔ چنانچہ انہی آخری لمحات میں آیہ بلغ "یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" نازل ہوئی۔ (سورہ مائدہ۔ آیت ۶۷)

مقامِ غور ہے کہ وہ بات کتنی اہم ہوگی، جسے لوگوں تک پہنچانے کے لیے خدائے تعالیٰ اپنے رسولؐ کو حکم دے رہا ہے۔ نیز فرما رہا ہے کہ اگر یہ فرمان لوگوں تک نہ پہنچایا تو گویا آپ نے خدا کے کسی حکم کی تبلیغ کی ہی نہیں۔

اصول کلام اور آیت کے سیاق کو مدنظر رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ یہ فرمان ان تمام احکام سے زیادہ اہم ہو جن کی رسول اکرمؐ نے اب تک تبلیغ کی ہے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ اپنے رسولؐ کو اطمینان دلا رہا ہے کہ لوگوں کو اس فرمان سے مطلع کرنے میں اگر تمہیں یا تمہارے دین کو دشمنوں کی طرف سے کوئی خطرہ لاحق ہوا تو خدا تمہارا حافظ اور نگہبان ہوگا۔

جب سورج نصف النہار پر تھا اور حجاز کی جھلسا دینے والی دھوپ سیدھی لوگوں کے سروں پر پڑ رہی تھی اور قافلے کا ایک حصہ جحفہ پہنچ چکا تھا۔ عین اسی وقت رسول اکرمؐ نے حکم دیا کہ قافلہ رک جائے اور جو لوگ آگے چلے گئے ہوں انہیں واپس بلا لیا جائے اور جو لوگ ابھی پیچھے ہوں ان کے پہنچنے کا انتظار کیا جائے۔

یہ بڑا گرم دن تھا۔ ظہر کی اذان ہوئی اور سائبانوں کے نیچے نماز جماعت ادا کی گئی۔ گرمی اتنی سخت تھی کہ اس سے بچاؤ کے لیے لوگوں نے عباؤں کا ایک ایک سرا اپنے سروں پر ڈال رکھا تھا۔ نماز کے بعد رسول اکرمؐ اس منبر پر تشریف لے گئے جو اونٹوں کے پالانوں سے بنایا گیا تھا۔ وہ عظیم اجتماع کہ جس کا ہر فرد آپ کے ارشادات سننے کے لیے سراپا گوش تھا۔ اس کے روبرو آپ نے یہ خطبہ بہ آواز بلند ارشاد فرمایا:

حمد و ثنا خدائے واحد و بے مثل کے لیے مخصوص ہے۔ ہم اپنی زندگی کے تمام مرحلوں میں اس کی مقدس ذات سے مدد مانگتے ہیں اور اس قادر کو دیکھے بغیر اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم اپنے تمام معاملات میں اس پر بھروسا کرتے ہیں اور نفس امارہ کے شر اور اپنے ناروا اعمال کی

برائیوں سے اس کی پناہ مانگتے ہیں۔ وہ وہی خدا ہے کہ اگر وہ کسی کو اس کے حال پہ چھوڑ دے اور اس پہ مہربانی نہ فرمائے تو اسے کوئی بھی ہدایت نہیں دے سکتا۔ نیز جس کسی کو وہ اپنے نورِ ہدایت کے پرتو میں جگہ دے تو اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اس کا بندہ اور اس کا رسولؐ ہے۔ اما بعد۔

اس وقت جو قرائن موجود ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ میرا وقت آخر قریب ہے۔ چنانچہ میں خدا کا یہ بلاوا قبول کر کے تمہاری اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ قیامت میں میں بھی اور تم بھی خدا کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں گے۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟

تب لوگوں نے ہر طرف سے پکار کر کہا: اے رسول محترمؐ! ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے خدائے تعالیٰ کے احکام ہم تک پہنچا دیے۔ آپ نے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنے اور خدا کے بندوں کو سیدھے راستے پر چلانے کی پوری کوشش فرمائی۔ خدا آپ کو اس کی جزائے خیر دے۔

آپؐ نے فرمایا: کیا تم ان باتوں کی شہادت نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اس کا بندہ اور رسولؐ ہے؟ کیا بہشت، دوزخ، موت اور قیامت برحق ہیں اور خدا قیامت کے دن اپنے سب بندوں کو حساب کتاب کے لیے زندہ کرے گا؟ انہوں نے جواب دیا ہم ان تمام باتوں کی گواہی دیتے ہیں۔

پھر آپ نے فرمایا: اے لوگو! قیامت کے دن تم سب میرے سامنے آؤ گے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ تم ان دو بہترین اور قیمتی امانتوں

کے ساتھ کیا سلوک کروگے جو میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے دریافت کیا: وہ دو امانتیں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: ان میں سے بڑی امانت تو خدائے تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید ہے جو ایک طرف سے اس کی مقدس ذات سے اور دوسری طرف سے تم لوگوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ پس تم اس ارتباط اور واسطہ کی حفاظت کرنا اور اس مقدس کتاب سے رہنمائی حاصل کرتے رہنا تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ۔ دوسری امانت میری عترت اور اہل بیت ہیں اور خدا نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہونے والے نہیں ہیں لہذا تم بیدار رہو اور ان دونوں کے ساتھ اپنی ہم آہنگی کی حفاظت کرو۔ تاکہ غلط راستے پر نہ چل پڑو۔

ان ارشادات کے بعد خاتم النبیینؐ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور امام علیؑ کے بازو پکڑ کر انہیں اٹھا لیا' تاکہ دور اور نزدیک کے لوگ ان کو دیکھ لیں۔ پھر آپ نے فرمایا: اے لوگو! کون شخص ہے جو مومنین کے لیے خود ان کی جانوں سے اولیٰ ہے۔ انہوں نے جواب دیا: اس بارے میں خدا اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: بلاشبہ خدائے تعالیٰ میرا مولا ہے' میں مومنین کا مولا ہوں اور میں ان کے لیے خود ان کی جانوں سے اولیٰ ہوں۔ پھر تین مرتبہ اور احمد بن حنبل کے بقول چار مرتبہ فرمایا:

جس کا میں مولا ہوں' علیؑ بھی اس کے مولا ہیں۔

پھر فرمایا: اے پروردگار! جو شخص علیؑ کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو اسے دشمن رکھے تو بھی اسے دشمن رکھ۔

جو علیؑ سے محبت کرے، اس سے محبت رکھ اور جو علیؑ سے نفرت کرے اس سے نفرت کر۔ جو علیؑ کی مدد کرے اس کی مدد کر اور جو اس کو چھوڑ دے تو بھی اس کو چھوڑ دے اور حق کو ادھر کردے جدھر علیؑ ہو۔

اے لوگو! جو یہاں حاضر ہیں، وہ میری یہ باتیں غیر حاضر لوگوں تک پہنچائیں۔

اے لوگو! بلاشبہ خدائے تعالیٰ نے علیؑ کو تمہاری امامت اور ولایت پر مقرر فرمایا ہے اور اس کی اطاعت ہر مسلمان پر واجب قرار دی ہے۔ جو شخص اس کے برخلاف قدم اٹھائے گا، اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔ پس سنو اور اطاعت کرو کہ خدائے تعالیٰ تمہارا مولا اور علیؑ تمہارا امام ہے۔ اس کے بعد بھی میرے فرزندوں ہیں ــــــ جو علیؑ کے صلب سے ہوں گے ــــــ روز قیامت تک امامت برقرار رہے گی۔ علیؑ میرے بعد سب لوگوں سے افضل ہے۔ میں یہ بات جبرئیل امینؑ سے سن کر کہہ رہا ہوں کہ جو اسے خدائے تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں۔

قرآن کے محکمات کو سمجھو اور اس کے متشابہات کی پیروی نہ کرو۔ ہاں سوائے اس (علیؑ) کے جس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے، کوئی شخص تمہارے لیے قرآن مجید کی تفسیر بیان نہیں کرسکتا۔ پس جس شخص کا میں مولا ہوں، یہ علیؑ بھی اس کا مولا ہے۔ آگاہ رہو کہ میں نے خدا کا پیغام پہنچا دیا۔ میں نے رسالت کا حق ادا کردیا اور میں نے فرمانِ خدا کو وضاحت سے تمہارے سامنے بیان کردیا ہے۔ لہٰذا میرے بعد علیؑ کے علاوہ کوئی اور شخص مومنین کی رہبری کا حق نہیں رکھتا۔

اس اثنا میں جبرئیل امینؑ، رسول اکرمؐ کے پاس یہ آیت

لے کر حاضر ہوئے، جو قرآن مجید کی آخری آیت ہے۔

آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا، تم پر اپنی نعمت کو
پورا کر دیا اور دین اسلام کو تمہارے لیے پسند کر لیا۔
(سورۂ مائدہ - آیت ۳)

تمام شیعہ مفسرین اور بہت سے سنی علماء نے بھی بالصراحت کہا ہے کہ یہ آیت غدیر کے دن نازل ہوئی۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کے جانشین کی نامزدگی کے ساتھ دین کو حد کمال تک پہنچا دیا اور کوئی بات مبہم نہیں رہنے دی۔

اس کے بعد حسان بن ثابت کہ جو ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا: یا رسول اللہؐ! کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ میں اس تاریخی دن اور امام علیؑ کے بارے میں کچھ اشعار کہوں؟ جب رسول اکرمؐ نے اجازت دی تو حسان نے حاضرین کے سامنے فی البدیہہ یہ اشعار پڑھے:

ینادیھم یوم الغدیر نبیھم	بخم و اسمع بالرسول منادیا
فقال فمن مولاکم و نبیکم	فقالوا ولم یبدوا ھناک التعامیا
الٰھک مولانا و انت نبینا	ولم تلق منّا فی الولایۃ عاصیا
فقال لہٗ قم یا علی فانّنی	رضیتک من بعدی اماما وہادیا
فمن کنت مولاہ فھذا ولیّہ	فکونوا لہٗ اتباع صدق موالیا
ھناک دعا اللّٰھم وال ولیہ	وکن للذی عادا علیا معادیا

یہی پہلے اشعار ہیں جو غدیر کے موقع پر حاضرین میں سے ایک صحابی (حسّان بن ثابت) نے پڑھے۔ انہوں نے اپنے ان اشعار میں واقعۂ غدیر کی تمام جزئیات اور امام علیؑ کی امامت اور خلافت کے بارے

ہیں رسول اکرمؐ کی تصریح کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حسان بن ثابت کے علاوہ کئی دوسرے صحابہ کرامؓ، تابعین اور دوسرے طبقات سے تعلق رکھنے والے مومنین نے حدیث غدیر کو شعر کا جامہ پہنایا اور یوں روز قیامت تک کے لیے اپنی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں۔

بعد میں رسول اکرمؐ نے حکم دیا کہ حاضرین امام علیؑ کی بیعت کریں اور انہیں امیرالمومنین کہہ کر پکاریں۔ چنانچہ فوراً بیعت کے سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ وہ پہلا شخص جس نے امام علیؑ کی بیعت کی اور انہیں امیرالمومنین کہہ کر پکارا، وہ عمر بن خطاب تھے چنانچہ وہ آگے بڑھے اور کہا:

سلام ہو آپ پر اے امیرالمومنین! مبارک ہو کہ آپ میرے اور ہر باایمان مرد اور عورت کے مولا ہو گئے۔

ان کے بعد ابو بکر نے اور پھر دوسرے مسلمانوں نے امام علیؑ سے بیعت کی اور انہیں رسول اکرمؐ کی جانشینی اور خلافت حاصل ہونے پر مبارکباد پیش کی۔

اسی بنا پر ۱۸ ذی الحجہ یعنی غدیر کا دن، ایک عید کی حیثیت رکھتا ہے جس پر رسول اکرمؐ کے زمانے سے اب تک توجہ دی جارہی ہے۔ حتیٰ کہ اہل سنت کے بہت سے طبقے بھی اس دن کی عظمت کے معترف ہیں۔

'البیرونی' اپنی کتاب الآثار الباقیہ میں لکھتا ہے:

عید غدیر ان عیدوں میں سے ہے جنہیں عام مسلمان خوشی کا دن شمار کرتے ہیں۔

ابن طلحہ شافعی اپنی کتاب مطالب السؤال میں لکھتا ہے:

غدیر کا دن ایک رسمی عید کا دن بن گیا ہے۔ کیونکہ اس دن رسول اکرمؐ نے علیؑ کو بڑا بلند مرتبہ بخشا اور انہیں تمام مسلمانوں میں سے منتخب کر کے مقام خلافت پر فائز کیا۔

جب اس دنیا کے بادشاہ اور سلاطین اپنی تخت نشینی کے دن کو عید کا دن قرار دے کر اس میں جشن مناتے ہیں۔ ان کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں اور ضیافتیں دی جاتی ہیں۔ پھر کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم غدیر کے دن ایک بڑے جشن کا اہتمام کریں۔ کیونکہ یہ امیرالمومنین علیؑ کی تاجپوشی کا دن ہے۔ جس میں رسول اکرمؐ نے انہیں مسلمانوں کی پیشوائی اور دینی ولایت پر فائز کیا تھا۔ چنانچہ شیعہ امامیہ اس عظیم دن کا بیحد احترام کرتے ہیں اور اسے ایک رسمی عید کے طور پر مناتے ہیں۔

مناسب ہو گا کہ یہاں ہم مشہور مسیحی عالم جارج جرداق کی کتاب امام علیؑ کا ایک باب نقل کریں، جو اس نے "علیؑ میرا بھائی ہے" کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کچھ احادیث نقل کریں تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ پیغمبرؐ اور ان کے بزرگوار چچا کے بیٹے (علیؑ) کے درمیان کس طرح روحانی اخوت قائم تھی۔ نیز یہ کہ امام علیؑ کو کس حد تک پیغمبرؐ کے فضائل ورثے میں ملے اور ان کی روح پر کہاں تک نبوت کا رنگ چڑھ گیا تھا۔ وہ پیغمبرؐ کو کس قدر محبوب اور عزیز تھے اور انہوں نے دل اور زبان سے ان کی

عظمت کو کس کس طرح ظاہر کیا ہے۔ پھر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکیں گے کہ اسلام کے وہ گرانقدر قوانین جو دین کی پیشرفت کا موجب بنے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ پیغمبرؐ نے علیؑ کے لیے خلافت کی راہ ہموار کی تھی اس کی وجہ ـــــ جیسا کہ ہم بعد میں تفصیل سے بیان کریں گے، یہ تھی کہ پیغمبر اکرمؐ کو علیؑ میں اپنی صورت دکھائی دیتی تھی۔ کیونکہ جو اعلیٰ اخلاق اور پسندیدہ صفات پیغمبرؐ میں موجود تھیں، وہ علیؑ میں بھی جلوہ گر تھیں۔

طبرانی نے ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: علیؑ کے چہرے پر نگاہ ڈالنا عبادت ہے۔ نیز سعد بن ابی وقاص سے روایت کی گئی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: جو شخص علیؑ کو دکھ دیتا ہے، وہ گویا مجھے دکھ دیتا ہے۔

یعقوبی، اپنی تاریخ کے دوسرے جزو میں لکھتا ہے: جب پیغمبر اسلامؐ حجۃ الوداع کے بعد مدینہ واپس جا رہے تھے تو آپ نے ۱۸ ذی الحجہ کو جحفہ کے نزدیک غدیر خم کے مقام پر توقف فرمایا۔ پھر ایک خطبہ دیا اور علی بن ابی طالبؑ کا ہاتھ تھام کر فرمایا: جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ بھی مولا ہے۔ اے پروردگار! ہر اس شخص کو دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور ہر اس شخص کو دشمن رکھ جو علیؑ کو دشمن رکھے۔

فخر رازی کی تفسیر کبیر میں آیا ہے: اس کے بعد عمر بن خطابؓ امام علیؑ سے ملے اور ان سے کہا: اے علیؑ مبارک ہو۔ تم میرے اور ہر مسلمان مرد اور عورت کے مولا ہو گئے ہو۔

حدیث غدیر کو بہت سے مؤرخین اور علماء (مثلاً ترمذی، نسائی اور احمد بن حنبل) نے رسول اکرمؐ کے سولہ اصحاب سے روایت کیا ہے۔ مزید برآں بہت سے شعراء نے اسے نظم بھی کیا ہے۔ جن میں سب سے پہلے حسان بن ثابت انصاری ہیں جو کہتے ہیں:

ینادیھم یوم الغدیر نبیھم
بخم واسمع بالرسولؐ منادیا

جن شعراء نے اپنے اشعار میں اس دن کا نام لیا ہے، ان میں سے ایک ابو تمام طائی ہے۔ نیز کمیت اسدی نے بھی اپنے قصیدہ "عینیہ" میں یوم غدیر کے بارے میں مفصل شعر کہے ہیں۔ جن میں سے دو یہ ہیں:

ویوم الدوح، دوح غدیر خم — ابان لہٗ الولایۃ لو اطیعا
ولم ارمثل ذاک الیوم یوما — ولم ارمثلہ، حقا اضیعا

ابن خالویہ کی کتاب میں ابو سعید خدری سے نقل کیا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے امام علیؑ سے فرمایا: تمہاری دوستی ایمان اور تمہاری دشمنی کفر و نفاق ہے۔ وہ پہلا شخص جو بہشت میں داخل ہوگا وہ تمہارا دوستدار ہوگا اور وہ پہلا شخص جو دوزخ میں ڈالا جائے گا وہ تمہارا ہی دشمن ہوگا۔

محدثین کا اعتقاد ہے کہ رسول اکرمؐ نے بارہا امام علیؑ کی طرف دیکھا اور فرمایا: یہ میرا بھائی ہے۔ اسی طرح ایک حدیث ابو ہریرہ سے ہم تک پہنچی ہے کہ رسول اکرمؐ نے اپنے اصحاب کے ایک مجمع میں فرمایا: اگر تم آدمؑ کا علم، نوحؑ کا عزم، حضرت ابراہیمؑ کی روش، حضرت موسیٰؑ کی مناجات، حضرت عیسیٰؑ کا زہد اور حضرت محمدؐ کی ہدایت ایک ہی فرد میں جمع دیکھنا

چاہتے ہو تو اس شخص کو دیکھو جو اس وقت تمہاری طرف آرہا ہے۔ تب لوگوں نے گردنیں اٹھائیں اور دیکھا کہ آنے والے علی بن ابی طالبؑ ہیں۔

ایک شخص نے رسول اکرمؐ سے امام علیؑ کی شکایت کی۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا: علیؑ سے کیا چاہتے ہو؟ علیؑ سے کیا چاہتے ہو؟ علیؑ سے کیا چاہتے ہو؟ ہاں یاد رکھو علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں۔ وہی ہے جو میرے بعد تمام باایمان لوگوں کا سردار ہوگا۔

جب رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کو یمن بھیجا، تو راستے میں ان کے بعض ساتھیوں نے آپ سے کہا: ہمیں بیت المال کے اونٹ دیں تاکہ ہم ان پر سوار ہوں اور ہمارے اونٹوں کو کچھ آرام مل جائے۔ لیکن امام علیؑ نہیں مانے اور آپ نے ان کی یہ درخواست مسترد کر دی۔ چنانچہ مدینہ واپس آنے پر انہوں نے رسول اکرمؐ سے شکایت کی اور ان کے نمائندے سعد بن مالک نے کہا: یا رسول اللہؐ! ہم نے علیؑ سے سختی اور غلط برتاؤ دیکھا ہے۔ پھر امام علیؑ کی روش کا تفصیل سے ذکر کیا۔ رسول اکرمؐ نے اس کی ران پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اے سعد بن مالک! علیؑ کے بارے میں ایسی بات نہ کرو۔ خدا کی قسم! تو خوب جانتا ہے کہ ان کا وجود خدا کی راہ میں وقف ہے۔

ان احادیث اور ان کے علاوہ کئی دوسری احادیث کہ جن کا ہم نے ذکر نہیں کیا۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ، امام علیؑ کو اپنا بھائی سمجھتے تھے اور خود امام علیؑ بھی اس اخوت پر بے حد خوش تھے۔ مزید یہ کہ امام علیؑ کی شخصیت میں ایک کامل انسان کی جو خوبیاں مجسم ہو گئی تھیں۔ رسول اکرمؐ لوگوں کو ان خوبیوں کی طرف متوجہ کرتے تھے تاکہ انہیں پتا چل جائے کہ علیؑ ہی وہ بہترین آدمی ہیں جو آنحضرتؐ کے بعد امامت و خلافت

کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔
صحیح روایات میں کچھ ایسی حکایتیں بیان کی گئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت محمدؐ اور امام علیؑ کی یک جہتی کے لیے حالات بھی ساز گار تھے جو امام علیؑ کی ذات سے ایسی خصوصیات کے ظہور کا باعث ہوتے کہ جن میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہ ہو۔
مثلاً یہ کہ امام علیؑ کعبہ میں پیدا ہوئے جو مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ آپ کی ولادت اس وقت ہوئی جب اسلامی دعوت محمدؐ کی روح میں پنہاں تھی اور ابھی آپ نے اسے ظاہر نہیں کیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب آنحضرتؐ امام علیؑ کے والد ابوطالب کے گھر میں مقیم تھے۔
امام علیؑ ابھی جوانی کی منزل تک نہیں پہنچے تھے کہ آپ نے حضرت محمدؐ اور بی بی خدیجہؑ کو نماز پڑھتے دیکھا اور وہ پہلے شخص تھے جو ان کے ساتھ نماز میں شامل ہوئے۔ تب لوگوں نے ان سے کہا: آپ اپنے باپ کی اجازت کے بغیر کیوں اسلام کے مطابق عبادت کرتے ہیں؟ آپ نے فوراً جواب دیا: خدائے تعالیٰ نے مجھے میرے باپ ابوطالب کی اجازت کے بغیر پیدا کیا ہے۔ پھر یہ کیونکر لازم ہے کہ میں اس کی بندگی کے لیے اپنے باپ سے اجازت مانگوں؟
مدتوں پہلے دین اسلام محمدؐ کے گھر تک محدود تھا۔ اس دوران میں خود رسول اکرمؐ ان کی بیوی خدیجہؑ، چچا زاد بھائی علیؑ اور آپ کے غلام زید بن حارثہؓ ہی مسلمان تھے۔ ایک دن آنحضرتؐ نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو اپنے گھر پہ کھانے کی دعوت دی۔ تاکہ آپ ان سے گفتگو کریں اور انہیں دین اسلام کی طرف بلائیں لیکن آپ

کے چچا ابولہب نے آپ کی بات کاٹ دی اور مجلس کو درہم برہم کر دیا۔ پھر اس نے حاضرین کو اکسایا کہ وہ اٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ تاہم رسول اکرمؐ نے انہیں دوبارہ ضیافت دی اور جب وہ کھانا کھا چکے تو آپ نے فرمایا:

میں عرب کے کسی شخص کو نہیں جانتا جو اپنے رشتہ داروں کے لیے مجھ سے بہتر تحفہ لایا ہو۔ تم میں کون ہے جو میرا ساتھ دے؟

مگر سب نے آپ کا ساتھ دینے سے انکار کیا اور چاہتے تھے کہ اٹھ کر چلے جائیں۔ تاہم امام علیؑ کہ جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے، وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا:

یا رسول اللہؐ! میں آپ کا ساتھی ہوں اور جو کوئی آپ سے لڑے گا میں بھی اس سے لڑوں گا۔

حاضرین ہنسنے لگے اور ابوطالب اور امام علیؑ کو دیکھتے اور مضحکہ اڑاتے ہوئے چلے گئے۔

ہر جنگ میں پیغمبر اسلامؐ کا پرچم امام علیؑ کے ہاتھ میں رہا۔ انہوں نے اپنی دلاوری۔ شجاعت۔ جان۔ دل اور ہستی رسول اکرمؐ اور اسلام کی کامیابی کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ انہوں نے آنحضرتؐ کے دشمنوں کا ناطقہ بند کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ شرافت کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

جنگ خندق میں جب دشمن کا خوف اصحاب رسولؐ کو پریشان کیے ہوئے تھا۔ تب آپ قریش کے دلاوروں کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ پھر وہ کام کر دکھایا کہ مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور قریش کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔

جنگ خیبر میں امام علیؑ کا جہاد بڑا عظیم اور حیران کن تھا۔ خیبر کے

قلعے اپنی تمام تر سختی اور مضبوطی کے باوجود ان کے ہاتھوں فتح ہو گئے۔ حالانکہ ان کے اندر بہت سے دلیر اور آزمودہ کار جنگجو موجود تھے۔ جن سے رسول اکرمؐ کے اصحاب بھی خوفزدہ تھے۔ ہوا یہ کہ محاصرہ طول کھینچ گیا اور قلعے کے اندر موجود لوگوں نے اس کے دفاع کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ حضرت محمدؐ سے شکست کھا گئے تو جزیرۃ العرب میں ان کی کوئی حیثیت نہ رہے گی اور ان کی تجارت اور قیادت ختم ہو جائے گی۔ تب رسول اکرمؐ نے ابوبکر کو قلعہ فتح کرنے کے لیے بھیجا لیکن وہ ناکام واپس لوٹے۔ دوسرے دن عمر بن خطاب کو بھیجا لیکن ابوبکر کی طرح وہ بھی بے نیل و مرام واپس آ گئے۔ کیونکہ اس بلند قلعے اور اس کے طاقتور جانبازوں کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ گئی۔ اس پر رسول اکرمؐ نے علی بن ابی طالبؑ کو طلب فرمایا اور انہیں قلعہ فتح کرنے پر مامور کیا۔ چنانچہ وہ بخوشی اپنے عقیدے کی خاطر قربانی دینے کے لیے روانہ ہو گئے

اہل خیبر کو علم تھا کہ امام علیؑ نے کسی جنگ میں کبھی شکست نہیں کھائی اور اب تک کوئی ولاور ان کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکا۔ چنانچہ جب آپ قلعے کے نزدیک پہنچے تو ان لوگوں کو پتا چلا کہ علیؑ جنگ کے لیے آئے ہیں۔ تب مرحب اور چند دوسرے یہودی قلعے سے باہر آئے۔ امام علیؑ نے مرحب کو قتل کر دیا اور دوسرے یہودیوں سے مقابلہ شروع ہو گیا۔ ایک آدمی نے آپ پر ضرب لگائی جس کے نتیجے میں سپر آپ کے ہاتھ سے گر گئی۔ اس پر امام علیؑ نے قلعے کا ایک بڑا دروازہ اکھاڑا اور اس سے سپر کا کام لیتے ہوئے جنگ جاری رکھی حتیٰ کہ قلعہ فتح ہو گیا۔

امام علیؑ کا یہ کارنامہ بڑا عجیب و غریب ہے۔ کیونکہ تاریخ میں جیں

بہت سے دلاوروں کے نام نظر آتے ہیں، جنھوں نے اپنے عقیدے کی خاطر جنگ کی لیکن وہ دل سے صلح کے طالب تھے اور حالات کے تحت وہ جنگ کرنے پر مجبور ہوئے۔ ہم ایسے جنگجوؤں کو بھی جانتے ہیں جو اپنے مقصد کی خاطر شہید ہو گئے لیکن اس قسم کی لڑائیاں اور شہادتیں عموماً کسی سوچ بچار کا نتیجہ نہیں تھیں نہ ان کے لیے کوئی پیشگی تیاری کی گئی تھی۔ کیونکہ وہ ایک مدت تک موت کے انتظار میں بیٹھنے اور اس کی مختلف صورتوں کو اپنے دماغ میں مجسم کرنے کے بعد وقوع پذیر نہیں ہوئی تھیں۔ بلکہ وہ محض ناگہانی واقعات تھے جو اکثر غیرت اور حمیت یا شورش اور انقلاب کے سلسلے میں رونما ہو جاتے ہیں۔

لیکن علی بن ابی طالبؑ کا معاملہ ان سب کے مقابلے میں زیادہ حیرت انگیز ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے عقیدے کی خاطر، حضرت محمد بن عبداللہ کے عقیدے کی خاطر اور خدا کی راہ میں اپنے آپ کو ایسے خطرات میں ڈالا۔ جن کی مثال تاریخ عالم پیش نہیں کر سکتی اور یہی ان دو بزرگواروں کی باہمی یک جہتی کا سب سے واضح ثبوت ہے۔

جب قریش کی ایذا رسانی انتہا کو پہنچ گئی اور وہ اس کوشش میں لگ گئے کہ رسول اکرمؐ کو قتل کر کے اسلام کا خاتمہ کر دیں۔ تب آنحضرتؐ ابو بکر سے ملے اور انہیں بتایا کہ قریش نے اتفاق رائے سے مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لیے میں ہجرت کرنا چاہتا ہوں۔ ابو بکر نے بھی آنحضرتؐ کے ساتھ ہجرت کرنے کی اجازت مانگی تو آپ نے انکی درخواست قبول کر لی۔ جب رسول اکرمؐ نے ہجرت کا قصد کیا تو آپ کو معلوم تھا کہ قریش آپ کا پیچھا کریں گے۔ لہٰذا آپ نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ ایسے

وقت میں روانہ ہوں، جب دشمنوں کو آپ کے نکلنے کا گمان تک بھی نہ ہو۔ ایک غیر معروف راستے سے سفر کریں، تاکہ قریشی آپ کو نہ پاسکیں۔ جس رات رسول اکرمؐ نے مکہ سے ہجرت کرنے کا ارادہ کیا اسی رات قریش نے اپنے آدمیوں کے ایک گروہ کو آپ کے قتل کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ ان کو آپ کے گھر کے اردگرد پھیلا دیا گیا، تاکہ آپ رات کے اندھیرے میں ان کے ہاتھوں سے نکل نہ جائیں لیکن آنحضرتؐ نے اس رات چپکے سے اپنے چچازاد بھائی علی بن ابی طالبؑ کو کہا کہ وہ آپ کی سبز چادر اوڑھ کر آپ کے بستر پر سو جائیں۔ آپ نے انھیں یہ بھی فرمایا کہ وہ مکہ میں رہیں۔ تاکہ لوگوں کی وہ امانتیں جو آنحضرتؐ کے پاس تھیں، وہ انھیں لوٹا دیں۔

امام علیؑ نے رسول اکرمؐ کا یہ فرمان برضا و رغبت قبول کر لیا۔ پھر ہمیشہ کی طرح آنحضرتؐ کی خاطر اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہو گئے۔ قریش کے آدمیوں نے آنحضرتؐ کے گھر کا سخت محاصرہ کر رکھا تھا۔ وہ گھر کے سوراخوں اور درزوں میں سے آپ کے بستر پہ نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ ایک آدمی بستر پہ سو رہا ہے اور انہیں یقین تھا کہ وہ محمدؐ ہی ہیں۔ تاہم انہیں لمحات میں رسول اکرمؐ ابوبکر کے ساتھ غارِ ثور میں تشریف لے گئے۔ بعد میں قریش ان کے تعاقب میں وہاں تک بھی جا پہنچے لیکن خدائے تعالیٰ نے آپ کو ان کی نظروں سے اوجھل رکھا۔

ایسی جاں نثاری اور سرفروشی کی مثال بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ کیونکہ انسان موت اور زندگی کے انتخاب میں تذبذب کا

شکار ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ آیا وہ جسمانی عیش کی زندگی گزارے اور پست لذتوں کا انتخاب کرے، جو درحقیقت عین فنا ہیں یا فضیلتوں اور کرامتوں کو اپنائے۔ جو زندگی کا اصلی سرمایہ ہیں اور اپنے مقصد کے حصول کی خاطر خطرناک راستے پر چلے۔ ایسے موقع پر شہادت اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی نظر میں یہ فانی عیش حقیقی زندگی نہیں، بلکہ وہ حیات جاودانی پر نظر رکھتا ہے۔

بلاشبہ اس سرفروشی کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ جیسا کہ علی بن ابیطالبؑ نے برضا و رغبت اپنی جان کو رسول اکرمؐ کا فدیہ بنایا۔ لیکن اپنے پاؤں چل کر میدان جنگ میں موت کے سامنے جانا امام علیؑ کے اس عمل سے زیادہ آسان ہے۔ کس قدر مشکل ہے اس شخص کے بستر میں سونا، جسے شریر لوگ اپنا دشمن سمجھتے ہوں، اسے قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں اور بالخصوص جب ان کے چنگل سے نکلنا بھی ممکن نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ انسان انہیں چند قدموں کے فاصلے پہ دیکھ رہا ہو اور ان کی باتیں سن رہا ہو۔ پھر لحظہ بہ لحظہ ان کی حرکات و سکنات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو، جو خود اس کے قتل کی جانب اشارہ کرتی ہوں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان تلواروں کو دیکھ رہا ہو، جو اس کے سر پہ لٹک رہی ہوں۔ لیکن پھر بھی وہ رات اطمینان کی حالت میں گزار دے!

اس وقت امام علیؑ نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر حضرت محمدؐ کی پیروی کی۔ کیونکہ مقاومت کی یہ قوت انہوں نے اپنے بزرگوار چچا زاد بھائی سے سیکھی تھی۔ امام علیؑ کا رسول اکرمؐ کے بستر میں سونا، آنحضرتؐ کی دعوت کی خاطر ان کی کوشش اور جانبازی کا ایک نمونہ ہے۔ امام علیؑ کا

اپنے آپ کو یوں خطرے میں ڈالنا، ان کی طبیعت اور خصلت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس طرح کے اعمال ان سے بے تکلف صادر ہوتے تھے۔

جب ہیرا کان سے باہر آتا ہے تو صاحب عقل و خرد اسے بلا تردد پہچان لیتا ہے۔ اسی طرح امام علیؑ نے دعوت اسلامی کو کما حقہ سمجھ لیا تھا۔ حالانکہ اس عمر میں (امام علیؑ کی عمر اس وقت ۲۳ سال تھی) کوئی شخص ایسے بلند حقائق کو نہیں سمجھ سکتا۔ ان کی اس حق شناسی اور ایثار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی زندگی سے قطعاً بے نیاز تھے۔ وہ انتہائی صدق و اخلاص کے حامل تھے اور اعلیٰ اخلاق کے علاوہ کسی چیز کی جانب متوجہ نہیں ہوتے تھے۔

چونکہ وہ اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ اس لیے مظلوموں اور بیکسوں کی خاطر مارے جانے پر تیار ہو گئے۔ تاکہ وہ لوگ مصیبتوں سے نجات پائیں اور رسول اکرمؐ کی دعوت اپنے کمال تک پہنچ جائے۔ وہ بڑے سے بڑے کاموں کو سہل اور آسان گردانتے تھے اور ان کے انجام دینے میں انہیں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وفا، مردانگی، نیکی، شجاعت اور دوسری تمام مردانہ صفات امام علیؑ کی ذات میں جمع تھیں اور شب ہجرت ان کا رسول اکرمؐ کے بستر میں سونا ان کے سرفروشانہ کارناموں کا ایک نمونہ ہے جو بعد میں انہوں نے اسلام کی خاطر انجام دیے۔

محمد رسول اللہؐ اور امام علیؑ کے درمیان دوستی اور بھائی چارے کا تعلق قائم تھا۔ اس لیے وہ دعوت اسلام کی کامیابی کی خاطر ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ ان میں اس یک جہتی کی ابتدا اسی وقت سے ہو گئی جب

حضرت محمدؐ نے ابوطالب اور امام علیؑ نے حضرت محمدؐ کو پہچانا۔ یعنی اس وقت کہ جب سے یہ تینوں اشخاص ایک گھر میں رہنے لگے۔ یہ وہ گھر تھا جس کی بنیاد نیکی اور تقویٰ پہ رکھی گئی تھی۔ یہ ابوطالب کے اس گھر کی ایک اور خوبی تھی کہ وہاں امام علیؑ اور خود ابوطالب بھی حضرت محمدؐ کے مقام سے آگاہ ہو گئے اور ان کو بخوبی پہچان لیا۔ وہ یہی آگاہی تھی جس نے ابوطالب کو آنحضرتؐ سے شفقت و فدائیت اور امام علیؑ کو گہری فکر، سچی محبت اور معجزاتی جاں نثاری پہ آمادہ کیا۔"

ہم نے اس باب کی طوالت کے باوجود اس کو ایک عیسائی مصنف کی کتاب سے اس لیے نقل کیا ہے تاکہ ذہن روشن ہو جائیں۔ نیز امام علیؑ کی بلند شخصیت اور عروج اسلام کی خاطر ان کے شاندار کارنامے کسی حد تک کھل کر سامنے آجائیں۔ مزید بریں اس مصنف (جارج جرداق) نے اپنی اسی کتاب "امام علیؑ" میں کیا خوب کہا ہے:

> تم انہیں پہچانو یا نہ پہچانو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ تاریخ اور حقیقت یہ گواہی دیتی ہیں کہ علی بن ابی طالبؑ روشن اور قوی ضمیر کے مالک، نامور شہید شہیدوں کے باپ اور بزرگ، انسانی عدالت کی آواز اور مشرق کی ہمیشہ زندہ رہنے والی شخصیت ہیں۔

اے دنیا! کیا ہوتا اگر تو اپنی تمام قدرت اور قوت کو بروئے کار لاتی اور ہر زمانے کے لوگوں کو ویسی ہی عقل، ویسا ہی دل، ویسی ہی زبان اور ویسی ہی ذوالفقار رکھنے والا ایک علیؑ بخش دیا کرتی۔

پرجوش عیسائی مصنف خلیل جبران کہتا ہے:

"میرے عقیدے کے مطابق ابوطالب کے فرزند" علیؑ "
وہ پہلے عرب تھے، جنہوں نے روح کامل کی رفاقت
اور ہمسائیگی کا انتخاب کیا اور اس کے ساتھ زندراتوں
کے ہمراز بن گئے۔ وہ پہلے عرب تھے جن کے دو ہونٹوں
نے روح کامل کے ترانے کی آواز لوگوں کے کانوں تک
پہنچائی اور انہیں وہ نغمہ سنایا جو انہوں نے پہلے کبھی
نہیں سنا تھا۔ یہی وجہ ہوئی کہ لوگ ان کی بلاغت کے
پرنور اسلوبوں کے مقابل اپنی سابقہ تاریکیوں کو یاد کرکے
حیران ہوتے تھے۔ پس ہر شخص ان کا شیفتہ اور دلدادہ
بن گیا اور اس کی یہ شیفتگی اور دلدادگی خود اس کی فطرت
کے تار سے وابستہ ہے۔ لہٰذا جس کسی نے علیؑ سے دشمنی
کی وہ جاہلیت کے فرزندوں میں سے ہے۔

امام علیؑ نے دنیا سے اس حالت میں رحلت فرمائی کہ وہ خود ہی اپنی عظمت کے گواہ بن گئے۔ انہوں نے اس حالت میں دنیا کو خیرباد کہا کہ نماز ان کے ہونٹوں پہ تھی اور ان کا دل پروردگار کے عشق میں معمور تھا۔ تاہم عربوں نے ان کی قدر اور انکے مرتبے کی حقیقت نہ پہچانی۔ حتیٰ کہ ان کے ہمسایوں میں سے ایران کے باشندے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہیرے اور کنکر کے درمیان فرق کو پہچانا۔

اس سے پیشتر کہ علیؑ اپنا پیغام مکمل طور پہ دنیا والوں تک پہنچاتے انہوں نے دنیا سے آنکھیں موند لیں۔ لیکن میں اس مسکراہٹ کو دیکھ رہا ہوں جو دنیا کو الوداع کہتے ہوئے انکے چہرے پہ موجود رہی۔ پھر وہ بھی

ان بابصیرت پیغمبروں کی طرح چل بسے جو کسی ایسے شہر میں وارد ہوتے ہیں، جو ان کا نہیں ہوتا، ایسے لوگوں کے پاس آتے ہیں جو ان کے اپنے نہیں ہوتے اور ایسے زمانے میں ظاہر ہوتے ہیں جو ان کا زمانہ نہیں ہوتا۔ تاہم اس کام میں خدائے تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی ایسی حکمت ضرور ہوتی ہے، جسے وہ خود ہی بہتر جانتا ہے۔

مادیت کا ایک علمبردار شبلی شمیل کہتا ہے:

"امام علی بن ابیطالبؑ (بعد از مصطفےؐ) دنیا کے بڑوں کے بڑے اور اپنے وقت کی واحد مثالی شخصیت تھے، جن کا نقش ثانی ساری قدیم وجدید دنیا نے کبھی نہیں دیکھا۔

عظیم انگریز مفکر کارلائل کہتا ہے: "ہمارے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ امام علیؑ کو دوست رکھیں اور ان سے محبت کریں، کیونکہ وہ بڑے عالی مرتبت اور شریف النفس بزرگ تھے۔ ان کے ضمیر کے سرچشمے سے بھلائی اور نیکی ابلتی تھی۔ ان کے دل سے جوش اور دلاوری کے شعلے نکلتے تھے اور وہ شیر نر سے بھی زیادہ شجاع تھے لیکن ان کی وہ شجاعت لطف و کرم اور محبت و شفقت کے جذبات سے آمیختہ تھی۔

کوفہ میں انہیں ناگہانی طور پر شہید کر دیا گیا۔ اس حملے کا سبب ان کا انتہائی درجے کا عدل تھا۔ کیونکہ وہ ہر شخص کو اپنے جیسا عادل دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ شہادت سے پہلے انھوں نے اپنے قاتل کے بارے میں فرمایا: اگر میں زندہ رہا تو خود دیکھ لوں گا۔ اگر مجھے موت آگئی تو معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم قصاص لینا چاہو تو ایک ضرب کے

بدلہ میں ایک ہی ضرب لگانا۔ لیکن اگر تم اسے معاف کردو تو یہ فعل تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

مشہور لبنانی صاحب قلم میخائیل نعیمہ لکھتا ہے: امام علیؑ فقط میدان جنگ کے سورما ہی نہیں تھے۔ بلکہ بصیرت کی چمک، ضمیر کی پاکیزگی، معجز بیانی، ایمان کی حرارت، روح انسانیت کی گہرائی، ہمت کی بلندی، طبیعت کی نرمی، ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی حمایت اور حق کو تسلیم کرنے میں بھی ایک اولوالعزم ہستی تھے، خواہ حق ان کے سامنے کسی صورت میں بھی جلوہ گر ہو۔ ان کی یہ عالی ہمتی انسان کو بھاتی ہے، چاہے کتنا بھی زمانہ کیوں نہ گزر جائے۔ لیکن جب بھی ہمارے دل میں اصلاح کا شوق شدت اختیار کرتا ہے ہم علیؑ کے اسی جذبے کی جانب لوٹ جاتے ہیں۔

کوئی مورخ خواہ کتنی ہی غیر معمولی ذہانت کا مالک ہو، بلاشبہ اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی ہزار صفحات کی کتاب میں امام علیؑ جیسے بزرگ کی ایک مکمل تصویر کھینچ دے کیونکہ ان بزرگوار نے جو کچھ سوچا، کہا اور کیا وہ ان کا اور ان کے پروردگار کا معاملہ تھا۔ جسے نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی آنکھ نے دیکھا۔ کیونکہ جو کچھ ان کے ہاتھوں سے ظاہر ہوا اور ان کی زبان اور قلم سے نکلا، وہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ لہٰذا ان کی جو تصویر بھی کھینچی جائے گی، لامحالہ وہ اس کامل اصل کی ناقص نقل ہو گی۔

امام علیؑ، ہر زمین اور ہر زمانے میں فکر، جذبہ اور بیان کے مرد میدان ہیں۔ ایک عظیم اجتماع کہ جس کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار سے اوپر تھی۔ اس کے سامنے پیغمبر اسلامؐ نے اس بزرگ انسان، اس ممتاز شخصیت اور خدا کے اس برگزیدہ بندے کا ہاتھ پکڑ کر بلند کیا اور

خدائے تعالیٰ کے فرمان کے مطابق اسے اپنی جانشینی اور خلافت کے لیے نامزد فرمایا۔

وہ لوگ کیسی بے اصل بات کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اپنا کوئی جانشین نامزد نہیں فرمایا؛ کیونکہ آنحضرتؐ تو مختصر مسافتوں پر جاتے ہوئے بھی اپنا جانشین مقرر فرمادیتے تھے۔ پھر یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ آپ سفر آخرت پر روانہ ہوتے وقت ملت اسلامیہ کو کسی رہبر اور رہنما کے بغیر اس کے حال پر چھوڑ دیں گے۔ آیا آنحضرتؐ یہ برداشت کریں گے کہ مسلمان حیرانی اور پریشانی کے بیابان میں بھٹکتے پھریں؟ پس عقل سلیم اس بے بنیاد قول کو ہرگز قبول نہیں کرسکتی۔

آسمانی پتھر

رسول اکرمؐ کی خلافت کے لیے امام علیؑ کا انتخاب کئی حوادث کا پیش خیمہ تھا۔ غدیر کا پرشکوہ اورتاریخی دن، جتنا مومنین کے لیے خوشی کا موجب تھا اتنا ہی منافقین کے لیے ناگوار اور ناقابلِ برداشت تھا۔

امام علیؑ کی خلافت کے مخالف وہ لوگ تھے، جن کے اعزہ واقارب بدر، احد اور دوسری جنگوں میں آپ کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے۔ اس بنا پر وہ اپنے دلوں میں آپ کے خلاف کینہ رکھتے تھے۔

اب آپ جو داستان پڑھیں گے وہ شیعہ اور اہلِ سنت کی تفاسیر میں مذکور ہے۔ مگر ہم اسے اہلِ سنت کے مفسرین کی روایت سے بیان کرتے ہیں:

غدیر کا دن گزر گیا اور عظیم اجتماع منتشر ہو گیا۔ تب لوگ اپنے شہروں اور دیہات کی جانب چلے گئے اور ان کے ذریعے امام علیؑ کی

جانشینی کی خبر ہر طرف پھیل گئی۔ یہ خبر سنکر حارث بن نعمان فہری بے حد طیش میں آیا اور مدینہ روانہ ہو گیا۔

جب وہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں پہنچا تو اس کے چہرے سے بیزاری اور غصہ ٹپک رہا تھا۔ ایسے میں اس نے آنحضرتؐ کو مخاطب کیا اور کہا: اے محمدؐ! آپ نے خدا کی طرف سے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم شرک اور بت پرستی ترک کر دیں اور خدائے واحد پہ ایمان لے آئیں اور آپ کی رسالت کا اعتراف کریں۔ ہم نے یہ باتیں قبول کر لیں اور ان کا اقرار کیا۔ آپ نے حکم دیا کہ ہم نماز پڑھیں۔ ہم نے یہ بات مان لی۔ آپ نے حکم دیا کہ ہم روزے رکھیں۔ ہم نے آپ کے اس حکم پہ بھی عمل کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہم بیت اللہ کا حج کریں۔ ہم نے آپ کی اطاعت کی۔ آپ نے زکات کا حکم دیا اور ہم نے وہ بھی ادا کر دی۔ لیکن آپ نے ان احکام پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے چچا زاد بھائی کا ہاتھ پکڑ کر بلند کیا، اسے ہم پر برتری دی اور کہا: جس کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس کے مولا ہیں۔ کیا یہ اقدام، یہ انتخاب اور علیؑ کو ہم پہ برتری دینا خدا کے حکم سے ہوا ہے یا آپ نے اپنی مرضی سے کیا ہے؟

رسول اکرمؐ نے فرمایا: اس خدا کی قسم کہ جس کے سوا کوئی خدا نہیں، یہ خدا کا حکم ہے اور میں نے اس کے مطابق عمل کیا ہے۔

حارث نے اور کوئی بات نہ کی اور آنحضرتؐ کے پاس سے چلا گیا۔ لیکن اس کے غیظ و غضب کا یہ عالم تھا کہ اس نے خدا سے عذاب مانگا، اپنا منہ آسمان کی طرف کیا اور کہا: اے پروردگار! جو کچھ محمدؐ کہتے ہیں، اگر وہ سچ ہے اور تو نے ہی انہیں علیؑ کو اپنا جانشین بنانے اور ہم پہ فوقیت

دینے کا حکم دیا ہے تو پھر مجھ پر پتھروں کا مینہ برسا دے یا مجھے کسی شدید عذاب میں مبتلا کر دے۔

اس کی یہ دعا اتنی جلدی قبول ہوئی کہ ابھی وہ اونٹ پر سوار نہیں ہوا تھا اور مدینہ سے نہیں نکلا تھا کہ ایک پتھر اس کے سر پہ پڑا اور وہ مر گیا۔

خلافت کا ہنگامہ

غدیر کے تاریخی دن کے بعد ابھی تقریباً اڑھائی مہینے ہی گزرے تھے کہ وفات رسولؐ کے حادثے نے مسلمانوں کے دلوں کو مجروح کر دیا یعنی اسلام کے عالی قدر پیشوا نے انتقال فرمایا اور وہ اپنے پیروؤں کی نگاہوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گئے۔

جیسا کہ پچھلے باب میں ذکر کیا گیا ہے، اس سے پہلے کہ خدائے تعالیٰ اپنے رسولؐ کو اپنے پاس بلائے، اس نے آنحضرتؐ کے جانشین کو معین فرمایا اور مسلمانوں کے ہونے والے پیشوا کا تعارف کرا دیا۔ کیونکہ اگر آنحضرتؐ اپنا جانشین نامزد کیے بغیر دنیا سے سفر کر جاتے تو مسلمان افرانفری کا شکار ہو جاتے اور آپ کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔ چنانچہ جس مقدس شخصیت کو رسول اکرمؐ کی جانشینی کے لیے منتخب کیا گیا، وہ دوست اور دشمن دونوں کے نزدیک ساری امت میں سب سے بہترین اور

عالی مرتبت فرد تھے۔

امام علیؑ یعنی وہ بندۂ خدا کہ جن کے بارے میں سبھی معتقد ہیں:
کسی شخص کا اسلام اور عقیدہ ان سے زیادہ کھرا اور گہرا نہیں ہے۔ وہ پہلے مرد ہیں جو رسول اکرمؐ پر ایمان لائے اور جنھوں نے اسلام کی پیشرفت کے لیے ہر مرحلے پر بڑھ چڑھ کر قربانی دی۔ وہ اکثر جنگوں میں علمدار رہے اور تمام خطرناک مواقع پر رسول اکرمؐ کے دوش بدوش جان کی بازی تک لگاتے رہے۔

رسول اکرمؐ نے ان کے لیے علم کے دروازے کھول دیے اور وہ آنحضرتؐ کے مکتب سے علم، تقویٰ، زہد، اخلاص اور دوسرے عالی اخلاق سے پوری طرح بہرہ مند ہوئے۔

آپ کے دشمن بھی اس بات کے معترف ہیں کہ آپ کی ساری زندگی میں کوئی کمزور پہلو نہیں ہے اور آپ کامل انسان کا ایک بہترین نمونہ ہیں۔

وہ خدا اور حقیقت کے علاوہ کسی اور چیز کو خاطر میں نہ لاتے تھے بلکہ زندگی کے ہر مرحلے پر ان کا ہدف بس خدا کی رضا اور اس کی بارگاہ میں تقرب حاصل کرنا تھا۔

امام علیؑ وہ برتر انسان ہیں کہ جنھوں نے چودہ سو سال سے صاحبانِ عقل و دانش کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا رکھی ہے اور انہیں اپنی زندگی کے عجائبات میں محو کر رکھا ہے۔

ان کی متضاد صفات نے اہلِ فکر کو حیرت میں ڈال رکھا ہے اور انہیں اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ سب کے سب آپ کی عظمت کے

سامنے سرِ تعظیم خم کر دیں۔

مشہور لبنانی مصنف میخائیل نعیمہ اپنی کتاب "الامام علیؑ" کے مقدمے میں لکھتا ہے: یہ کتاب بنی نوع انسان میں سے ایک عظیم شخص کی سوانح حیات ہے۔ اگرچہ وہ عربستان سے اٹھے، لیکن وہ اس سرزمین سے مخصوص نہیں ہیں۔ گو اسلام نے انہیں ساری دنیا میں متعارف کرایا ہے لیکن وہ فقط اسلام کے لیے نہیں ہیں۔ اگر وہ محض اسلام ہی کے لیے ہوتے تو بیسویں صدی کا ایک لبنانی عیسائی ان کی زندگی کے حالات کیوں لکھتا؟ وہ ان کی شخصیت و کردار کے بارے میں تحقیقات کیوں کرتا؟ اور ان کے دل لگتے فیصلوں، عجیب و غریب مقولوں اور حیرت انگیز معرکوں کے بارے میں شاعرانہ لے میں نغمہ سرائی کیوں کرتا؟

امام علیؑ کی علوشان فقط میدان جنگ تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ روشن بینی۔ پاکدلی۔ بلاغت شعاری۔ سحر بیانی۔ بلند اخلاقی۔ حرارت ایمانی اور عالی ہمتی کے علاوہ مظلوموں اور ناامیدوں کی حمایت۔ حق اور راستی کی متابعت" غرضیکہ وہ تمام اچھی صفات میں ایک خاص امتیاز رکھتے تھے۔ امام علیؑ نے مختلف مقدمات میں جو فیصلے دیے انہیں مدتیں گزر چکی ہیں لیکن اب بھی ان سے بے حد فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم جس دور میں بھی نیکی اور سعادت پر مبنی زندگی کا آغاز کرنا چاہیں ہمیں امام علیؑ کے قول و عمل کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ تاکہ ہم ان سے پاک و پاکیزہ زندگی کے اصول اور قاعدے حاصل کر سکیں۔

ایک مورخ اور مصنف خواہ کتنا ہی صاحب فکر و نظر کیوں نہ ہو، اس کے لیے ممکن نہیں کہ وہ امام علیؑ کی حقیقی معنوی صورت کو ایک ہزار صفحات میں بھی مجسم کر دے یا وہ بڑے بڑے واقعات جو ان کی زندگی میں پیش آئے ان کا احاطہ کرے اور یہ بتا سکے کہ عرب کے اس غیر معمولی انسان نے کیا سوچا، کیا کہا اور کیا کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام علیؑ اور ان کے رب کے درمیان بہت سی ایسی باتیں بھی تھیں، جو نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی آنکھ نے دیکھیں۔ نیز وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں جو ایک مورخ اپنے ہاتھ، زبان اور قلم کے ساتھ بیان کر سکتا ہے۔ لہٰذا ہم ان کی جو تصویر بھی کھینچیں وہ ایک ادھوری ہی ہوگی۔ اندریں صورت ہم اس تصویر میں ان کی زندگی کے جن گوشوں کا مشاہدہ کرنے کی امید رکھتے ہیں ہم ان میں بہت ہی کم گوشوں کو دیکھ پائیں گے۔

اگرچہ ساری دنیا میں امام علیؑ کی شجاعت کی دھوم مچی ہوئی ہے اور سبھی جانتے ہیں کہ انھوں نے عرب کے بڑے سے بڑے جنگجوؤں کو پچھاڑ دیا اور عمرو بن عبدود اور مرحب جیسے پہلوانوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ تاہم سبھی شیعہ، سنی اور عیسائی مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ امیر المومنین امام علیؑ کی خوراک انتہائی سادہ اور فقیرانہ تھی۔ پھر اس کی مقدار بھی اتنی ہی ہوتی تھی کہ جس سے محض آپ کے جسم و جان کا رشتہ قائم رہ سکتا تھا۔

علاء بن زیاد حارثی امام علیؑ کے ایک دولت مند اور خوش حال صحابی تھے۔ جب وہ بیمار ہوئے تو آپ ان کو دیکھنے گئے۔ تب آپ نے فرمایا: کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم اپنے اس وسیع اور خوبصورت گھر میں

فقیروں اور حاجتمندوں کو بلاتے اور انہیں اپنے دستر خوان پہ بٹھا کر کھانا کھلاتے تو خدائے تعالیٰ تمہیں آخرت میں ایسا ہی گھر عنایت فرماتا۔ علاء نے کہا: میں اپنے امام کے اس حکم کی ضرور اطاعت کروں گا۔ پھر کہا کہ میرے بھائی نے زہد اور ترک دنیا کا معاملہ اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ اپنے بیوی بچوں کی زندگی تلخ کر دی ہے۔ وہ ساری رات عبادت میں گزارتا ہے اور دن کو روزہ رکھتا ہے۔ اگرچہ خدائے تعالیٰ نے اسے مال کثیر دے رکھا ہے لیکن وہ خشک روٹی اور موٹے جھوٹے لباس پہ قناعت کرتا ہے۔ اس پہ امام علیؑ نے حکم دیا: اسے میرے پاس لاؤ۔ جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اس نے یہ روش خود امام علیؑ سے ہی سیکھی ہے اور وہ ان کی پیروی میں اپنے آپ پر اتنی سختی روا رکھتا ہے۔

آپ نے فرمایا: تم غلطی پہ ہو، کیونکہ تم میری مانند نہیں ہو۔ نیز میرے اور تمہارے فرائض باہم بہت مختلف ہیں۔ پس خدا نے تمہیں جو نعمتیں دی ہیں تم ان سے ضرور استفادہ کرو۔ تمہارا میری طرزِ زندگی کی تقلید کرنا صحیح نہیں، کیونکہ میری ذمہ داری تم سے مختلف ہے۔ میں مسلمانوں کا حاکم اور مومنین کا امیر ہوں، اس لیے ضروری ہے کہ میں اپنی خوراک اور پوشاک اتنی گھٹا دوں تاکہ اسلامی مملکت کے دور دراز علاقوں کے غریب سے غریب لوگ بھی زندگی کی تلخیاں بخوشی برداشت کر لیں۔ نیز یہ کہیں کہ ہمارا امیر اور پیشوا بھی ہمارے جیسی خوراک کھاتا ہے اور ہمیں جیسا لباس پہنتا ہے۔ چنانچہ مجھ پہ حاکم ہونے کی بنا پہ یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، لیکن تم پہ ایسی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

عقبہ بن علقمہ کہتا ہے: ایک بار میں امام علیؑ کے پاس گیا اور

دیکھا کہ وہ تھوڑے سے دودھ کے ساتھ ایک خشک روٹی کھا رہے ہیں۔ میں نے کہا: اے امیر المومنینؑ! آپ اس غذا کے ساتھ کیسے زندگی گزار رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: رسول اکرمؐ اس سے بھی زیادہ خشک روٹی کھاتے تھے اور جو کپڑے میں نے پہنے ہوئے ہیں، ان سے بھی زیادہ کھردرے کپڑے پہنتے تھے۔ اس لیے ڈرتا ہوں کہ اگر میں ایسا نہ کروں تو شاید آنحضرتؐ سے ملحق نہ ہو سکوں گا۔

عمر بن عبدالعزیز کہا کرتے تھے: اس دنیا میں علی بن ابی طالبؑ سے بڑا زاہد کوئی نہیں آیا۔

یہ تھا امام علیؑ کے زہد کا نمونہ۔ تاہم انصاف۔ مروت۔ پاک دامنی۔ عفو اور دشمنوں سے چشم پوشی وغیرہ ایسی ان کی دیگر ملکوتی صفات بھی قابل توجہ ہیں اور مسلم و غیر مسلم مورخین نے اپنی اپنی کتابوں میں ان کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

امیر المومنینؑ اپنی فوج کے ساتھ صفین جاتے ہوئے عراق کے ایک چھوٹے سے شہر "انبار" میں پہنچے۔ وہاں کے لوگ کچھ عرصہ پہلے تک ساسانی بادشاہوں کی رعایا رہے تھے۔ اس لیے وہ شاہی آداب و رسوم کے عادی ہو گئے اور حاکموں اور بادشاہوں کو سجدہ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ امام علیؑ کے استقبال کے لیے گھنٹوں سڑک کے کنارے صف باندھ کر کھڑے رہے۔ جب آپ وہاں پہنچے تو وہ سبھی منہ کے بل گر گئے اور آپ کے ادب کی خاطر زمین کو بوسہ دیا۔

یہ دیکھ کر امیر المومنینؑ اپنے گھوڑے سے اتر آئے اور انبار کے سفلہ اور خوشامدی لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا: تم کیسے بے لذت گناہ

کے مرتکب ہو رہے ہو اور اپنے لیے کیسی ذلت اور رسوائی خرید رہے ہو؟ کیونکہ تم ایک بندے کو سجدہ کرتے ہو اور اسے خدا کا شریک قرار دیتے ہو۔ تم گھنٹوں سے گرد اور خاک پھانکتے، تکلیف اٹھاتے اور اپنے آپ کو ذلیل و خوار کرتے رہے۔ حالانکہ میں بھی اور تم بھی خدا کے کمزور بندے ہیں۔ میں تمہاری طرح بیمار پڑتا ہوں اور ایک دن مجھے بھی موت آجائے گی۔ آؤ میں اور تم اس خدا کو سجدہ کریں جو نہ بیمار پڑتا ہے اور نہ مرتا ہے۔ اگر میں تمہارا پیشوا اور امیر ہوں تو اس بنا پر مجھے تم پر کوئی فوقیت حاصل نہیں، سوائے اس کے کہ مجھ پر بھاری ذمہ داری عائد ہو گئی ہے۔

واقعہ تحکیم کے بعد خوارج امام علیؑ کے لشکر سے الگ ہو گئے۔ آپ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ آپ کے خلاف جنگ لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس وقت آپ کے کچھ اصحاب نے یہ بات قرینِ مصلحت دیکھی کہ خوارج کے حملہ سے پہلے خود امیرالمومنینؑ ان پر حملے کا حکم دیدیں لیکن امامؑ نے فرمایا:

> گو مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ جنگ کریں گے اور تلواریں کھینچ کر ہمارے مقابلے پر آجائیں گے لیکن جب تک وہ خود جنگ شروع نہ کریں میں ان کے خلاف تلوار نہیں اٹھاؤں گا۔

جنگ صفین میں معاویہ کے لشکر سے کریز ابن صباح میدان میں آیا اور اس نے اپنا مدِ مقابل طلب کیا۔ امام علیؑ کا ایک سپاہی مقابلے پر نکلا اور مارا گیا۔ کریز نے دوبارہ مبارزطلبی کی تو دوسرا آدمی میدان میں اترا، لیکن وہ بھی مارا گیا۔ پھر تیسرا آدمی نکلا اور وہ بھی ان دونوں کی طرح جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس صورتِ حال نے اہلِ کوفہ کو خوفزدہ کر دیا اور پھر امیرالمومنینؑ نے خود میدان میں قدم رکھا۔ آپ نے چشم زدن میں شامی سپاہی

کا خاتمہ کر دیا۔ نیز دو اور آدمیوں کو بھی جو میدان میں آگئے تھے، موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر آپ نے اتنی بلند آواز سے جو دونوں فوجوں نے سنی فرمایا: اگر تم جنگ میں پہل نہ کرتے تو ہم تمہارے خلاف تلوار نہ کھینچتے۔ یہ فرما کر آپ اپنی فوج میں واپس آگئے۔

قتل عثمان کے بعد لوگوں نے امیرالمومنینؑ کی بیعت کر لی اور آپ مسلمانوں کے امور کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے۔ انہی دنوں آپ نے اپنی زرہ ایک عیسائی کے پاس دیکھی۔ اس پر آپ نے قاضی شریح کی عدالت میں نالش کی اور ایک عام مسلمان کی طرح اس سے اپنا حق دلانے کو کہا۔

قاضی نے عیسائی سے پوچھا: امیرالمومنینؑ نے زرہ کے بارے میں جو دعویٰ کیا ہے، اس کے جواب میں تم کیا کہتے ہو؟

اس نے کہا: زرہ میری ہے اور میری نظر میں امیرالمومنینؑ بھی جھوٹے نہیں ہیں۔

شریح نے امیرالمومنینؑ سے پوچھا: کیا آپ اس بارے میں کوئی گواہ پیش کر سکتے ہیں؟

امام علیؑ مسکرائے اور فرمایا: فیصلہ دینے کا اصول یہی ہے جس پر شریح عمل کر رہا ہے لیکن میرے پاس اس امر کے بارے میں کوئی گواہ نہیں ہے۔

تب قاضی نے فیصلہ عیسائی کے حق میں دیدیا اور وہ زرہ اٹھا کر چل پڑا۔ لیکن ابھی چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ واپس مڑا اور کہنے لگا: سچ تو یہ ہے کہ آپ انبیاء علیہم السلام کے طور طریقوں کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ جیسا کہ امیرالمومنینؑ نے میرے خلاف قاضی کی عدالت میں دعویٰ

دائر کیا ہے۔ گو قاضی انہیں کا مقرر کردہ ہے لیکن اس نے ان کے خلاف فیصلہ دیا اور مجھے حق بجانب ٹھہرایا ہے: میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

اے امیرالمومنینؑ! خدا کی قسم! یہ زرہ آپ ہی کی ہے جنگ صفین کے بعد میں آپ کی فوج کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ تب میں نے یہ زرہ آپ کے خاکستری رنگ کے اونٹ پر سے کھینچ لی تھی۔

امام علیؑ نے فرمایا: چونکہ اب تم مسلمان ہو چکے ہو' اس لیے میں یہ زرہ تمہیں تحفے کے طور پر دیتا ہوں۔ بعد میں یہ شخص امیرالمومنینؑ کے حامیوں میں شامل ہو گیا اور جنگ نہروان میں خوارج کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑا۔

چونکہ ہم امیرالمومنینؑ کے طور طریقوں اور ان کی اخلاقی خصوصیات سے کسی حد تک آگاہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے ہم اب اصل مطلب یعنی مسئلہ خلافت کی جانب لوٹتے ہیں۔ تاکہ یہ باب جامع اور مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی نقطۂ نگاہ سے بھی مکمل ہو جائے۔

رسول اکرمؐ کے بیشتر اصحاب کے نزدیک یہ بات قطعی اور مسلم تھی کہ آنحضرتؐ کی خلافت امیرالمومنین علیؑ کے لیے ہے کیونکہ ابھی غدیر کے واقعہ کو زیادہ مدت نہیں گزری تھی اور اس کی یاد لوگوں کے دلوں میں باقی تھی۔ جب رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کا بازو اپنے ہاتھ میں تھام کر ایک لاکھ بیس ہزار افراد پر مشتمل اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا: جس کا میں مولا ہوں' علیؑ بھی اس کے مولا ہیں" آنحضرتؐ کی پرجوش آواز ابھی تک کانوں میں گونج رہی تھی۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جب رسول اکرمؐ نے وفات پائی تو کونوں کھدروں میں مختلف سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ ایک طرف عمر بن خطاب اور ابوعبیدہ بن جراح مسجد نبوی کے گوشے میں سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ دوسری طرف سعد بن عبادہ نے قبیلہ خزرج کے لوگوں کو سقیفہ بنی ساعدہ میں اپنے گرد جمع رکھا تھا اور ان سے صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ اسیطرح دوسرے مختلف گروہ بھی ادھر ادھر جمع ہو کر گفتگو کر رہے تھے۔ ایسے میں امیرالمومنین علیؑ رسول اکرمؐ کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے۔ تب آپ آنحضرتؐ کی جدائی میں اسقدر غمگین اور افسردہ تھے کہ انکے غسل و کفن اور دفن کا فرض انجام دینے کے علاوہ کسی اور طرف توجہ نہیں دے رہے تھے۔ رسول اکرمؐ کا جنازہ تین دن اور رات تک رکھا رہا۔ اس دوران میں امام علیؑ اپنے چند چچا زاد بھائیوں سمیت دن رات آنحضرتؐ کے جنازے کے پاس بیٹھے رہے۔ تاکہ انہیں دفن کرنے کا آخری فریضہ بھی بطور احسن انجام دیں۔

اس وقت جبکہ امیرالمومنین علیؑ، رسول اکرمؐ کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے بعض مہاجرین اور انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں اس لیے جمع تھے کہ آنحضرتؐ کے جانشین کا انتخاب کریں۔

جو اشخاص سقیفہ میں جمع تھے ان کے نام یہ ہیں:

۱۔۔۔ ابوبکر	۲۔۔۔ عمر بن خطاب
۳۔۔۔ ابوعبیدہ بن جراح	۴۔۔۔ سعد بن عبادہ
۵۔۔۔ قیس بن سعد	۶۔۔۔ خزیمہ بن ثابت
۷۔۔۔ اسید بن خضیر	۸۔۔۔ عثمان بن عفان
۹۔۔۔ ابوالہیثم بن تیہان	۱۰۔۔۔ حسان بن ثابت

۱۱ ـــ عبدالرحمٰن بن عوف ۱۲ ـــ ثابت بن قیس بن شماس

۱۳ ـــ حباب بن منذر ۱۴ ـــ معن بن عدی

۱۵ ـــ بشیر بن سعد اعور ۱۶ ـــ حارث بن ہشام

سقیفہ میں موجود لوگوں میں سے یہ تو جانی پہچانی شخصیتیں تھیں لیکن ان کے علاوہ بہت سے تماشائی بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہاں کی دلچسپیوں میں اپنا وقت گزاریں اور سیاستدانوں کی گفتگو سے معلومات بھی حاصل کریں۔

جیسا کہ امامیہ علماء، ابن ابی الحدید جیسے کچھ معتزلی مؤرخین اور پروفیسر لامنس جیسے غیر جانبدار مستشرقین نے بالصراحت کہا کہ: ابوبکر، عمر اور ابوعبیدہؓ بن جراح نے ایک خفیہ معاہدے پر دستخط کیے تھے۔ جس میں انھوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر علی بن ابی طالبؑ سے خلافت چھین لیں گے۔ چنانچہ وہ اپنی اسی قرارداد کے تحت اکٹھے سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے۔

سعد بن عبادہ انصاری جو سخت بیمار اور بستر سے لگے ہوئے تھے۔ ان کو ایک تخت پر لٹا کر اس باغ میں لایا گیا تھا۔ وہ اتنے کمزور تھے کہ اپنی آواز بھی حاضرین تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔ لہٰذا ان کا بیٹا اس تخت کے پاس کھڑا ان کی باتیں لوگوں کے سامنے دہرا رہا تھا۔ سعد نے کہا:

اے مدینہ کے لوگو اور اے انصار کی جماعت! عرب کا کوئی قبیلہ بزرگی اور فضیلت کے معاملے میں تمہاری برابری نہیں کر سکتا۔ تم وہ لوگ ہو جنہوں نے پیغمبر اسلامؐ کی حمایت کی، ان کے جو ساتھی، ہجرت کر کے یہاں آئے تھے ان کو پناہ دی اور آنحضرتؐ کی خاطر مال اور جان کی قربانیاں دیتے

دیے ہو۔ تم نے جو تکلیفیں اٹھائی ہیں اور جس جانبازی کا مظاہرہ کیا ہے بہتر ہوگا کہ آج اس کے بدلے میں خلافت حاصل کرلو اور تم اس رتبے کے اہل بھی ہو۔

قبیلہ خزرج کے لوگ جو سعد بن عبادہ کے ہم قبیلہ تھے، انہوں نے اپنے سردار کی تعریف کی اور ان کی باتوں کی تصدیق کی لیکن ابو الہیثم بن تیہان اور بعض دوسرے حاضرین جو امام علیؑ کو ہی خلافت کے لیے موزوں سمجھتے تھے انہوں نے سعد سے اختلاف کیا۔ نیز انصار کے ایک اور گروہ نے بھی سعد کی باتوں کو رد کر دیا۔ کیونکہ ان کے دلوں میں خزرجیوں کے خلاف دورِ جاہلیت کا کینہ تھا۔

یہی وقت تھا جب ابوبکر نے موقع غنیمت سمجھا اور بولنا شروع کیا۔ انہوں نے مہاجرین کے نمائندے کے طور پر تقریر کی اور بڑی نرم و ملائم اور مبہم باتیں کیں۔ وہ کبھی انصار کی خدمات کا ذکر کرتے اور کبھی مہاجرین کی برتری جتاتے جن سے خود ان کا بھی تعلق تھا۔

اس دوران میں اجتماع کے مختلف حصوں میں شور و غل برپا ہو گیا اور نزدیک تھا کہ جنگ اور خونریزی کی نوبت آجاتے۔ اس وقت حباب بن منذر نے بہ آوازِ بلند کہا: یہ مکہ کے راندے ہوئے لوگ جو پناہ گیر کے طور پر ہمارے شہر میں آئے تھے، یہ انصار پر حکومت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، تم ان کو شہر سے باہر نکال دو۔

ادھر عمر بن خطاب اس معاملے کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتے تھے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں اس موقع پہ علیؑ وہاں نہ آجائیں۔ جبکہ یہ بات یقینی تھی کہ اگر امام علیؑ وہاں ہوتے تو سبھی انہیں مقدم سمجھتے اور عمر کی پیش بندیاں

رائیگاں جائیں۔

اس طرح پھوٹ اور نا اتفاقی نے انصار کا کام بگاڑ دیا اور مہاجرین نے اپنی حیثیت اور اہلیت منوا لی۔ تب ابوبکر نے کہا: میں اپنے لیے کوشش نہیں کر رہا۔ بلکہ تم ان دو اشخاص، عمر بن خطاب اور ابو عبیدہ جس میں سے جس کی چاہو بیعت کر لو۔

تاہم عمر اور ابو عبیدہ نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ابو بکر سے کہا: آپ ہم سے زیادہ اہل ہیں کیونکہ آپ غارِ ثور میں رسول اکرمؐ کے ہمراہ تھے۔ لہٰذا آپ سے بڑھ کر کوئی دوسرا اس منصب کے لیے موزوں نہیں ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ خلافت کا مسئلہ جو لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی قسمت سے تعلق رکھتا تھا وہ اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود ان چند آدمیوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گیا۔ جیسا کہ وہ اس منصب کو ایک دوسرے کی جانب لڑھکا رہے تھے۔

اس کے ساتھ ہی عمر بن خطاب، ابوبکر سے بیعت کرنے کے لیے آگے بڑھے، تب انصار کے ایک گروہ نے بآواز بلند کہا: اگر خلافت مہاجرین ہی کے لیے ہے تو پھر ہم علی بن ابی طالبؑ کی بیعت کیوں نہ کریں؟ جو تمام مہاجرین سے افضل اور اس منصب کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔

یہ بات عمر بن خطاب اور ان کے ساتھیوں پر بڑی ناگوار گزری اور وہ بے حد پریشان ہو گئے۔ لہٰذا عمر ایک جھپاکے سے ابوبکر کے پاس پہنچے، ان کا ہاتھ پکڑا اور بیعت کے طور پر ان سے مصافحہ کیا۔ اس کے

ساتھ ہی ابوعبیدہ اور پھر سعد بن عبادہ کے مخالف بشیر بن سعد نے بیعت کی۔ بعد ازاں ان لوگوں نے بھی بیعت کی جو تماشائیوں کی حیثیت سے سقیفہ میں جمع ہوگئے تھے۔

سعد بن عبادہ کو بڑی ناگفتہ بہ حالت میں گھر لے جایا گیا، لیکن انہوں نے ابوبکر کی بیعت نہ کی۔ اس کے بعد انہیں کئی دفعہ بیعت کے لیے کہلوایا گیا، لیکن انہوں نے کہا: خدا کی قسم! میں اس وقت تک بیعت نہ کروں گا، جب تک میں اپنے ترکش کا آخری تیر تم پر نہ چلا لوں اور اپنا نیزہ تمہارے خون سے رنگین نہ کرلوں۔

ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ قبیلہ خزرج کے اس رئیس نے رختِ سفر باندھا اور شام کی طرف روانہ ہوگیا۔ سعد بن عبادہ کے بیعت نہ کرنے سے عمر بن خطاب بڑے پریشان تھے۔ انہیں یہ ڈر تھا کہ مبادا اس کی شخصیت کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اپنی بیعت فسخ نہ کردیں۔

ہم یہ تو نہیں جانتے کہ سعد بن عبادہ نے مدینہ کیوں چھوڑ دیا تھا لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ چند دن بعد ان کے بارے میں ایک خبر مشہور ہوگئی۔ وہ یہ کہ جنات نے شام کے راستے میں انہیں دو تیر مار کر ان کا خاتمہ کردیا ہے۔

اگرچہ اس وقت کی سیاست سے بے خبر لوگ جنوں کے ہاتھوں سعد کے قتل کی خبر کو سچ جانتے اور ایک دوسرے کو سناتے تھے لیکن وہ لوگ جن کو خلافت کی تنظیم اور اس کی پس پردہ سرگرمیوں کا علم تھا وہ یوں کہتے تھے:

خالد بن ولید اور اس کا ایک ساتھی رات کے وقت سعد کی گھات میں بیٹھ گئے۔ انھوں نے موقع پاتے ہی اسے قتل کر دیا اور لاش کنویں میں پھینک دی۔ یہ ظالمانہ اقدام خلیفہ، وقت اور انکے دست راست عمر بن خطاب کے ایما پر کیا گیا۔ تاکہ وہ اپنے ایک سرکش اور طاقتور مخالف کا خاتمہ کر کے سکھ کا سانس لے سکیں۔

شاید بعض لوگ کہنے لگیں کہ یہ ایک من گھڑت قصہ ہے لیکن یاد رہے کہ شیعہ اور کئی سنی مصنفین نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ علاوہ ازیں جو حکومت امام علیؑ کو اپنا مخالف سمجھ کر انہیں قتل کرنے کا حکم صادر کرے، اس کے لیے سعد بن عبادہ کا قتل کیا اہمیت رکھتا ہے۔

بہرحال اس انداز میں ابوبکر کے ہاتھ پہ بیعت ہو گئی اور وہ "اجماع امت" تشکیل پایا، جس کا سہارا لیتے ہوئے اہل سنت ان کی خلافت کو درست اور حق بجانب قرار دیتے ہیں۔

یہ ایک ایسا اجماع تھا جس میں بنی ہاشم کے ممتاز افراد اور بہت سے جلیل القدر صحابہ شریک نہیں تھے۔

یہ وہ اجماع تھا کہ اہل مکہ اور دیگر اسلامی علاقوں کے مسلمانوں کو اس کی کوئی خبر نہ تھی۔

یہ وہ اجماع تھا کہ رسول اکرمؐ کے بہت سے سربرآوردہ اصحاب نے اس کی مخالفت کی، لیکن اس مخالفت کو نیزے کی انی کے بل بوتے پر کچل دیا گیا۔

یہ تھے وہ واقعات جن کے نتیجے میں ابوبکر نے خلافت سنبھالی۔ انہوں نے دو سال تین ماہ اور بائیس دن حکومت کرنے کے بعد تریسٹھ سال کی

عمر میں انتقال کیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ابوبکر کی خصوصیات کی مختصراً وضاحت کردی جائے۔ تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ وہ منصب خلافت کے لیے کس حد تک موزوں تھے۔

وہ قبیلہ بنی تیم سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا نام عبدالکعبہ تھا۔ لیکن آغاز اسلام میں رسول اکرمؐ نے ان کا نام "عتیق" رکھ دیا۔ جب وہ مسلمان ہوئے تو ان کی عمر چالیس سال تھی۔ وہ مکہ کے ایک تاجر اور قبائل عرب کی تاریخ سے واقف تھے۔

جب رسول اکرمؐ نے مدینہ ہجرت کرنے کا فیصلہ فرمایا تو ابوبکر نے بھی ان کے ساتھ جانے کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ نے ان کی یہ درخواست قبول کرلی اور وہ تین دن اور تین راتیں غارِ ثور میں آپ کی خدمت میں حاضر رہے۔

ان کی بیٹی عائشہ رسول اکرمؐ کی زوجہ تھیں اور ابوبکر اس بات کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔

تاریخ اسلام، ابوبکر کا تعارف ایک ڈرپوک آدمی کے طور پر کراتی ہے۔ جیساکہ غارِ ثور میں جب وہ رسول اکرمؐ کے ہمراہ تھے، دشمنوں کے ڈر سے سخت مضطرب اور پریشان ہوگئے تھے۔ نیز یہ کہ ابن ابی الحدید معتزلی کہ جو ایک سنی عالم ہیں، انہوں نے اپنے مشہور قصیدے میں ابوبکر کے جنگ خیبر سے فرار ہونے کی جانب اشارہ کیا ہے۔[1] نیز وہ احد اور حنین کی جنگوں

---

[1] داستان جنگ خیبر کتاب ہذا

میں بھی فرار ہو جانے والوں میں تھے۔
ابوبکر نے لشکر اسامہ کے ساتھ جانے سے روگردانی کی جسے شام کی طرف بھیجا جا رہا تھا۔ تب رسول اکرمؐ نے ان کے علاوہ عمر اور عثمان کو بھی اس لشکر کے ساتھ جانے کا حکم دیا اور فرمایا:

یعنی خدا لعنت کرے اس شخص پر جو اسامہ کے لشکر کے ساتھ جانے سے روگردانی کرے۔

وہ (ابوبکر) اپنے آپ کو خلافت کے منصب کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور بار بار کہتے تھے:

یعنی مجھے چھوڑ دو کہ میں خلافت کے قابل نہیں ہوں جبکہ علیؑ تمہارے درمیان موجود ہیں۔

اسلامی علوم کے بارے میں ابوبکر کی معلومات بہت کم تھیں۔ انہیں قرآن مجید کی تفسیر پہ قطعاً عبور حاصل نہیں تھا۔ چنانچہ وہ سورۃ عبس کی ۳۱ ویں آیت میں آنے والے لفظ "اب" کے معنی نہیں جانتے تھے جب ان سے سورۃ نساء کی ۱۷۶ ویں آیت میں سے "کلالہ" کے معنی پوچھے گئے تو انہوں نے جواب دیا کہ میں اس کے معنی اپنی رائے کے مطابق بتاتا ہوں اگر میرا کہنا درست ہو تو وہ خدا کی جانب سے اور اگر غلط ہو تو وہ خود میری اور شیطان کی جانب سے ہے۔

اگرچہ وہ کئی سال رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر رہے لیکن انہوں نے آنحضرتؐ کے بہت کم ارشادات یاد کیے۔ جیسا کہ مسند احمد بن حنبل میں رسول اکرمؐ کی ساڑھے سات لاکھ احادیث میں سے فقط اسّی ابوبکر سے روایت کی گئی ہیں۔ ان میں سے بھی بیس روایات مکرر ہیں اور یوں ان

کی روایت کردہ احادیث کی تعداد فقط ساٹھ رہ جاتی ہے۔

ایک سنی عالم، ابن کثیر نے بڑی کاوش سے ابوبکر کی روایت کردہ احادیث جمع کی ہیں اور انہیں "مسند الصدیق" کا نام دیا ہے لیکن اس کتاب کے لیے بھی انہیں فقط بہتر احادیث ہی مل سکی ہیں۔ ابوبکر نے اپنی خلافت کے زمانے میں بارہا کہا:

میرے ساتھ ایک شیطان ہے جو وقت بے وقت مجھے وسوسے میں ڈال دیتا ہے۔ اگر میں سیدھے راستے پر چلوں تو تم میری مدد کرو، اگر میں بھٹک جاؤں تو مجھے بتلا دو اور صحیح راستے پر ڈال دو۔

ابوبکر نے رسول اکرمؐ کی عالی مرتبت بیٹی بی بی فاطمہ زہراؑ کو ان کے والد بزرگوار کی میراث سے محروم کر دیا۔ پھر اس کی وجہ یہ بتائی کہ پیغمبر کسی کے لیے کوئی ورثہ نہیں چھوڑتے لیکن ان کی اپنی بیٹی عائشہ جو پیغمبر اکرمؐ کی نو بیویوں میں سے ایک تھیں، ان کو آنحضرتؐ کا وارث قرار دیا۔

ابوبکر اور عمر نے بی بی فاطمہ زہراؑ کے حق وراثت کو زائل کر کے ان پر جو ستم کیا تھا اس کے باعث وہ ان سے ناراض تھیں اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئیں تو ان دونوں پر غضبناک تھیں۔ اسی لیے انہوں نے یہ وصیت کی کہ ان کا جنازہ رات کو اٹھایا جائے۔ تاکہ وہ دونوں ان کی نماز جنازہ میں شریک نہ ہوں۔

ابوبکر نے خالد بن ولید پر خدا کی مقرر کردہ حد جاری نہ کی۔ حالانکہ اس نے ایک کلمہ گو مسلمان مالک بن نویرہ کو قتل کیا اور اس کی بیوی کے ساتھ ہمبستری کی۔ عمر اور خالد کے باہمی تعلقات اچھے نہ تھے۔ اس لیے

انہوں نے اصرار کیا کہ اس سے قصاص لیا جائے لیکن ابوبکر نے خالد کے ساتھ اپنی دوستی کی خاطر عمر کا یہ مطالبہ نہیں مانا۔

اگرچہ ابوبکر اپنے آپ کو خلافت کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ جیسا کہ اپنی زندگی میں انہوں نے کئی بار "اقیلونی" کہا تھا۔ لیکن مرتے وقت ایک ایسے باپ کی طرح جو اپنے فرزند کے لیے میراث چھوڑ جاتا ہے یا ایک ایسے مالک کی طرح جو اپنی ذاتی جائداد کسی کو بخش دیتا ہے۔ انہوں نے تنہا اپنی مرضی سے مسلمانوں کی خلافت عمر کے سپرد کر دی۔

اگرچہ ان کا عقیدہ تھا کہ خلیفہ کے انتخاب کا واحد قانونی طریقہ اجماع امت ہے لیکن مرتے وقت انھوں نے اجماع کو نظر انداز کر دیا اور رسول اکرمؐ کا منبر اور محراب عمر کے نام کر گئے۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے ابوبکر نے رسول اکرمؐ کو اپنا جانشین نامزد کرنے کے قابل نہیں سمجھا تھا لیکن اس کے برعکس اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھا اور عمر کو خلافت سونپ دی۔

امام علیؑ فرماتے ہیں:

> تعجب ہے کہ وہ زندگی میں تو خلافت سے سبکدوش ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اپنے مرنے کے وقت اس کی بنیاد دوسرے کے لیے استوار کر گیا۔ (خطبہ شقشقیہ۔ نہج البلاغہ)

جب ابوبکر کی خلافت کا دور اختتام کو پہنچا تو انکی وصیت کے مطابق عمر بن خطاب خلیفہ بنے اور انہوں نے مسلمانوں کے امور کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔

عمر نے دس سال پانچ مہینے اور بیس دن خلافت کی اور ۲۳ھ

میں بابا شجاع الدین "فیروز" کاشانی کے ہاتھوں چھ زخم کھا کر داعی اجل کو لبیک کہا۔

ان کی خصوصیات اپنے ساتھی ابوبکر جیسی ہی تھیں، بلکہ انکی نسبت عمر میں کچھ زیادہ ہی خامیاں پائی جاتی تھیں۔

عمر بن خطاب ۲۹ سال کی عمر میں مکہ میں مسلمان ہوئے۔ ابوبکر کی طرح انہیں بھی یہ فخر حاصل تھا کہ وہ رسول اکرمؐ کی نو بیویوں میں سے ایک یعنی "حفصہ" کے والد تھے۔

وہ عام ذہن کے ایک کم معلومات رکھنے والے آدمی تھے۔ اس بات کو شیعہ اور سنی علماء نے اپنی کتابوں میں ضروری حوالہ جات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اب ان کی اس کم علمی کے چند نمونے سنی علماء کی زبانی سنیئے:

۱- ایک نوجوان ایک عورت کے ساتھ مسجد میں آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ عورت میری ماں ہے۔ تاہم عورت نے اس بات سے انکار کیا اور کہا: میں نے تو شادی ہی نہیں کی لہٰذا یہ نوجوان جھوٹ بکتا ہے اور وہ میرا بیٹا نہیں ہے۔

خلیفہ عمر نے اس جوان سے گواہ پیش کرنے کو کہا؛ تو وہ بولا: میرا کوئی گواہ نہیں ہے جبکہ عورت نے اپنے دعوے کے حق میں چند گواہ پیش کیے۔ جنہوں نے شہادت دی کہ اس عورت نے شادی نہیں کی اور یہ جوان جھوٹا ہے۔

اس پر خلیفہ نے حکم دیا: اس جوان کو جھوٹا دعوے کرنے کی سزا میں کوڑے لگائے جائیں۔ سپاہی اس حکم کی تعمیل کرنے کے لیے جوان کو مسجد سے باہر لے گئے۔ جہاں ان کی ملاقات امام علیؑ سے ہوگئی۔ آپ انہیں

مسجد میں واپس لے آئے اور اس عورت سے کہا: اس جوان کے بارے میں تم کیا کہتی ہو؟

اس نے جواب دیا: یہ جھوٹ بکتا ہے اور یہ ہرگز میرا بیٹا نہیں ہے۔

تب آپ نے اس جوان کو مخاطب کر کے کہا: اب جبکہ وہ تمہیں اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے۔ پس تم بھی کہدو کہ وہ میری ماں نہیں ہے۔

جوان نے کہا: اے پیغمبرؐ کے چچازاد! وہ میری ماں ہے، پھر میں کیسے انکار کر دوں؟

امام علیؑ نے فرمایا: تم انکار کر دو اور گھبراؤ نہیں، کیونکہ میں تمہارا باپ اور حسنؑ و حسینؑ تمہارے بھائی ہیں۔

جوان نے کہا: میں بھی انکار کرتا ہوں اور وہ میری ماں نہیں ہے۔

اب امام علیؑ نے اس عورت کے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا: کیا تم اس عورت کے بارے میں میرے حکم کی تائید کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: جی ہاں! ہم سب کے لیے آپ کا حکم قابل قبول ہے۔

پھر آپ حاضرین کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: میں تم سب کو گواہ ٹھیراتا ہوں کہ میں نے اس عورت کا نکاح اس مرد سے کر دیا ہے، جن کا آپس میں پہلے سے کوئی رشتہ نہیں ہے اور آج سے وہ ایک دوسرے کے میاں بیوی ہوں گے۔ پھر آپ نے نقدی کی ایک تھیلی منگوائی چار سو اسّی درہم گن کر عورت کو مہر کے طور پر دیئے اور جوان سے کہا: اب تم اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑو اور جاؤ۔ ہاں جب تک اس سے ہمبستری نہ کر لو ہمارے پاس دوبارہ مت آنا۔

اس پر سارا مجمع حیرت زدہ رہ گیا اور کسی نے ایک لفظ بھی منہ سے

نہ نکلا۔ وہ جوان اپنی نئی نویلی دلہن کو ساتھ لے جانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھا اور دوسرے لوگ بھی اِدھر اُدھر ہونے لگے۔ اتنے میں اس عورت نے بآواز بلند کہا: اے ابوالحسنؑ! میں خدا کی پناہ مانگتی ہوں۔ خدا کی قسم! وہ میرا بیٹا ہے اور یہ شادی مجھے خدا کے غضب کی آگ میں جلا ڈالے گی۔

امام علیؑ نے پوچھا: وہ کیسے؟

عورت نے جواب دیا: اس جوان کا باپ ایک سیاہ فام حبشی ہے، جس سے میری بہنوں نے میرا عقد کر دیا تھا۔ چنانچہ مجھے حمل ہو گیا اور میرے ہاں یہ جوان پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہ آدمی ایک جنگ میں مارا گیا اور میں نے اس لڑکے کو ایک صحرانشین قبیلے کے سپرد کر دیا اور یہ وہیں بڑا ہوا۔ اب میرے لیے یہ بات ناگوار تھی کہ میں اسے اپنے سے نسبت دوں، لہٰذا میں نے اس کو اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

تب امام علیؑ نے حکم دیا: اس جوان کے نسب کی بنا پر اسے اس کی ماں کے ساتھ ملحق کر دیا جائے اور اس کی کیفیت کتاب میں لکھ دی جائے۔

۲۔ ایک پاگل عورت جو زنا کی مرتکب ہوئی وہ خلیفہ عمر کے سامنے لائی گئی۔ انہوں نے حکم دیا کہ اس عورت کو سنگسار کر دیا جائے۔ چنانچہ خلیفہ کے سپاہی ان کے حکم کی تعمیل کے لیے اس عورت کو سنگساری کے مقام پر لے گئے۔

اسی اثنا میں امام علیؑ وہاں پہنچ گئے اور آپ نے اس عورت کو سپاہیوں سے چھڑا کر آزاد کر دیا۔ جب خلیفہ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے کہا: علیؑ بلاوجہ کوئی کام نہیں کرتے، پھر آپ سے اس فعل کی وجہ پوچھی۔ امام علیؑ نے فرمایا: یہ عورت پاگل ہے اور رسول اکرمؐ

نے فرمایا ہے کہ دیوانے افراد جب تک شفایاب نہ ہو جائیں ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

خلیفہ عمر جو بلاوجہ اور احکام خدا سے اپنی لاعلمی کی بنا پر ایک عورت کو قتل کرانے لگے تھے، انہوں نے بے اختیار کہا: اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر یقیناً ہلاک ہو جاتا، یعنی خدا کے غضب میں گرفتار ہو جاتا۔

۳۔ ایک حاملہ عورت کہ جس نے زنا کا اقرار کر لیا تھا۔ اسے خلیفہ عمر کے سامنے لایا گیا۔ انہوں نے حکم دیا: اسے سنگسار کر دیا جائے۔

جب امام علیؑ کو اس کی خبر ملی تو آپ اس عورت کو مسجد میں واپس لے آئے اور عمر سے فرمایا: اگر تم اس عورت کو قتل کرنے کے مجاز بھی ہو تو بھی وہ بچہ جو اس کے پیٹ میں ہے، تم اسے قتل کرنے کے مجاز نہیں ہو پھر فرمایا: کہیں ایسا تو نہیں کہ اس عورت سے زنا کا اقرار کرانے میں بھی تم نے اسے ڈرایا دھمکایا ہو؟

خلیفہ نے کہا: ہاں ایسا ہی ہوا ہے۔

اس پر امام علیؑ نے فرمایا: کیا تم نے نہیں سنا کہ رسول اکرمؐ نے بالصراحت فرمایا تھا کہ اگر کسی نے دباؤ میں آکر اقرار کیا ہے تو اس پر حد جاری نہیں ہو سکتی کیونکہ جس اقرار کی بنیاد تنگی، قید یا دھمکی پر ہو وہ سرے سے اقرار ہی نہیں ہے۔

تب خلیفہ عمر نے حکم دیا کہ اس عورت کو آزاد کر دیا جائے اور کہا: دنیا بھر کی عورتیں عالم بشریت کو علی بن ابیطالبؑ جیسا فرزند دینے سے عاجز ہیں۔ اگر علیؑ نہ ہوتے تو میں ہلاک اور گمراہی کا شکار ہو جاتا۔

۴۔ دو آدمی قبیلۂ قریش کی ایک عورت کے پاس گئے۔ اس کو امانت

کے طور پر سو دینار دیے اور کہا: جب کبھی ہم دونوں تمہارے پاس آئیں تو یہ رقم ہمیں لوٹا دینا اور اگر ہم میں سے فقط ایک ہی آئے تو اسے ہرگز نہ دینا۔

جب اس واقعے کو ایک سال گزر گیا تو ان دو آدمیوں میں سے ایک اس عورت کے پاس آیا اور کہا: میرا ساتھی فوت ہوگیا ہے۔ لہذا تم وہ سو دینار مجھے دیدو۔ عورت نے رقم دینے سے انکار کیا، لیکن اس آدمی نے دباؤ ڈال کر وہ رقم اس سے لے لی اور چلتا بنا۔

پھر ٹھیک ایک سال بعد دوسرا آدمی آگیا اور اس عورت سے اسی رقم کا مطالبہ کیا۔ عورت نے کہا: ایک سال پہلے تمہارا ساتھی آیا اور اس نے تمہاری وفات کی خبر دی۔ لہٰذا میں نے وہ رقم اسے دیدی۔ اس پر یہ جھگڑا بڑھ گیا اور معاملہ خلیفہ عمرؓ تک جا پہنچا۔ انہوں نے کہا: "میرے خیال میں یہ عورت اس رقم کی ذمہ دار ہے۔" اور فیصلہ عورت کے خلاف دینا چاہا۔

عورت نے کہا: اے خلیفہ! میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ تم ہمارے بارے میں کوئی حکم جاری نہ کرو، بلکہ ہمارا معاملہ علی بن ابیطالبؑ کے سپرد کردو۔ چنانچہ خلیفہ کے حکم سے فریقین کو امام علیؑ کی خدمت میں لے جایا گیا۔ جب ان کو حالات سے آگاہ کیا گیا تو آپ سمجھ گئے کہ ان دو آدمیوں نے فریب سے کام لیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق یہ کھیل کھیلا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس آدمی کو مخاطب کر کے کہا: کیا تم نے اس عورت سے یہ نہیں کہا تھا کہ: تم یہ رقم اس وقت ادا کرنا، جب ہم دونوں تمہارے پاس آئیں۔

اس نے جواب دیا: جی ہاں! ہم نے یہی کہا تھا۔

آپ نے فرمایا: اچھا تو اس وقت وہ رقم میرے پاس موجود ہے۔ تم جا کر اپنے ساتھی کو بلا لاؤ۔ تاکہ میں وہ رقم تمہیں دے دوں)۔

بعد میں جب خلیفہ عمر کو امام علیؑ کے اس فیصلے کا پتا چلا تو انھوں نے کہا: خدا مجھے علی بن ابیطالبؑ کے بعد زندہ نہ رکھے۔

یہ ہیں خلیفہ عمر کے دینی مسائل اور احکام الٰہی سے واقف نہ ہونے کے چند نمونے اور ہم انہیں پر اکتفا کرتے ہیں۔ تاکہ اپنے اصلی موضوع سے ہٹ نہ جائیں۔ تاہم ہمارے پاس ایسے بے شمار دلائل موجود ہیں، جو دینی امور میں خلیفہ عمر کی کم نگاہی کو ظاہر کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں خلیفہ عمر کو دوسرے فضائل اور مکارم سے بھی کوئی خاص حصہ نہ ملا تھا۔ جیسا کہ اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں کسی بھی مرحلے پر انہوں نے کوئی درخشاں نمونہ پیش نہیں کیا۔

مزید یہ کہ انہوں نے اسلامی جنگوں میں کسی شجاعت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جیسا کہ شیعہ اور سنی مورخین نے صراحت کی ہے کہ وہ خوفِ جان سے کئی غزوات میں سے بھاگ نکلے۔

نیز انہوں نے اپنی زندگی میں بے حساب غلطیاں کیں اور ہر غلطی کے بعد معذرت بھی کرتے رہے اور بعینہٖ ایسے ہی تھے، جیسا کہ امام علیؑ نے ان کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"جہاں بات بات پر ٹھوکر کھانا اور پھر عذر کرنا تھا"

(خطبہ شقشقیہ ۔ نہج البلاغہ)

گویا کہ ان کی زندگی خطا اور معذرت سے بھری ہوئی تھی۔ وہ ایک کے بعد دوسری غلطی کرتے اور پے در پے معذرت چاہتے تھے۔ نہ تو وہ اتنے

واقف کار تھے کہ غلطی نہ کریں اور نہ اتنے محکم تھے کہ غدر نہ چاہیں۔ چنانچہ یہ بات ان واقعات سے بخوبی واضح ہے جو ہم نے پیشتر نقل کیے ہیں۔ عمر علانیہ کہتے تھے: ابوبکر کی بیعت ایک فلتۃ (ناگہانی واقعہ) تھا۔ گویا کہ وہ ایک ایسا بے بنیاد کام تھا جو کسی تدبر کے بغیر واقع ہوا۔ بلکہ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر آئندہ کوئی شخص لوگوں سے اس طرح بیعت لے تو اس کی گردن ماردو۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے ابوبکر کو خلیفہ تسلیم کیا تھا اور وہ لوگوں کو زبردستی سے حتیٰ کہ بزور شمشیر ابوبکر کے پاس لے جاتے تھے۔ تاکہ ان سے جبراً ان کی بیعت کرائیں اور اس بے بنیاد اور تدبر سے عاری کام کو تقویت پہنچائیں۔

اگرچہ عمر بن خطاب کا عقیدہ یہ تھا کہ خلیفہ کا انتخاب لوگوں کے صلاح مشورے اور امت کے اجماع سے ہونا چاہیے لیکن خود انہوں نے مسلمانوں کی آراء سے رجوع کیے بغیر فقط ابوبکر کی وصیت پر مسند خلافت سنبھالی اور اپنا نام امیر المومنین رکھ لیا۔

انہوں نے اسلام اور رسول اکرمؐ کے سخت ترین دشمنوں ـــــ بنی امیہ کو گورنری کی کرسی پر بٹھایا اور یوں آئندہ برپا ہونیوالے فتنہ و فساد کے لیے راستہ ہموار کیا۔ جیسا کہ انہوں نے شام کی حکومت۔ یزید بن ابوسفیان کو سونپی' پھر اس کی بجائے اس کے بھائی معاویہ بن ابوسفیان کو شام کا گورنر مقرر کیا اور یوں ظلم و فساد کی حکومت کو قدم جمانے کا موقع دیا۔

خلیفہ عمر نے اپنی وفات کے وقت خلافت کا مسئلہ چھ آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ تاکہ وہ آپس میں تبادلۂ خیال کرکے اپنے میں سے ایک شخص

کی بطور خلیفہ بیعت کریں۔ ان چھ آدمیوں کے نام یہ تھے:

علیؑ ـــــ طلحہ ـــــ زبیر ـــــ عثمان

عبدالرحمٰن بن عوف ـــــ سعد بن ابی وقاص

خلیفہ عمر نے اپنے جانشین کے انتخاب کے لیے یہ طریقہ کار وضع کیا۔ حالانکہ انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا تھا:

میں اس شخص (علیؑ) کا مرتبہ خوب جانتا ہوں۔ خدا کی قسم اگر وہ حاکم بن جائے تو امت کی رہنمائی سیدھے راستے کی جانب کرے گا۔

عبداللہ نے کہا: باباجان! جب آپ علیؑ کو اس قدر موزوں سمجھتے ہیں تو پھر آپ انھیں خلافت کے لیے نامزد کیوں نہیں کر دیتے؟

عمر نے جواب دیا: خواہ میں زندہ ہوں یا مردہ، مجھے یہ بات ناگوار ہے کہ میں علیؑ کو مسند خلافت پر دیکھوں۔

امر خلافت کے لیے اس شوریٰ کی تشکیل میں عمر بن خطاب کے کچھ مقاصد پنہاں تھے۔ جیسا کہ انہوں نے خود اقرار کیا کہ میں نے علیؑ کے مقابلے میں ایسے اشخاص کو رکھا ہے جو چنداں صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

انہوں نے طلحہ سے کہا: رسول اکرمؐ اپنی وفات کے وقت تم سے خفا تھے، لہٰذا تم خلافت کے لائق نہیں ہو۔

زبیر سے کہا: تم ایک خسیس اور لئیم شخص ہو، اس لیے خلافت کے اہل نہیں ہو۔

عثمان سے کہا: تم خلافت سے ناجائز فائدہ اٹھاؤ گے اور بنی امیہ کو لوگوں کے مال اور جان پر مسلط کر کے انہیں بے حد پریشان کرو گے۔

عبدالرحمٰن بن عوف سے کہا: تم ایک کمزور آدمی ہو اور حکومت

اور خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

سعد بن ابی وقاص سے کہا: تم جنگ تو لڑ سکتے ہو لیکن خلافت کے اہل نہیں ہو۔ نیز تمہاری رگوں میں "بنی زہرہ" کا خون دوڑتا ہے یعنی تم قریش میں سے نہیں ہو۔

مقام افسوس ہے کہ یہ بات تسلیم کرنے کے باوجود کہ یہ اشخاص اس قابل نہیں ہیں، خلیفہ عمر نے پھر بھی انہی کو خلافت کے لیے نامزد کر دیا اور حکم دیا کہ ابو طلحہ انصاری ان چھ افراد کو تین دن کی مہلت دیں۔ پھر اپنے پچاس سپاہیوں سمیت ان کی نگرانی کریں۔ جب مہلت کی مدت ختم ہو جائے اور یہ افراد اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنانے پر متفق نہ ہوں تو وہ ان سب کو قتل کر دیں۔[1]

وہ پانچ افراد جنہیں خلیفہ عمر نے امام علیؑ کے مقابلے پر لا کھڑا کیا۔ وہ ایسے اشخاص تھے جن کے ہوتے ہوئے علیؑ کا خلافت کے لیے منتخب ہونا غیر ممکن تھا۔ کیونکہ سعد بن ابی وقاص۔ عبدالرحمٰن بن عوف اور عثمان کا وجود علیؑ کے خلاف فیصلہ ہونے کے لیے کافی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ تینوں امام علیؑ کے سخت ترین مخالف تھے۔

ایک اور مقصد جو عمر بن خطاب نے اس شوریٰ سے حاصل کیا، وہ زبیر کو علیؑ سے کاٹ دینا تھا۔ کیونکہ زبیر ان کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور ان کے ساتھیوں اور معتقدوں میں سے تھے۔ جیسا کہ سقیفہ کے دن انہوں نے امام علیؑ کی حمایت میں تلوار کھینچ لی اور وہ بی بی فاطمہ زہراؑ

---

[1] ابن ابی الحدید۔ شرح نہج البلاغہ بحوالہ خلافت و ولایت۔

کے جنازے میں بھی شریک تھے۔

جب خلیفہ عمر نے چھ رکنی شورائے خلافت تشکیل دی، جن میں سے ایک زبیر بھی تھے۔ تب انہوں نے اپنے آپ کو خلافت کے بارے میں امام علیؑ کا ہم پلہ سمجھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے اس دن سے منصب خلافت کے لالچ میں امام علیؑ کے ساتھ اپنا رویہ بالکل تبدیل کر دیا۔

جنگ جمل کے موقع پر جب زبیر نے امام علیؑ سے کی ہوئی بیعت توڑ دی تھی۔ وہ بھی خلیفہ عمر کی اسی تدبیر کا نتیجہ تھا۔ جس سے انہوں نے علیؑ کو ان کے حق سے محروم رکھنے کے لیے اس شوریٰ کی تشکیل میں کام لیا تھا۔ بہرحال خلیفہ عمر کو اس بات کا یقین تھا کہ شوریٰ کی کارروائی کا نتیجہ عثمان کی خلافت اور علیؑ کی محرومی کی شکل میں نکلے گا۔ نیز عثمان کی خلافت سے بنی ہاشم پر بنی امیہ کے تسلط اور معاویہ کی علیؑ کے خلاف جنگ کا راستا ہموار ہو جائے گا۔

اگرچہ خلافت کے لیے شوریٰ کی تشکیل خلیفہ عمر کی آخری لغزش تھی لیکن ان کی یہ لغزش اتنی خطرناک تھی کہ اس کا مقابلہ ان کی کسی دوسری لغزش سے نہیں کیا جا سکتا۔

عثمان بن عفان، بنی امیہ میں سے تھے اور ان کا پیشہ بزازی تھا۔ وہ مکہ میں مسلمان ہوئے اور دوسرے مہاجرین کے ساتھ مدینہ ہجرت کی۔ علماء اور مورخین کی تصریح کے مطابق، عثمان کی دینی معلومات ان کے دو ساتھیوں ابوبکر اور عمر سے بھی کم تھیں۔ ان کی لغزشیں اتنی کثیر ہیں

کہ اس مختصر کتاب میں ان سب کا بیان کرنا ممکن نہیں۔ البتہ اتنا جاننا کافی ہے کہ انہی کی لغزشوں کے باعث مسلمان انقلاب برپا کرنے پر مجبور ہوئے اور خود عثمان قتل ہو گئے۔

وہ عمر بن خطاب کی تشکیل کردہ شوریٰ کے نتیجے میں خلیفہ بنے۔ جب لوگوں نے ان سے بیعت کی تو وہ اتنے خوش تھے کہ منبر سے خطبہ دینے کی بجائے سیدھے اپنے گھر چلے گئے۔ تب بنی امیہ کے تمام اشخاص جو اس وقت مدینہ میں سکونت پذیر تھے، ان کو مبارکباد دینے آئے۔ اس وقت عثمان نے حکم دیا کہ ان کے گھر کا دروازہ غیر لوگوں کے لیے بند کر دیا جائے۔ ابو سفیان بن حرب ایسا شخص جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف لڑی جانے والی بہت سی جنگوں میں کفر کی فوج کا سالار تھا۔ وہ ابوسفیان کہ جس کی گردن پر سیکڑوں مسلمانوں کا خون تھا۔ اس نے عثمان کے گھر میں موجود بنی امیہ سے خطاب کرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا:

> اے امیہ کے فرزندو! تم بھی خلافت کے ساتھ اسی طرح کھیلو جس طرح بچے گیند کے ساتھ کھیلتے ہیں اور اسے دست بدست گردش میں رکھو۔ اس کی قسم کہ جس کی ابوسفیان ہمیشہ قسم کھاتا ہے۔ نہ کوئی عذاب ہے نہ حساب، نہ بہشت ہے نہ دوزخ اور نہ ہی کوئی قیامت ہے۔ یہ سب کی سب بس جھوٹی اور بے بنیاد باتیں ہیں۔

اگرچہ ابوسفیان کی یہ باتیں صریحاً کفر تھیں اور عثمان جو خود کو رسول اکرمؐ کا خلیفہ سمجھتے تھے۔ ان پر واجب تھا کہ وہ ابوسفیان کو جلاد کے سپرد کر دیتے تاکہ وہ ارتداد کی بنا پر اس کی گردن اڑا دیتا۔

لیکن وہ تو بنی امیہ کا بزرگ اور عثمان کے لیے واجب احترام تھا! اس لیے انہوں نے اس کے کلمات کفریہ سے چشم پوشی کی اور اس کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا۔

عبیداللہ بن عمر نے ایران کے شہزادے اور خوزستان کے والی ہرمزان، ابو لوٴلوٴ فیروز کی ایک چھوٹی بچی اور سعد بن ابی وقاص کے غلام جفینہ کو قتل کر دیا تھا۔ اگرچہ اس کو اسلامی قانون کے مطابق ان کے قصاص میں قتل کر دینا چاہیے تھا لیکن خلیفہ عثمان نے اسے معاف کر دیا اور یوں ایک ایسے قاتل سے قصاص نہ لیا جس نے دو مسلمان مردوں اور ایک بچی کو بلاوجہ موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ چنانچہ سنی علماء بھی اعتراف کرتے ہیں کہ یہ عثمان کے دور خلافت کا پہلا ظالمانہ اور نامشروع فیصلہ شمار ہوتا ہے۔

ابھی عثمان کی خلافت کا پہلا سال ختم نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے غلط اقدامات شروع کر دیے۔ جیسے ولید بن عقبہ جو ماں کی طرف سے ان کا بھائی تھا، اسے کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ وہ ایک فاسق و فاجر آدمی تھا اور کوفہ میں اسکی بیہودہ حرکات اپنی حد کو پہنچ گئیں۔ چنانچہ ایک صبح کو وہ نشے کی حالت میں چور تھا، لہٰذا اس نے صبح کی دو کے بجائے چار رکعتیں پڑھائیں۔ تب حاضرین میں سے دو آدمی آگے بڑھے اور اسے بدمست پا کر اس کی انگلی سے انگوٹھی اتار لی۔ پھر وہ یہ انگوٹھی اس کے جرم کے ثبوت کے طور پر مدینہ لے گئے اور خلیفہ عثمان سے اس کی شکایت کی۔ لیکن انہوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی شکایت پر کوئی توجہ نہ دی اور ولید پر کوئی حد جاری نہ کی الٹا ان شکایت کرنے والوں کو اس لیے کوڑے لگوائے کہ انہوں نے اپنے امیر پہ تہمت لگائی ہے۔

وہ فدک جس سے ابو بکر اور عمر نے رسول اکرمؐ کی بیٹی فاطمہ زہراؑ

کو جبراً مدینہ سے بیدخل کر دیا تھا۔ خلیفہ عثمان نے وہ مروان بن حکم کو بخش دیا، جو عمر بن عبد العزیز کی خلافت تک یکے بعد دیگرے مروان کی اولاد کے قبضے میں رہا۔ انہوں نے نہ صرف بیت المال کا خمس مروان بن حکم کو بطور تحفہ دیدیا بلکہ اس رسول اکرمؐ کے راندے ہوئے شخص کو اپنا وزیر بھی بنایا۔

خلیفہ عثمان نے شام کی حکومت ایک خود مختار وحدت کی شکل میں معاویہ بن ابوسفیان کے سپرد کر دی اور اسے اجازت دی کہ وہ اس وسیع سرزمین میں جو جی چاہے کرتا رہے۔

خلیفہ عثمان نے کوفہ کی حکومت اپنے بھائی ولید بن عقبہ کے بعد سعید بن عاص کے سپرد کر دی۔ ادھر مصر کی حکومت اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن ابی سرح کو دیدی۔ حالانکہ وہ شخص رسول اکرمؐ کے زمانے میں مرتد ہو گیا تھا۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے اس کے لیے "دیکھتے ہی گردن اڑا دینے کا حکم دیا تھا۔

اسی طرح انہوں نے اپنے چچازاد بھائی عبداللہ بن عامر اموی کو عراق اور ایران کی وسیع مملکت کا گورنر بنایا تاکہ وہ اپنی من مانی کیا کرے۔ نیز ایک اور اموی، یعلیٰ بن امیہ کو یمن کا امیر بنا کر وہاں کے لوگوں کی گردنوں پر لاد دیا۔

خلیفہ عثمان نے قبیلہ قضاعہ سے موصولہ صدقات تین لاکھ درہم رسول اللہؐ کے راندے ہوئے شخص حکم بن العاص کو دیدیے۔ علاوہ ازیں افریقہ کے مال غنیمت کے خمس کی رقم جو پانچ لاکھ دینار سے زیادہ تھی وہ اپنے چچازاد بھائی اور داماد مروان بن حکم کو بخش دی۔ پھر جب ابوموسیٰ اشعری نے عراق کے محصولات کی بے شمار دولت لاکر خلیفہ عثمان کو دی تو وہ

ساری کی ساری انہوں نے بنی امیہ میں تقسیم دی۔

خلیفہ نے تین لاکھ درہم مروان کے بھائی حارث بن حکم کو اور ایک لاکھ درہم سعید بن عاص اموی کو بخش دیے۔ اس پر امام علیؑ اور چند جلیل القدر صحابہ نے ان سے گفتگو کی اور لوگوں کا اعتراض ان کے کانوں تک پہنچایا۔ تب عثمان نے کہا: وہ میرے قریبی رشتہ دار ہیں۔ شاید ان کا مطلب یہ تھا کہ خلیفہ کے رشتہ دار بیت المال سے جو چاہیں لے سکتے ہیں۔

اور بھی سنیے کہ خلیفہ عثمان نے عبداللہ بن خالد اموی کو تین لاکھ درہم اور اس کے قریبی مردوں میں سے ہر شخص کو ایک لاکھ درہم عطا کیے۔ نیز ابوسفیان بن حرب کو بھی دو لاکھ دینار بخش دیے۔

یہ خلیفہ عثمان کی ان بے جا بخششوں کے چند نمونے ہیں جو مسلمانوں کے بیت المال میں سے کی گئیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عثمان کی خلافت میں بہت سے سرکردہ اور بااختیار اشخاص بے حساب دولت جمع کرنے کے قابل ہو گئے۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

زبیر بن عوام

عثمان کی بخششوں کی بدولت ان کے پاس بے پناہ دولت اکٹھی ہو گئی۔ چنانچہ وہ بصرہ میں دو۔ کوفہ میں ایک۔ مصر میں ایک اور مدینہ میں گیارہ مکانوں کے مالک تھے۔ نیز ان کے مرنے کے بعد تیسرا حصہ منہا کر کے ان کی چار بیویوں میں سے ہر ایک کو بارہ لاکھ درہم ورثے کے طور پہ ملے۔ جبکہ ان کی کل دولت پانچ کروڑ اٹھانوے لاکھ درہم بتائی گئی ہے۔

طلحہ بن عبیداللہ

وہ بھی عثمان کی بخششوں اور عنایات سے محروم نہیں رہے۔ جیسا کہ مورخین نے ان

کی چھوڑی ہوئی دولت کی مقدار تین کروڑ درہم بتائی ہے۔

عبدالرحمٰن بن عوف انہوں نے بھی عثمان سے مال و دولت کا پورا پورا حصہ وصول کیا۔ وہ اپنی موت کے وقت ایک ہزار اونٹوں۔ تین ہزار بھیڑوں سو گھوڑوں اور ایک بہت بڑے مزروعہ قطعہ زمین کے مالک تھے۔

سعد بن ابی وقاص ان کو بھی خلیفہ عثمان کی عنایات سے خاصا حصہ ملا۔ جس سے انہوں نے اپنے لیے ایک شاندار محل تعمیر کرایا تھا۔ جب ان کی موت واقع ہوئی تو انہوں نے ڈھائی لاکھ درہم بطور میراث چھوڑے۔

یعلیٰ ابن امیہ اس پر بھی خلیفہ عثمان کی نظر عنایت رہی چنانچہ اپنی موت کے وقت پانچ لاکھ دینار نقد اور ایک لاکھ دینار کی جائداد وغیرہ کا مالک تھا۔

زید بن ثابت وہ خلیفہ عثمان کے جاں نثاروں اور مددگاروں میں سے تھے۔ جیسا کہ مسعودی نے نقل کیا ہے، انہوں نے اپنے پیچھے اتنا سونا اور چاندی چھوڑی کہ اسے ہتھوڑے سے توڑا گیا۔ اس کے علاوہ دوسرے مال اور جائداد کی قیمت ایک لاکھ دینار سے زیادہ تھی۔

یہ چند نمونے تو ان بخششوں اور عنایات کے ہیں جو خلیفہ عثمان نے دوسروں پر کیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود خلیفہ نے اپنی زندگی کس طرح بسر کی اور مسلمانوں کے مال سے کتنا فائدہ اٹھایا۔ اس سوال کے جواب کے لیے ضروری ہے کہ ہم تاریخی مصادر سے رجوع

کریں۔ خلیفہ عثمان رسول اکرمؐ کی روش کے برعکس، حتی کہ اپنے ساتھیوں ابوبکر اور عمر کے طور طریقوں کے برخلاف شاہانہ لباس پہنتے تھے۔ وہ اپنے خاص لباس کے اوپر سمور کا ایک جبہ بھی پہنتے تھے، جس کی قیمت ایک سو طلائی دینار تھی۔

انہوں نے بہت سی جنگوں میں مال غنیمت کے طور پر حاصل ہونیوالے زیورات اور جواہرات کا ایک بڑا حصہ بیت المال سے نکال کر اپنے اہل وعیال کو بخش دیا۔ نیز بیت المال ہی کی کثیر دولت خرچ کر کے اپنے لیے ایک شاندار محل تعمیر کروا لیا تھا۔

جس دن خلیفہ عثمان کے قتل کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس وقت ان کے خزانچی کے پاس تین کروڑ پانچ لاکھ درہم اور ایک سو پچاس دینار نقد موجود تھے۔ ربذہ میں ان کے ایک ہزار اونٹوں اور دوسرے مقامات کی جائداد کی قیمت دو لاکھ دینار تھی۔ اس کے علاوہ ان کے ایک ہزار غلام بھی تھے۔

جن باتوں کا ہم نے اب تک ذکر کیا ہے، ان کو شیعہ اور سنی مؤرخین کی تائید حاصل ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اس گفتگو کو امام علیؑ کے اس جملے پر ختم کریں، جو عثمان کے بارے میں ہے۔ گویا کہ اس موضوع پر جو کچھ کہا گیا ہے، یہ جملہ اس کا خلاصہ ہے:

یہاں تک کہ اس قوم کا تیسرا شخص پیٹ پھلائے سرگین اور چارے کے درمیان کھڑا ہوا اور اس کے بھائی بند اٹھ کھڑے ہوئے جو خدا کے مال کو اس طرح نگلتے تھے جس طرح اونٹ فصل ربیع کا چارہ چرتا ہے۔

(خطبہ شقشقیہ۔ نہج البلاغہ)

یہ لغزشیں۔ یہ بیجا بخششیں اور مملکت اسلامی کی بنی امیہ کے مابین تقسیم، عام لوگوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھنا اور خدا کے احکام سے لاپرواہی کو دیکھتے دیکھتے عام مسلمان اور اسلام کے خیر خواہ لوگ اعتراض کرنے لگے۔

امام علیؑ بھی ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے متعدد مرتبہ عثمان کو نصیحت کی اور انجام کار سے خبردار کیا، لیکن عثمان کی طرف سے بے اعتنائی کے علاوہ کوئی چیز دیکھنے میں نہ آئی۔

جب رسول اکرمؐ کے جلیل القدر صحابی ابوذر نے عثمان کو نصیحت کی تو انہیں پہلے شام اور پھر ربذہ میں جلاوطن کر دیا گیا۔ چنانچہ اسی جلاوطنی کے دوران میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

عمار یاسر عثمان کے گھر گئے اور ان کی غلطیوں کے بارے میں گفتگو کی۔ تب عثمان اور ان کے غلاموں نے انہیں مارا پیٹا اور ٹھڈے مارے جس کے نتیجے میں وہ کافی دیر تک بے ہوش رہے اور فتق کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔

آخر کار عثمان بن عفان کی ناانصافیاں رنگ لائیں اور مصر و عراق کے لوگ گروہ در گروہ مدینے آ پہنچے۔ چند دن تک ان کے اور خلیفہ کے درمیان بات چیت ہوتی رہی۔ پھر جب وہ عثمان سے بالکل ناامید ہو گئے تو انہوں نے طاقت استعمال کی اور خلیفہ کو قتل کر ڈالا۔

اگرچہ خلافت کی بحث اس کتاب کے موضوع سے خارج تھی، پھر بھی ہم نے اسے مختصر طور پر بیان کر دیا ہے۔ تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ کون اس منصب پر فائز ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا اور کن لوگوں نے بلا جواز

اس پر قبضہ کر لیں۔ نیز یہ کہ خلافت کے نتیجے میں مسلمانوں اور اسلامی مملکت میں کیا کیا خرابیاں پیدا ہو گئیں۔

یہ درست ہے کہ قتل عثمان کے بعد لوگ امام علیؑ سے دُور نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے اصرار کیا کہ آپ خلافت قبول کریں لیکن کیا اب اس کا کوئی امکان رہ گیا تھا کہ علیؑ اسلامی حقائق پر عمل درآمد کرا سکیں؟ ہرگز نہیں! کیونکہ جن سرکش اور منحرف افراد نے پہلے خلفاء کے زمانے میں دولت حاصل کر لی تھی۔ انہوں نے یہاں وہاں سے سر ابھارا اور امام علیؑ کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

طلحہ اور زبیر نے عائشہ بنت ابوبکر کے ساتھ مل کر شورش برپا کی اور جنگ جمل ہوئی۔

شام میں معاویہ آپ کے مقابلے پر اٹھ کھڑا ہوا اور جنگ صفین کا آغاز کر دیا۔

مزید برآں نہروان کے خوارج نے امام علیؑ کی خلافت پر ایک اور ضرب لگائی اور پھر معاملہ بنی امیہ کی خواہش کے مطابق اختتام پذیر ہوا۔ چنانچہ خوارج میں سے چند افراد کی سازش کے نتیجے میں امام علیؑ شہادت پا گئے۔ تب معاویہ نے اپنی طرح طرح کی چالوں کے ذریعے اپنی خلافت نہیں سلطنت کے پائے زیادہ مضبوط کر لیے۔ پھر اس کے اور اس کے لگے بندھوں کے ہاتھوں کتنے ہی پاک خون بہہ گئے اور مسلمانوں کا کتنا ہی مال لوٹا گیا۔

علاوہ ازیں اس نے اپنے بیٹے یزید کے لیے سلطنت کی راہ ہموار کی اور پھر وہ کونسے جرائم تھے، جن کا یزید اپنے مختصر دورِ حکومت میں

فرزنگب نہیں ہوا اور وہ کونسا خون تھا جو اس نے نہیں بہایا؟

اس کے بعد کئی مروان، عبدالملک، ولید اور یزید مسند خلافت پر بیٹھے۔ وہ سب شرابی، زانی، مجرم اور گناہوں میں ڈوبے ہوئے افراد تھے۔ رسول اکرمؐ کا مقام نشست اور آنحضرتؐ کا منبران بدقماش لوگوں کے ہاتھ آگیا اور مسلمان تباہی اور بدبختی میں مبتلا ہو گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقدس منبر اور ان کی عادلانہ حکومت ـــــ یزید، مروان اور عبدالملک جیسے سرکش لوگوں کے ہاتھ کیونکر آگئی اور امت مسلمہ کیوں تباہی اور بدبختی کا شکار ہوئی؟

اس سوال کا بدیہی جواب یہ ہے کہ حضرت رسولؐ کے بعد برسر اقتدار آنے والے اشخاص نے احکام قرآن کے بجائے اپنے ذاتی مصالح کو مقدم گردانا اور پھر رفتہ رفتہ ان کا یہ انحراف ـــــ یزید، مروان اور عبدالملک کی قبیل کے فرمانرواؤں کی شکل میں کھل کر سامنے آگیا۔

اب وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی 'جیسا راجا ویسی پرجا' کے مصداق ان حکمرانوں کی رفتار و گفتار سے اسلامی معاشرے پر کچھ ایسے اثرات مرتب ہوئے جن کے تحت وہ روحِ اسلامی سے بیگانہ ہوتا چلا گیا اور یہ امت تباہی اور بدبختی کے گڑھے میں گر گئی ؎

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت حریت را زہر اندر کام ریخت

اس ضمن میں امام صادق علیہ السلام کا ایک فرمان پیش کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا: "جب تم قرآن کی وہ آیت پڑھو جس میں

گزرے ہوئے لوگوں کے کسی ایسے فعل کا تذکرہ ہو کہ جس کی بدولت انہیں کامرانی حاصل ہوئی تو تم بھی اس کو اختیار کرلو۔ اسی طرح جب تم کوئی ایسی آیت پڑھو، جس میں ماضی کے لوگوں کے کسی ایسے فعل کا ذکر ہو جس کی انہیں سزا ملی تو تم بھی اس سے بچتے رہو۔"

اس فرمان سے قرآنی حکایات کی غرض و غایت پوری طرح واضح ہو رہی ہے۔ یعنی یہ قرآنی داستانیں ہر زمانے کے مسلمانوں کے لیے نصیحت اور عبرت کا وسیلہ ہیں۔ ؎

تو اگر خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

بنا بریں قرن اول کے مسلمانوں اور خصوصاً صاحبان حکومت کو مابعد کے لوگوں سے کچھ بڑھ کر ان داستانوں سے نصیحت حاصل کرنا چاہیے تھی۔ لیکن بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے بعض افراد نے احکام الٰہی کے بجائے ذاتی وجاہت اور ہدایات نبویؐ کے مقابل گروہی سیاست کا راستہ اختیار کر لیا اور یوں ملتِ بیضا کو اس کی راہ سے بھٹکا دیا تھا۔

اس طرح جن اشخاص نے حضرت خاتم النبیینؐ کے قائم کیے ہوئے اتحاد فکر و عمل میں رخنہ ڈالا تھا، کیا وہ قوم نوحؑ، قوم عادؑ، قوم ثمودؑ، قوم لوطؑ، اصحابِ سبت اور اصحابِ فیل کے انجام کو نہیں جانتے تھے؟ وہ جانتے تھے اور ضرور جانتے تھے بلکہ وہ حضرت رسولؐ کے ساتھ رہنے اور ان سے براہِ راست اسلامی تعلیمات حاصل کرنے کے باعث ان پر ٹھیک عمل کرنے کے ذمہ دار تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، نہ جانے انہوں نے اسلام سے عداوت کی بنا پر ایسا نہیں کیا یا جاہلیت سے رغبت کی وجہ سے نہیں کیا۔

بہر حال قرن اول میں قائم کی گئی حکومت کہ جس کا نام خلافت رکھ لیا گیا تھا۔ وہ زمانے کی نیرنگیوں کے ساتھ یزید، مروان اور عبدالملک کی طرح کے ظالموں کے ہاتھ لگ گئی۔ پھر انہی جیسے دوسرے افراد کے قبضے میں آتی اور نکلتی ہوئی عثمانی ترکوں کے حصے میں آئی۔ تاہم نام ہی کی سہی جب تک یہ خلافت قائم رہی ـــ ان تمام داخلی کمزوریوں کے باوجود کہ جو امت اسلامیہ میں پیدا ہو چکی تھیں ـــ ظاہری طور پر مسلمانوں کا بھرم بنا رہا، یہاں تک کہ فرنگی استعمار نے اس خلافت کا تار و پود بھی بکھیر کر رکھ دیا۔

قرآن کے احکام سے صرف نظر کرنے، گزشتہ قوموں کے حالات سے سبق نہ سیکھنے اور اس غلط روش کے بدترین نتائج سے گزرنے کا یہ عمل چودھویں صدی ہجری میں آکر اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی امّہ کے زوال وادبار کی راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں زمانے کی ہوا سے دمکتی، چمکتی اور بھڑکتی نظر آنے لگیں۔ جبکہ سید جمال الدین افغانی نے تحریک "پین اسلامزم" اور علامہ اقبال نے فلسفۂ خودی کے ذریعے مسلمانوں میں اپنی شناخت کرنے اور صدیوں کا چھوٹا ہوا ـــ قرآنی راستہ ـــ اپنانے کا جذبہ بیدار کر دیا اور یہ بھٹکی ہوئی امت اپنی اصل کی طرف پلٹ پڑی۔

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز لے اڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے

گویا کہ چودھویں صدی ہجری احیائے اسلام اور اعلام قرآن کی صدی تھی اور اسلامیان عالم اپنی اس منزل مراد کی طرف رواں دواں اب

پندرھویں صدی کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔

اندریں صورت ہمارے نزدیک یہ کہنا بجا ہے کہ آج کے مسلمانوں نے گزشتہ چودہ سو سال میں اسلام اور قرآن سے کیے گئے انحراف کی کچھ اس طرح تلافی کی ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے میں احیائے دین کی جدوجہد کو بامِ عروج تک پہنچا دیا ہے۔ ان کی یہ مخلصانہ جدوجہد ان شاء اللہ غلبۂ اسلام کی اس عظیم تحریک سے ملحق ہو جائے گی" جو امام مہدی علیہ السلام کی قیادت میں شروع ہونے والی ہے۔ (ناشر)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ

ہماری مطبوعات

اسلام دینِ فطرت
اسلام دینِ معاشرت
اسلام دینِ معرفت
اسلام دینِ حکمت
فلسفۂ معجزہ
فلسفۂ شہادت
فلسفۂ ولایت
فلسفۂ حجاب
فلسفۂ احکام
تاریخِ عاشوراء
گفتارِ عاشوراء
بنائے کربلا
مرگِ گُل رنگ
مکتبِ اسلام
مکتبِ رسولؐ
مکتبِ تشیّع
آخری فتح
انتظارِ امامؑ
توضیح المسائل اردو
توضیح المسائل فارسی
شریعت کے احکام

کتابُ الدعاء والزیارات
اعمالِ حج
حکایاتُ القرآن
حیاتِ انسان کے چھ مرحلے
مقالاتِ مطہری
بُت شکن
مَردِ انقلاب
ہار جیت
بہلول عاقل
فُزْتُ بِرَبِّ الْکَعْبَۃِ
سخن
ابُوطالب۔ مظلومِ تاریخ
تفسیرِ سورۃ حمد
شرحِ قرآن
سیر و سُلوک
یَسّرْنَا القرآن
غدیر کی برکتیں
تعلیماتِ اسلامی
حدیثِ کساء
دُعائے کمیلؒ

نیز بچوں کے لیے دل چسپ مذہبی کہانیاں بھی دستیاب ہیں!